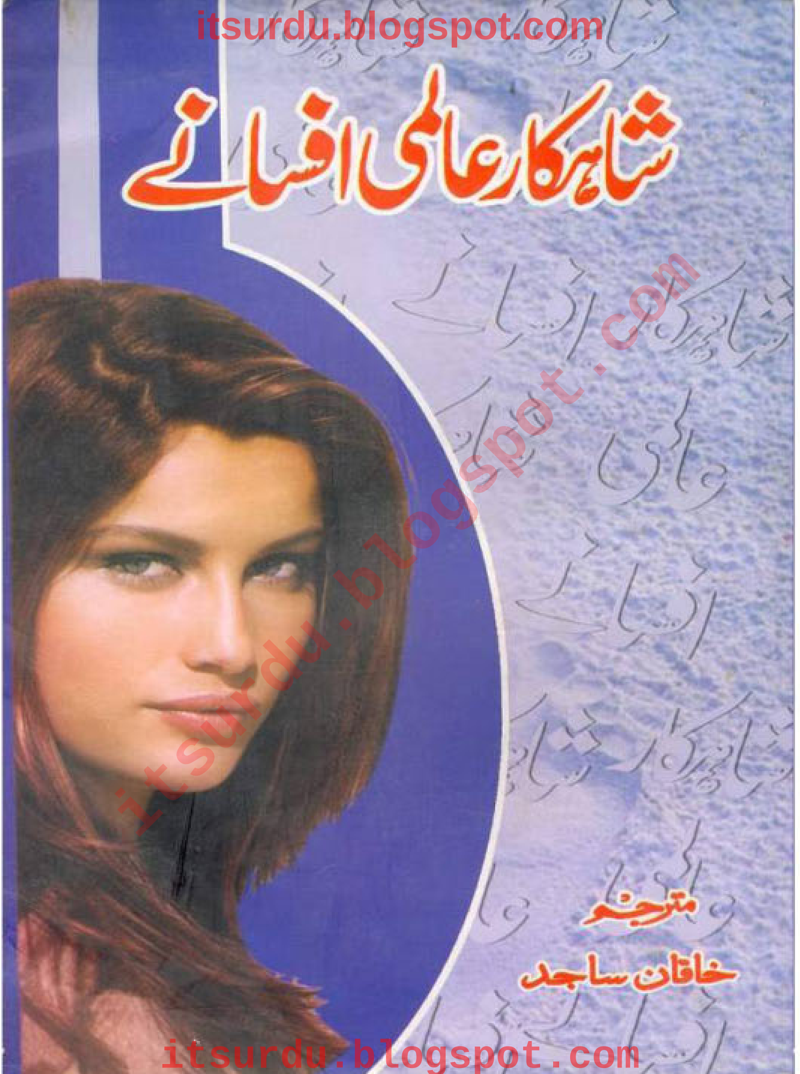


itsurdu.blogspot.com
شاہکار عالمی افسانے
مترجم
خاقان ساجد
itsurdu.blogspot.com

نوبل انعام یافتہ ادیبوں کے

شاہکار افسانے

مترجم

خاقان ساجد

نواب سنز پبلی کیشنز، راولپنڈی

ابدال بیلا کے نام

جو بہت اچھے ادیب، بہت پیارے انسان

اور بہت مخلص دوست ہیں۔

فہرست

☆ ☆ ☆

عرضِ ناشر

یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، دنیائے ادب کے ان ثقہ بند فن کاروں کی مختصر کہانیوں پر مشتمل ہے جنہیں ان کی ادبی عظمت کے اعتراف میں نوبل انعام کا حق دار سمجھا گیا۔ یہ اس سلسلے کی پہلی کتاب نہیں ہے۔ صاحب طرز افسانہ نگار اور ممتاز مترجم جناب خاقان ساجد اس سے پیشتر بھی "نوبل انعام یافتہ مصنفین کے بہترین افسانے" کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کر چکے ہیں جو نواب سنز پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہوئی اور اسے قارئین نے بے حد پسند کیا۔ ادبی حلقوں میں بھی ان کی کاوش کو بہت سراہا گیا۔ مذکورہ کتاب کی اشاعت کے بعد قارئین کی ایک بڑی تعداد نے فرمائش کی کہ نوبل انعام یافتہ مصنفین کی تخلیقات پر مبنی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے کو آگے بڑھایا جائے۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اُمید ہے آپ اسے بھی سندِ پسندیدگی عطا کریں گے۔

دعاؤں کا طالب

اعجاز احمد نواب

نوبل انعام۔پسِ منظر

نوبل انعام کے بانی سویڈن کے شہرۂ آفاق کیمیادان اور صنعت کار جناب الفریڈ نوبل تھے۔وہ 21 اکتوبر 1833ء کو ایک معزز کاشت کار گھرانے میں پیدا ہوئے جسے خاندانی شرافت اور وقار کی بنا پر نوبل کہا جاتا تھا۔

ان کے والد ایمونیل نوبل اگرچہ مناسب تعلیم حاصل نہیں کر پائے تھے لیکن خدا تعالیٰ نے انہیں بڑا زرخیز ذہن عطا کیا تھا۔ایک موجد کا دماغ، جو انہیں نت نئی ایجادات پر اکساتا رہتا۔آبائی پیشہ کھیتی باڑی ہی تھا،مگر ان کا زیادہ وقت سائنسی تجربات میں گزرتا۔یہ شغف والد سے الفریڈ نوبل میں بھی منتقل ہو گیا۔وہ ایک محقق کیمیادان اور صنعت کار تھے۔ان کی تمام عمر سویڈن اور امریکہ میں کیمیائی مادوں پر تحقیق میں گزری جس کے نتیجے میں زرعی اور صنعتی شعبوں میں ایسی مصنوعات سامنے آئیں جو انسانی فلاح و ترقی میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔سنتھیک ربر کی ایجاد میں بھی ان کا اہم کردار تھا۔ڈائنامائٹ کی ایجاد نے پہاڑی علاقوں میں سرنگیں کھودنے اور سڑکیں بنانے کا کام بہت سہل کر دیا۔آج ڈائنامائٹ کے بغیر ڈیموں کی تعمیر،نہروں کی کھدائی اور بوسیدہ عمارتوں کو مسمار کرنے کا تصور بھی محال ہے۔مذکورہ ایجادات کے طفیل انہیں عزت،شہرت اور بے پناہ دولت ملی مگر بقائے دوام شاید ان کے نصیب میں کبھی نہ آتی،اگر وہ نوبل انعام کا اجرا نہ کرتے۔

یہ کہانی بھی بہت عجیب اور دلچسپ ہے۔اپنی شہرت،عزت اور دولت مندی میں سرشار یہ ممتاز کیمیادان اور صنعت کار یکسر بے خبر تھا کہ خلق خدا اسے غائبانہ کیا کہتی اور سمجھتی ہے۔ایک صبح بیدار ہوئے تو اخبار پر نگاہ پڑتے ہی حیرت اور صدمے کا شکار ہو گئے۔دو روز پہلے ان کے خاندان کی مشترکہ فیکٹری میں دھماکہ ہوا تھا جس میں ان کے بھائی کی موت واقع ہو گئی تھی مگر مذکورہ اخبار میں غلط فہمی کی بنا پر ان کی وفات کی خبر شائع ہو گئی تھی۔لکھا تھا: ”موت کا شہنشاہ چل بسا جس نے انسانوں کے ہاتھ میں تباہی کا ہتھیار ڈائنامائٹ تھمانے کے لیے شب و روز ایک کر دیے تھے اور اجتماعی موت کے مہلک ہتھیار سے دولت کے انبار لگائے تھے۔دنیا جہان کی دولت اس کے سانسوں کا تسلسل قائم نہ رکھ سکی۔“ اخبار ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ رنج و غم کے پہاڑ تلے دب گئے۔تبصرہ نگار نے ڈائنامائٹ کے افادی پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا اور انہیں تباہی و بربادی کے بادشاہ کے شیطانی روپ میں عوام الناس کے سامنے پیش کیا تھا۔کیا وہ سچ مچ انسانیت کے دشمن ہیں؟ یہ سوال انہیں کچوکے لگانے لگا۔اسی کشمکش نے انہیں یہ وصیت قلم بند کرنے پر مجبور کیا: ”میں کہ جسے دنیا تباہی کا شہنشاہ تصور کرتی ہے،اپنی تمام دولت دنیا میں امن کے قیام اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے علم برداروں کے لیے وقف کرتا ہوں۔“

یہ وصیت جناب الفریڈ نوبل نے 1896ء میں سان ریموالی کے مقام پر اپنی وفات سے پہلے کی تھی۔اس کی رو سے نو ملین ڈالر کا ایک ٹرسٹ فنڈ قائم کیا گیا جس کے منافع سے ہر سال کیمیا،طبیعیات،طب،امن اور ادب کے میدانوں میں انسانیت کی خدمت کرنے والی شخصیات کو

سویڈش اکیڈمی (اسٹاک ہوم) کے زیرِ انتظام نوبل انعام سے نوازا جاتا ہے۔ یہ ایک طلائی تمغہ ہے جس کے ایک رخ پر جناب الفریڈ نوبل کی شبیہ ہے جبکہ دوسری جانب ادب کی علامتی تصویر کشی کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں مبلغ تیس ہزار ڈالر کی ادائیگی بھی کی جاتی ہے۔

ادبی انعام کی مستحق ایسی ادبی شخصیت سمجھی جاتی ہے جس نے اس سال کے دوران ادب میں کوئی معرکتہ الآرا اور اپنی طرز کا منفرد تخلیقی کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ اگرچہ انعام کے لیے اکثر کسی خاص تخلیق ہی کو بنیاد بنایا جاتا ہے مگر بعض ادباء کو ان کی مجموعی کارکردگی کی بدولت بھی یہ انعام عطا کیا گیا ہے۔ بطور مثال ٹی ایس ایلیٹ، اوان جن اور ارنسٹ ہیمنگوے کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی سال کوئی ایسی تخلیق سامنے نہ آئے جو نوبل انعام کی کسوٹی پر پوری اترتی ہو تو انعام آئندہ برس پر مؤخر کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی سال ایک سے زائد ادباء اعلیٰ پائے کی تخلیقات کے ساتھ سامنے آئیں تو انعام دو یا تین شخصیات میں تقسیم کرنے کی روایت بھی موجود ہے۔ اس انعام کی تقسیم بسا اوقات طویل تعطل کا شکار بھی رہی ہے۔ جنگ عظیم اول اور دوئم کے سات برسوں میں ماسوائے سن 1935ء، یہ انعام کسی کو عطا نہیں ہوا۔

1901ء سے 2007ء تک جن ادباء کو نوبل انعام دیا گیا ہے ان کی تفصیل علیحدہ درج ہے۔ اس کاوش کے بارے میں آپ کا انتظار رہے گا۔

خلوص کیش

خاقان ساجد

نوبل انعام یافتہ مصنفین کی فہرست

سن عیسوی	شخصیت	ملک	اختصاص
2007	ڈورس لیسنگ	برطانیہ	ناول نگار
2006	اورہن پاموک	ترکی	ناول نگار
2005	ہیرلڈ پنٹر	برطانیہ	شاعر/ڈراما نگار
2004	الفریڈ جیلی نیک	آسٹریا	ناول نگار/ڈراما نگار
2003	جے ایم کوئٹزی	جنوبی افریقہ	ناول نگار/نقاد
2002	امرے کرتیز	ہنگری	ناول نگار
2001	وی ایس نیپاول	برطانیہ	ناول نگار/مضمون نگار
2000	گاؤ شنگ جیان	چین/فرانس	ناول نگار/ڈراما نگار
1999	گنٹر گراس	جرمنی	ناول نگار
1998	جوزے سراماگو	پرتگال	ناول نگار/ڈراما نگار
1997	ڈاریوفو	اٹلی	ڈرامہ نگار
1996	وسلاوا شمبورسکا	پولینڈ	شاعر/مترجم/مضمون نگار
1995	سیموس ہینے	آئرلینڈ	شاعر
1994	کنزابورواو	جاپان	ناول نگار/افسانہ نگار
1993	ٹونی موریسن	امریکہ	ناول نگار/مدیر
1992	ڈیرک والکاٹ	سینٹ لوسیا	شاعر/ڈراما نگار
1991	ناڈائن گورڈیمر	جنوبی افریقہ	ناول نگار/افسانہ نگار
1990	اوکتاوی پاز	میکسیکو	شاعر

1989	کامیلو جوزے سیلا	سپین	ناول نگار
1988	نجیب محفوظ	مصر	ناول نگار/افسانہ نگار
1987	جوزف براڈسکائی	امریکہ	شاعر/مترجم
1986	وول سوئینکا	نائجیریا	شاعر/ڈرامانگار
1985	کلاڈی سائمن	فرانس	ناول نگار
1984	جاروسلاو سیفرٹ	چیکوسلاویہ	شاعر/صحافی
1983	ولیم گولڈنگ	برطانیہ	ناول نگار
1982	گیبریل گارشیامارکیز	کولمبو	ناول نگار/افسانہ نگار/صحافی
1981	الیاس کانیٹی	برطانیہ	ناول نگار
1980	سیسلا میلوز	پولینڈ/امریکہ	شاعر
1979	اوڈیسوا الائٹس	یونان	شاعر
1978	آئزک بی سنگر	امریکہ	ناول نگار/افسانہ نگار
1977	وسنتی الیگزینڈر	اسپین	شاعر
1976	ساول بیلو	امریکہ	ناول نگار
1975	یوجینیو مونٹیل	اٹلی	شاعر/نثرنگار
1974	آئیونڈ جانسن اور ہیری مارٹنسن	سویڈن	نثرنگار/شاعر
1973	پیٹرک وائٹ	آسٹریلیا	ناول نگار/افسانہ نگار
1972	ہنرک بول	جرمنی	ناول نگار/افسانہ نگار
1971	پابلو نرودا	چلی	شاعر
1970	الیگزینڈر سولنسٹین	روس	ناول نگار/ڈرامانگار
1969	سموئیل بیکٹ	آئرلینڈ	شاعر/ڈرامانگار
1968	یاسوناری کواباتا	جاپان	ناول نگار/افسانہ نویس
1967	میگوئیل استخیل	گوئٹے مالا	شاعر/ناول نگار

1966	شموئیل یوسف اور نیلی ساش	اسرائیل اور سویڈن	نثر نگار/شاعر اور ڈراما نگار
1965	میخائل شولوخوف	روس	ناول نگار/افسانہ نگار
1964	جین پال سارتر	فرانس	فلسفی/ناول نگار/کہانی کار
1963	جیورگاس سیفرس	یونان	شاعر
1962	جان سٹین بک	امریکہ	ناول نگار/افسانہ نگار
1961	آئیو آندرک	یوگوسلاویہ	ناول نگار/کہانی کار
1960	سینٹ جان پرسے	فرانس	شاعر
1959	سلواتو رقواسی مودو	اٹلی	شاعر/نقاد
1958	بورس لیونیڈووچ	روس	شاعر/ناول نگار
1957	البرٹ کامیو	فرانس	فلسفی/ناول نگار/افسانہ نگار
1956	جوآن ریموں جیمنزے	اسپین	شاعر
1955	ہالڈور لیکنیس	آئس لینڈ	ناول نگار/کہانی کار
1954	ارنسٹ ہیمنگوے	امریکہ	ناول نگار/افسانہ نگار
1953	ونسٹن چرچل	برطانیہ	ادیب، مقرر، وزیراعظم برطانیہ
1952	فرانکوئس موریس	فرانس	شاعر، ناول نگار، افسانہ نگار
1951	پارلیگر کوسٹ	سویڈن	فلسفی، نقاد، ادیب
1950	برٹرینڈ رسل	برطانیہ	ناول نگار، افسانہ نگار
1949	ولیم فاکنر	امریکہ	شاعر، ناول نگار، کہانی کار
1948	ٹی ایس ایلیٹ	برطانیہ	شاعر، نقاد
1947	آندرے گائڈ	فرانس	ناول نگار، مضمون نگار
1946	ہرمن ہیسے	سوئٹزرلینڈ	شاعر، ناول نگار، کہانی کار
1945	گبریلا مسترال	چلی	شاعرہ
1944	جوہانس وی جینسن	ڈنمارک	شاعر، ناول نگار، ڈراما نگار



1940 سے 1943 تک نوبل انعام تعطل کا شکار رہا			
1939	فرانز یمل سلپنا	فن لینڈ	ناول نگار
1938	پرل ایس بک	امریکہ	ناول نگار، افسانہ نگار
1937	راجر مارٹن ڈی گارڈ	فرانس	ناول نگار
1936	یوجین اونائل	امریکہ	ڈرامہ نگار
1935	کسی ادیب کو نوبل انعام نہیں دیا گیا۔		
1934	لیوگی پیرانڈیلو	اٹلی	ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، شاعر، ناول نگار
1933	ایوان بُنن	روس (فرانس میں خودساختہ جلاوطن)	افسانہ نگار
1932	جان گالزوردی	برطانیہ	ناول نگار، ڈرامہ نگار
1931	ایرک ایکسل کارلفیلڈ	سویڈن	شاعر
1930	سنکلیئر لیوس	امریکہ	ناول نگار، ڈرامہ نگار
1929	تھامس مان	جرمنی	ناول نگار، افسانہ نویس
1928	سگریڈ انڈسٹ	ناروے	ناول نگار
1927	ہنری برگساں	فرانس	فلسفی
1926	گریزیا ڈیلڈا	اٹلی	ناول نگار، افسانہ نگار
1925	جارج برنارڈ شا	برطانیہ	ڈراما نگار، نقاد، مضمون نگار
1924	ولادی سلا ریموں	پولینڈ	ناول نگار، افسانہ نگار
1923	ولیم بٹلر ییٹس	آئرلینڈ	شاعر، ڈرامہ نگار
1922	جکنتو بیناونتی	اسپین	ڈرامہ نگار
1921	اناطول فرانس	فرانس	ناول نگار، افسانہ نگار
1920	نٹ ہیمسن	ناروے	شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈراما نویس

1919	کارل سپٹلر	سوئٹزرلینڈ	شاعر
1918	کسی ادیب کو انعام نہیں دیا گیا۔		
1917	کارل جلیرپ اور ہنرک پونٹو پیداں		شاعر، ناول نگار، افسانہ نگار
1916	کارل گستاف ہیڈنسٹم	سویڈن	شاعر، ناول نگار
1915	رومین رولاں	فرانس	ناول نگار
1914	کسی ادیب کو انعام نہیں دیا گیا۔		
1913	رابندرناتھ ٹیگور	متحدہ ہندوستان	شاعر، فلسفی، کہانی کار، ناول نگار
1912	گرہارٹ ہاپٹمن	جرمنی	ڈراما نگار، افسانہ نگار
1911	موریس میٹرلنک	بیلجیم	شاعر، ڈراما نگار، مضمون نگار
1910	پال ہیسے	جرمنی	کہانی کار، ڈراما نگار، ناول نگار، شاعر
1909	سلمی لیگراف	سویڈن	ناول نگار، افسانہ نگار
1908	رڈولف یوکین	جرمنی	فلسفی
1907	روڈیارڈ کپلنگ	برطانیہ	ناول نگار، افسانہ نگار، صحافی
1906	گیوز کارڈوچی	اٹلی	شاعر
1905	ہنرک سینکووچ	پولینڈ	ناول نگار
1904	فریڈرک مسترال اور جوزے ایکیگارے	فرانس، اسپین	شاعر اور ڈراما نگار
1903	بجورنسٹرن بجورسن	ناروے	شاعر، افسانہ نگار
1902	تھیوڈر موسن	جرمنی	مؤرخ، صحافی، سکالر
1901	سلے رودھم	فرانس	شاعر، مضمون نگار

☆......☆......☆

خلاف ضابطہ

جرمن ادیب ہنرخ بوُل 21 دسمبر 1917ء کو جرمنی کے شہر بون میں پیدا ہوئے۔ انہیں اپنے گھریلو حالات کے سبب سکول اور کالج میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع میسر نہ آ سکا مگر دانش و بینش مدرسوں کی محتاج کہاں ہوتی ہے۔ بطور ادیب انہوں نے اپنے عہد کو فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ اپنی تحریروں میں پیش کیا۔ علامتی سطح پر ان کی کہانیاں اور ناول پوری انسانیت کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔ معاشرے کے گرے پڑے، کم مایا اور بے سایہ لوگ ان کا خاص موضوع رہے ہیں۔ ان کی شخصیت میں انسان دوستی اور اخلاص ایک غالب عنصر تھا۔ باشعور قاری کو ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے اس کا احساس قدم بہ قدم ہوتا ہے۔

ہنرخ بوُل کے حصے میں یہ اعزاز بھی آیا ہے کہ انہوں نے جرمن ادب کا احیاء کیا اور اسے بین الاقوامی ادب کے مقابل لا کھڑا کیا۔ انہیں اعلیٰ ادبی خدمات کے اعتراف میں 1972ء کے نوبل ادبی انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔

☆......☆......☆

میں بندرگاہ کے کنارے کھڑا ان سمندری پرندوں کو دیکھ رہا تھا جو بار بار پانی میں غوطہ لگاتے اور بھیگے ہوئے جسموں سے پانی جھاڑنے کے لئے اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے تھے۔ ان کے پروں سے پانی پھولوں پر شبنم کی طرح ٹپک رہا تھا۔ میں محویت سے ان کا یہ کھیل دیکھ رہا تھا۔ میری آنکھیں شاید اس منظر کے سوا کچھ اور دیکھنا ہی نہ چاہتی تھیں۔ سمندری سطح پر پھیلے ہوئے تیل نے سطح کو مزید چمکدار اور گہرا بنا دیا تھا۔ اردگرد کوئی جہاز نہیں تھا۔ بندرگاہ پر کھڑی زنگ آلود کرینیں خاموش اور متروک دکھائی دیتی تھیں۔ ساحلی عمارتوں پر سنسان ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ ویرانی کا یہ عالم کہ چوہے بھی اندر داخل ہوتے ہوئے گھبرائیں۔ لگتا تھا اس ساحل پر غیر ملکی جہازوں کی آمدورفت پر قدغن ہے۔

یکایک ایک پرندہ ڈبکی لگا کر پھڑ پھڑاتا ہوا اڑا اور فضا میں بلند ہو کر دوبارہ سمندر میں غوطہ زن ہوا۔ لمحہ بھر بعد اس نے پھر گردن تک غوطہ لگایا اور پر پھڑ پھڑا کر، اپنا بدن ہولے ہولے تولتے ہوئے پرواز کی تیاری کرنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اسے پانی سے چھیڑ چھاڑ میں مزہ آ رہا ہے۔ ہوا میں اسے اِدھر اُدھر اڑتے دیکھ کر مجھے گمان ہوا کہ وہ اپنے محبوب کو ڈھونڈ رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ محبوب سے زیادہ اس وقت اسے خوراک کی طلب ہو رہی تھی۔ تبھی تو وہ سمندر کی شوریدہ سر لہروں سے بے پروا ہو کر اپنا وجود پانی کے سپرد کرتا اور شکار کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ جب تک سانس اس کا ساتھ دیتا، وہ پانی میں گردن ڈالے رکھتا لیکن اس کی چونچ شکار سے محروم رہتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ہمت نہ ہارتا۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ کاش میرے پاس اس وقت ڈبل روٹی کا ٹکڑا ہوتا تو میں اسے یوں تھکنے، بھٹکنے اور تڑپنے نہ دیتا۔ میں اسے ڈبل روٹی کے ٹکڑے ڈالتا جاتا اور پانی کی سطح پر اس کے ساتھ اس کھیل میں شریک ہو جاتا۔

لیکن اس سے میرے پاس ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا تک نہیں تھا۔ میں بذات خود بھوک سے بے تاب اور اس پرندے کی طرح بے بس تھا۔

میں نے اپنے ہاتھ خالی جیبوں میں ڈال لئے اور اپنی خواہش دل میں دبالی۔

دفعتاً کسی نے میرے کندھے پر زور سے اپنا ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک پولیس والا تھا۔ مجھے اس کی یہ دخل اندازی بُری لگی۔ جی چاہا اس کا ہاتھ جھٹک دوں اور دوبارہ معصوم پرندے کا نظارہ کرنے لگوں۔ اس وقت تک، جب تک اس پرندے کی چونچ میں خوراک کا کوئی ٹکڑا نہ آ جائے۔ لیکن اب تو میں خود اس سپاہی کے شکنجے میں شکار کی طرح پھنسا ہوا تھا۔

''کامریڈ!'' اس نے میرے کندھے پر دباؤ ڈال کر کہا۔

''جی جناب!'' میں نے عاجزی سے جواب دیا۔

''جناب؟ جناب کوئی لفظ نہیں۔ یہاں سب لوگ کامریڈ ہیں۔'' اس کی آواز میں واضح طنز تھا۔

''تو پھر! ..... پھر آپ نے مجھے کیوں پکڑ رکھا ہے؟ کیا مجھ سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہے؟''

وہ مسکرایا ''جرم! تم مغموم نظر آتے ہو۔''

اس کی بات سن کر میں کھلکھلا کر ہنسا۔

''اس میں ہنسے کی کیا بات ہے؟'' اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ شاید وہ اس وقت بیزاریت کا شکار ہے اس لئے غصہ دکھا رہا ہے۔ آج شاید ساحل پر اسے کوئی شکار نہیں ملا۔ نہ کوئی کبی، نہ نشے میں دھت مدہوش اور نہ کوئی جیب تراش۔ لیکن چند لمحوں ہی میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ واقعی غصے میں ہے اور مجھے شکار بنانا چاہ رہا ہے۔

اب اس نے دوسرا ہاتھ بھی بڑھایا اور مجھے قابو کر لیا۔ اس وقت میری حالت اس پرندے سے مشابہ تھی جو جال میں پھنس گیا ہو اور اس سے نکلنے کے لئے پھڑ پھڑا رہا ہو۔ اس کی گرفت میں پھنسے ہوئے میں نے صاف شفاف فضا کا جائزہ لیا، سمندر کو اپنی نظروں میں سمویا اور اپنے صیاد کے پہلو میں چلنے لگا۔ مجھے علم تھا کہ پولیس کی گرفت میں آنے کا مطلب یہی ہے کہ اب لمبے عرصے کیلئے مجھے تاریکی میں دھکیل دیا جائے۔ یہ سمندر میں دھکیل دیے جانے سے زیادہ اذیت ناک تھا۔ جیل کا خیال آتے ہی میں اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آ گیا اور ہکلاتے ہوئے کہا:

''کامریڈ۔ میرا قصور تو بتایے؟''

''قصور...... اس ملک کا قانون یہ ہے کہ ہر شخص ہر وقت خوش نظر آئے۔''

''لیکن میں تو بے حد مسرور ہوں۔'' میں نے پورے جوش و جذبے سے جواب دیا۔

''بالکل غلط۔''

''لیکن میں تو ملک میں رائج اس قانون سے ناواقف ہوں۔''

''کیوں؟ اس قانون کا اعلان چھتیس گھنٹے پہلے ہوا ہے۔ تم نے کیوں نہیں سنا؟ چوبیس گھنٹے گزر جانے کے بعد ہر اعلان قانون میں بدل جاتا ہے۔''

''لیکن......لیکن، میں تو اس اعلان کے بارے میں اب سن رہا ہوں۔''

''یہ اعلان تمام اخباروں میں چھپ چکا ہے۔ علاوہ ازیں جگہ جگہ لاؤڈ سپیکر نصب کر کے اس کا اعلان کیا گیا۔ ان چھتیس گھنٹوں میں تم کہاں تھے؟''

وہ اب بھی مجھے اپنے ساتھ گھسیٹے لئے جا رہا تھا۔ شدید سردی کے سبب میں بری طرح کانپ رہا تھا۔ بھوک نے الگ ستا رکھا تھا۔ میرا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی جبکہ اعلان کے مطابق ہر آدمی پر لازم تھا کہ وہ ہشاش بشاش نظر آئے۔

تو یہ تھا میرا جرم۔ تھانے کی طرف جاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ہر راہ گیر نے خوشی کا ماسک منہ پر چڑھا رکھا ہے۔ ہمیں دیکھ کر راہ گیر رُک جاتے۔ سپاہی ہر رُکنے والے کے کان میں کچھ کہتا تو اس کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگتا۔ حالانکہ مجھے لگ رہا تھا کہ ہر کوئی بولایا بولایا پھر رہا ہے۔ ہر شخص دن بھر کی مشقت کے بعد جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا ہے۔ ہمارے راستے میں آنے والا ہر آدمی ہم سے بچ جانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ غالباً اس لئے کہ سپاہی کی تیز نگاہیں اس کا اصل چہرہ نہ بھانپ لیں۔ صاف لگ رہا تھا کہ ہر کوئی پولیس والے کی نظروں سے بچنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

ایک چوراہے پر ہماری ایک بوڑھے سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ حلیے سے کوئی سکول ماسٹر لگ رہا تھا۔ ہم اس کے اتنا قریب پہنچ چکے تھے کہ وہ بچ نکلنے سے قاصر تھا۔ قاعدے کے مطابق اس نے بڑے احترام سے سپاہی کو سلام کیا اور میرے منہ پر تین بار تھوک کر کہا:

''غدار کہیں کا!''

اس کی اس حرکت سے قانون کے تقاضے تو پورے ہو گئے مگر مجھے صاف محسوس ہوا کہ اس فرض کی ادائیگی سے اس کا گلا خشک ہو گیا ہے۔

میں نے آستین سے تھوک صاف کرنے کی جسارت کی تو میری کمر پر زوردار مکا پڑا۔ سپاہی نے غرا کر کہا:

''آگے بڑھو۔''

میں نے اپنی سزا کی طرف قدم بڑھا دیا۔ سکول ماسٹر تیز قدموں سے چلتا ہوا کہیں غائب ہو گیا۔ اب راستہ بالکل صاف تھا کیونکہ تمام راہگیر ہم سے پہلو بچا کر دور سے گزر رہے تھے۔ آخر ہم تفتیش گاہ پہنچ گئے۔ یکا یک بگل بجنے کی آواز آئی۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ سب مزدور اپنے اپنے کام چھوڑ دیں اور نہا دھو کر، صاف لباس پہن کر خوش و خرم نظر آئیں۔ قانون کے مطابق فیکٹری سے باہر نکلنے والا ہر مزدور خوش نظر آ رہا تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ اس خوشی سے یہ تاثر ملے کہ وہ کام سے چھٹکارا پا کر بغلیں بجا رہا ہے۔

میری خوش بختی کہ بگل دس منٹ پہلے بجا دیا گیا۔ شکر ہے یہ دس منٹ مزدوروں نے ہاتھ منہ دھونے میں صرف کئے ورنہ قاعدے کے مطابق میں جس مزدور کے سامنے سے گزرتا وہ تین مرتبہ میرے منہ پر تھوکتا۔

مجھے جس عمارت میں لے جایا گیا تھا وہ سرخ پتھروں کی بنی ہوئی تھی۔ دو سپاہی دروازے پر پہرہ دے رہے تھے۔ انہوں نے بھی ضابطے کے مطابق میری پیٹھ پر اپنی بندوقوں کے بٹ رسید کئے۔ اندر ایک بڑی سی میز تھی جس کے پاس دو کرسیاں پڑی تھیں اور میز پر ٹیلی فون پڑا تھا۔ مجھے کمرے کے وسط میں کھڑا کر دیا گیا۔ میز کے پاس ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ ایک اور شخص خاموشی سے اندر آیا اور اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ وہ سادہ لباس پہنے ہوئے تھا۔ جبکہ دوسرا فوجی وردی میں ملبوس تھا۔ اب مجھ سے تفتیش شروع ہوئی۔

''تم کیا کرتے ہو؟''

''ایک عام کا مریڈ ہوں۔''

''تاریخ پیدائش؟''

''یکم جنوری 1901ء''

''یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''جی میں ایک جیل میں قید تھا۔''

میرا جواب سن کر دونوں ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔

''کس جیل میں؟''

''جیل نمبر 12، کوٹھڑی نمبر 13۔ میں نے کل ہی رہائی پائی ہے۔''

''رہائی کا پروانہ کہاں ہے؟''

میں نے جیب سے رہائی کے کاغذات نکال کر ان کے سامنے رکھ دیے۔

''تمہارا جرم کیا تھا؟''

''جی میں ان دنوں خوش خوش دکھائی دے رہا تھا۔''

وہ دونوں پھر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

''کھل کر بات کرو......''



''اس روز ایک بہت بڑا سرکاری افسر انتقال کر گیا تھا......حکومت کی جانب سے اعلان ہوا کہ سب لوگ سوگ میں شامل ہوں گے۔ مجھے اس افسر سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لئے الگ تھلگ رہا۔ ایک پولیس مین نے مجھے گرفتار کر لیا اور بیان دے کر اندر کروا دیا کہ میں سوگ میں ڈوبے ہوئے عوام سے الگ تھلگ خوشیاں منا رہا تھا۔''

''تمہیں کتنی سزا ہوئی؟''

''پانچ سال قید''

پوچھ گچھ ختم ہوئی تو اچانک دو پولیس والے اندر آئے اور میری پٹائی شروع کر دی۔ جلد ہی میرا فیصلہ سنا دیا گیا۔

مجھے اس بار دس سال قید کی سزا ہوئی تھی......جی ہاں! خوشی سے کھلا ہوا چہرہ میرے لئے پانچ سال قید کا موجب بنا اور اب میرے مغموم چہرے نے مجھے دس سال کی سزا دلا ڈالی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ جب مجھے رہائی نصیب ہوگی تو شاید میرا کوئی چہرہ ہی نہ ہو۔ نہ خوش و خرم، نہ مغموم اور اُداس۔

☆......☆......☆

گمان

اٹلی کے عظیم کہانی کار اور ڈرامہ نگار لیوگی پیرانڈیلو 28 جون 1867ء کو سسلی میں تولد ہوئے۔ انہوں نے یونیورسٹی سے 1891ء میں فلسفے میں پی ایچ ڈی کی اور شعبہ درس و تدریس سے منسلک ہوگئے تاہم پروفیسر لیوگی کے اندر ایک قلم کار چھپا ہوا تھا جس نے انہیں لٹریچر کی جانب راغب کیا تو وہ ایک منفرد ڈرامہ نگار اور افسانہ نویس کے طور پر سامنے آئے۔ علاوہ ازیں شاعری اور تنقید میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ انہیں نا صرف اٹلی میں ڈرامے کو حیات نوبخشنے والے ڈراما نگار کی حیثیت سے عزت و شہرت نصیب ہوئی بلکہ عالمی سطح پر ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا۔ انہوں نے تکنیک اور موضوعات کے حوالے سے ڈرامے میں کئی نئے تجربات بھی کیے۔ ان کا سب سے مشہور اور رسوا کن ڈراما "چھ کردار ایک مصنف کی تلاش میں" ہے، جس پر بہت اعتراضات ہوئے۔ ان پر فحاشی کا الزام بھی عائد کیا گیا۔ آج اسے عالمی ڈرامے میں ایک کلاسیکی حیثیت حاصل ہے!

ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں انسانی نفسیات کو فلسفیانہ رنگ میں بیان کرتے ہیں اور سماجی حقائق کو پوری بے خوفی اور بے باکی سے پیش کرتے ہیں۔ زیر نظر افسانہ پڑھیے اور اس سچے فنکار کے ہنر کی داد دیجیے۔

لیوگی پرانڈیلو کو ان کی ادبی خدمات خصوصاً ڈراما نگاری کی بناء پر 1934ء میں ادب کا نوبل انعام عطا کیا گیا۔ اس عزت افزائی کے دو برس بعد 10 نومبر 1936ء کو وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

☆......☆......☆

تمام لوگوں نے ملحقہ کمرے میں جا کر اس سے دریافت کیا کہ آیا وہ تابوت پر ڈھکنا جڑنے سے پیشتر اپنی اہلیہ کا آخری دیدار کرنا چاہے گا؟ وہ ایک بڑی کرسی میں سویا ہوا تھا۔

"بہت تاریکی ہے۔ کیا وقت ہوگیا ہے؟" اس نے استفسار کیا۔

صبح نو بجے کا عمل تھا مگر بادلوں کی وجہ سے روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ جنازے کا وقت دس بجے مقرر کیا گیا تھا۔

سینور پادری سپاٹ نظروں سے سب کو گھورتا رہا۔ کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ رات بھر اچھی نیند سویا رہا ہوگا۔ نیند اور گذشتہ چند روز کے صدمے نے اس کا ذہن ماؤف کر رکھا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پڑوسیوں سے منہ چھپا لے جو مدھم روشنی میں کرسی کے گرد کھڑے تھے۔ مگر دیر تک نیند کرنے سے اس کا سارا بدن سیسے کی طرح بھاری ہو رہا تھا۔ اس کے پیروں میں کھڑے ہونے کیلئے جنبش پیدا ہوئی مگر فوراً ہی دم توڑ گئی۔ اس کے منہ سے اچانک اونچی آواز میں ایک لفظ نکلا:

''ہمیشہ!''

لب ولہجہ ایسا تھا جیسے کوئی کسمسا کر دوبارہ منہ پر چادر ڈالے اور سو جائے۔ سب سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''ہمیشہ کیا؟''

وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ دن کے وقت بھی وہاں ہمیشہ اندھیرا ہی رہتا ہے۔ مگر پھر یہ کہنا اسے بے معنی لگا۔ یہ اس کی اہلیہ کی موت کا اگلا دن تھا۔ تدفین کا دن۔ یہ مٹیلی روشنی اور گہری نیند اسے ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس حقیقت سمیت کہ ملحقہ کمرے میں اس کی بیوی کی میت رکھی ہوئی تھی۔

کھڑکیاں ابھی تک بند تھیں۔ رات کو انہیں کھولا ہی نہیں گیا تھا۔ بڑی بڑی موم بتیوں سے شب بھر موم ٹپکتی رہی تھی۔ کمرے میں ابھی تک کچھ حرارت موجود تھی۔ میت کو پلنگ سمیت کمرے سے اٹھا کر باہر لے جایا گیا تھا۔ اب اکڑی ہوئی، راکھ سی نعش، زردی مائل سفید کاٹن میں لپٹی، گدے دار تابوت میں رکھی ہوئی تھی......

''نہیں بہت ہو چکا۔ میں اس کا چہرہ دیکھ چکا ہوں'' اس نے سوچا اور آنکھیں موندلیں۔ مسلسل رونے سے اس کی آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔ بہت ہو چکا۔ اس نیند میں سب کچھ زائل ہو گیا۔ المناک خلا کا ایک احساس تو ہے مگر دکھ کی وہ چبھن نہیں رہی۔ بس اب لوگ تابوت کو بند کر دیں اور اس میں رکھی متاع حیات کو لے چلیں۔

''مگر وہ ابھی تک ملحقہ کمرے میں پڑی ہوئی ہے'' یہ خیال کوندے کی طرح لپکا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا تو انہوں نے اسے بازوؤں سے تھام لیا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ وہ اسے کھلے ہوئے تابوت کے پاس لے گئے۔ اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور نام لے کر ہولے سے آواز دی۔ صرف وہی اسے اس نام سے پکارتا تھا۔ ساتھ گذری ہوئی زندگی کے بھی رنگ اس نام سے وابستہ تھے۔ اس نے رنجیدگی سے اردگرد کھڑے لوگوں کی طرف دیکھا جو اس کی مردہ بیوی کا دیدار کر رہے تھے۔ انہیں اس عورت کے بارے میں کیا پتا تھا؟ وہ اندازہ ہی نہیں لگا سکتے تھے کہ اس سے کیا شے چھن گئی تھی۔ وہ چیخنا چاہتا تھا۔ اس کے تاثرات بھانپ کر اس کا بیٹا اسے تابوت سے ہٹانے کے لئے آگے بڑھا۔ بیٹے کا مقصد سمجھ کر اس کے سارے وجود میں سرد لہر دوڑ گئی۔ جیسے وہ ہجوم میں بے لباس ہو گیا ہو۔ اسے اپنے جذبات، یہاں تک کہ رات کی نیند پر بھی شرمساری محسوس ہونے لگی۔ بس اب جلدی کرنی چاہیے تا کہ جو دوست جنازے کے ساتھ گرجا گھر تک جانا چاہتے ہیں انہیں زیادہ انتظار سے بچایا جا سکے۔

''پاپا۔ جانے دو۔ ہوش کرو!''

بیٹے کی آواز پر قابل رحم، دکھ سے شکستہ انسان خفگی بھری نظروں سے دیکھتا اپنی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔

''ہاں ہوش بہتر ہے۔ اندر سے اُبلتے دکھ پر چیخنا چلانا بے کار ہے۔''

اس اذیت کو لفظوں کا جامہ پہنانا آسان نہیں تھا۔ اس خاوند کے دکھ کا، جس کی محبت زندہ ہو اور بیوی مر جائے، اس بیٹے کے دکھ سے کیا موازنہ، جس کے لئے عمر کے ایک خاص حصے میں والدین کی موت فطری بات ہے۔ بیٹے کے لئے یہ موت بہت بروقت تھی۔ اس کی شادی طے تھی۔ تین ماہ کے

سوگ کے اختتام پر وہ رشتۂ ازدواج میں بندھ جائے گا۔ اب تو جواز بھی ہاتھ آ گیا کہ باپ بیٹے کو گھر کے کام کاج کے لئے عورت کی ضرورت تھی!

''پادری! پادری!'' باہر والے کمرے سے کسی نے صدا دی۔

یہ احساس کر کے وہ اور بھی سرد پڑ گیا کہ اس کی بجائے اب اس کے بیٹے کو اس خاندانی نام سے پکارا جا رہا تھا۔ اب اس کا بیٹا ہی اس کا زیادہ حق دار تھا۔ یہ یاد کر کے اسے ندامت سی محسوس ہونے لگی کہ اس نے سب کے سامنے اپنی بیوی کا پیار کا نام پکار کر اس کی بے حرمتی کی تھی۔ نادانوں کی سی حرکت کی تھی۔ بالکل بے کار۔ رات بھر سویا رہنے سے اس کی عقل پر گویا پتھر پڑ گئے تھے!

جینے میں اب دلچسپی کا کوئی عنصر تھا تو بس یہی کہ اب گھر کا نیا طور طریقہ کیا ہو گا۔ مثلاً وہ اسے سونے کے لئے کہاں جگہ دیں گے؟ بڑا ڈبل بیڈ تو پہلے ہی اس کے کمرے سے ہٹایا جا چکا تھا۔ جس کا واضح مطلب تھا کہ اب اسے چھوٹا پلنگ ملے گا۔ اس کے بیٹے والا پلنگ۔ ڈبل بیڈ پر اب بیٹے نے اپنی بیوی کے ساتھ سونا تھا۔ وہ خود چھوٹے پلنگ پر سوئے گا تو بجز سرد ہوا کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا......

مختلف باتیں اس کے بے حس ہوتے ذہن میں خلط ملط ہو رہی تھیں۔ اس کے اندر اور باہر خلا کا سا احساس تھا۔ دیر تک بیٹھنے سے جسم سن ہو گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تو خلاء میں پرندے کے پر کی طرح ہلکا ہو جائے گا۔ اس کی زندگی بے حقیقت و بے معنی ہو چکی تھی۔ اس کی ذات اور کرسی میں شاید ہی کوئی فرق باقی بچا ہو بلکہ کرسی تو پھر بھی اپنی چاروں ٹانگوں پر قائم تھی جبکہ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس کی ٹانگیں اور پاؤں کہاں ہیں اور وہ اپنے ہاتھوں کا کیا کرے؟ اب اسے اپنی زندگی کی پرواہ ہی کہاں تھی؟ بلکہ اسے تو دوسروں کی زندگی سے بھی کوئی خاص واسطہ نہ رہا تھا۔ مگر پھر بھی اسے جینا تو تھا۔ نئے سرے سے ایسی زندگی کی ابتدا، جس کا کوئی مدھم سا خاکہ بھی اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ اس نے کبھی ایسی زندگی کے بارے میں سوچنا تک پسند نہیں کیا تھا مگر اب اسے سوچنا تھا۔ کیونکہ اس کی دنیا بدل چکی تھی۔ عجیب بے بسی تھی۔ وہ بوڑھا تو نہیں تھا مگر جوان بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔

وہ بیٹے کے لئے بچہ بن گیا تھا۔ سبھی اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ جوان بیٹوں کی نگاہ میں باپ بچے کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں جنہیں پالنا ہوتا ہے۔ امنگوں سے بھرے جوان بیٹے کامیابی سے زندگی میں آگے بڑھتے جاتے ہیں اور باپ فارغ بیٹھے اس خدمت کی وصولی کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی اولاد کے بچپن میں کی ہوتی ہے۔

مگر اکیلا بستر!

اور پھر انہوں نے اسے وہ چھوٹا کمرہ بھی نہیں دیا تھا جس میں کبھی بیٹا رہائش رکھتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس کی نسبت صحن کے ایک کونے میں پوشیدہ کمرہ بہتر رہے گا۔ وہاں اسے زیادہ آزادی میسر آئے گی۔ جو چاہے کرے۔ انہوں نے اس کمرے کو بہترین پرانے فرنیچر سے سجایا تاکہ کسی کو یہ احساس نہ ہو کہ کبھی اس کمرے میں نوکر رہتا تھا۔

شادی کے بعد گھر میں سامنے والے بھی کمرے نت نئے سامان اور فرنیچر سے سجا دیئے گئے۔ قالین بھی ڈالے گئے۔ پرانے وقتوں کی ایک نشانی بھی یاد رکھنے کیلئے باقی نہ رہنے دی گئی۔

وہ نوجوان جوڑے کی زندگی سے الگ تھلگ چھوٹے سے تاریک کمرے میں رہتا تھا۔ پرانے فرنیچر سے سجے اس کوٹھڑی نما کمرے میں

پھینک دیے جانے پراسے حیرت انگیز طور پر کوئی بے عزتی یا خفگی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اسے بیٹے کی کامیابیاں سن کر خوشی ہوتی تھی۔ وہ گھر کے نئے انتظام سے مطمئن تھا۔

اس کے قلبی اطمینان کی ایک گہری مگر غیر واضح توجیہہ یہ پیش کی جاسکتی ہے کہ زندگی سے وابستہ روشنی اور امید نے گزرے دنوں کی یادوں کو دھندلانا شروع کر دیا تھا۔ لاشعوری طور پر اسے محسوس ہوتا کہ اب اس کی پشت پر ایک روشن دروازہ نمودار ہوگیا ہے جسے وہ جب چاہے وا کر دے۔ اب جبکہ کسی کو اس کی پروا نہیں تھی اور اسے چھوٹے سے کمرے میں اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا تو اسے یہ بہت آسان لگتا تھا۔ وہ خود کو ہوا سے بھی ہلکا پھلکا محسوس کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ہر چیز کو روشنی بخشتی اس کیلئے حیرت کے دروازے کھولتی جا رہی تھی۔ گویا وہ ایک بار پھر سچ مچ بچہ بن گیا تھا۔ بچوں کی مانند زندگی سے بھرپور کھلی آنکھوں سے وہ ایسی دنیا کا مشاہدہ کر رہا تھا جو اس کے لئے یکسر نئی تھی......

تجربے کے بارگراں سے نجات پا کر اسے بڑوں کی دنیا کے آداب بھول گئے تھے۔ وہ حتی الامکان ان کی صحبت سے دور رہتا۔ نوجوان لڑکے اسے بہت بوڑھا سمجھتے تھے اس لئے وہ بچوں کے پارک کا رخ کرتا۔ وہ وہاں گھاس پر کھیلتے بچوں کے درمیان جا کر بیٹھ جاتا۔ گھاس کی خوشبو میں عجیب سحر تھا۔ درختوں کے عقب میں بہتے جھرنے کی آواز میں چڑیوں کی سرسراہٹ گم ہو جاتی۔ ایک روز بچوں نے اپنا کھیل بھلا کر جوتے اور جرابیں اتار ڈالیں۔ انہیں تازہ اور نرم گھاس میں ننگے پاؤں چلنا اچھا لگ رہا تھا۔ دبیز گھاس میں ان کے پاؤں دھنس رہے تھے۔ اس نے ان کی تقلید میں ایک جوتا اُتار دیا۔ ابھی دوسرا جوتا اتار رہا تھا کہ یکا یک ایک نوجوان لڑکی اس کے سامنے آئی اور تمتماتے ہوئے چہرے اور شعلہ بار آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے چلائی:

"سور!"

لڑکی کے لباس کا سامنے والا حصہ جھاڑی میں اس طرح الجھا ہوا تھا کہ وہ نیم عریاں ہوگئی تھی۔ اس نے دامن کھینچ کر ٹانگوں کے برابر کیا۔ اس کی دانست میں زمین پر بیٹھا ہوا بوڑھا اسے گھور رہا تھا۔ اس کی بدگمانی محسوس کر کے وہ سن ہوگیا۔ اس نے کیا سوچا تھا؟ وہ تو محض بچوں کے معصوم کھیل سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ قدرے جھکا اور اپنے دونوں ہاتھ کھردرے ننگے پیروں پر رکھ لئے۔ نہ جانے اس لڑکی نے کیا غلط بات دیکھی تھی؟ کیا بڑھاپے میں انسان کو بچوں جیسی خوشی حاصل کرنے کا حق نہیں رہتا؟ کیا بڑھاپے میں انسان صرف برائی کرنے کے بارے میں سوچ سکتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو ایک لمحے میں بچہ بننا ترک کر کے مرد کا روپ دھار لیتا۔ جوان جذبے اب بھی اس کے وجود میں زندہ تھے۔ کم ظرف لڑکی نے کیسے اس کی توہین کر ڈالی تھی۔ مایوسی اور رنجیدگی کے عالم میں وہ گھاس پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ اس کے منہ کا ذائقہ تلخ ہوگیا۔ اگر وہ ایسا چاہتا تو...... اس کے بیٹے نے اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا کہ اس کی بھی کچھ "خواہشات" ہوسکتی تھیں...... ایسی ضروریات کے لئے اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔

غصے سے کپکپاتے ہوئے وہ اٹھا اور شرم سار ہو کر جوتے پہنے۔ اس کے سر میں مرکوز خون میں حرارت اور تیزی آ گئی۔ 'ہاں مجھے معلوم ہے ایسے کاموں کے لئے کہاں جاتے ہیں۔ میں خوب جانتا ہوں۔'

گھر پہنچ کر وہ کمرے میں ادھر اُدھر بکھرے ہوئے سامان کے بیچ راستہ بناتا ہوا پلنگ پر گر سا گیا اور دیوار کی طرف منہ کر لیا۔

☆......☆......☆

مرگ

پولینڈ کے شہرۂ آفاق ادیب ولادی سلاو ریموں 7 مئی 1868ء کو ایڈم نامی قصبے کے نواح میں پیدا ہوئے۔ ان کے ماں باپ کیتھولک عیسائی تھے۔ انہوں نے کسی کالج سے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی، تجرد کی زندگی گزاری اور کوئی خاص پیشہ بھی اختیار نہیں کیا۔ ان کے اندر ایک تخلیق کار پوشیدہ تھا جس نے انہیں کہیں چین نہ لینے دیا۔ وہ ایک عظیم رزمیہ نگار اور شاعر تھے۔ ان کا شاہکار ''کسان'' نامی رزمیہ ہے جو انگریزی میں چار جلدوں میں شائع ہوا۔ یہ ایک طویل ترین نظم ہے جو پولینڈ کے لاچار، بے مایہ اور بے بس کسانوں کی زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ اسی پر انہیں ادب کے نوبل انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔ یہ انعام انہیں 1924ء میں ملا۔ ریموں کی ابتدائی دور کی تخلیقات نیچرل ازم سے متاثر تھیں مگر بتدریج وہ ریئل ازم اور سمبل ازم کی طرف راغب ہو گئے۔ ریموں اپنے دل میں انسانیت کا درد رکھتے تھے۔ غریب کسانوں کے ساتھ ان کی دلی وابستگی اور ان کی کسمپرسی کی حقیقت پسندانہ انداز میں عکاسی ان کی تحریروں میں واضح نظر آتی ہے۔ ''کسان'' کے علاوہ ان کی اہم تصانیف میں ''کامیڈین'' اور ''پرامزڈ لینڈ'' شامل ہیں۔ انہوں نے افسانے اور کہانیاں بھی تخلیق کیں جن میں زیر نظر کہانی ''مرگ'' بہت مشہور ہے۔ اس کا موازنہ موضوع اور لب و لہجے کے اعتبار سے منشی پریم چند کے لازوال افسانے ''کفن'' سے کیا جا سکتا ہے۔ ولادی ریموں نوبل انعام پانے کے بعد صرف دو برس زندہ رہے اور 1926ء میں خالق حقیقی سے جا ملے مگر اپنی یادگار تحریروں کی بنا پر امر ہو گئے۔

☆......☆......☆

''پاپا......او پاپا...... چلو اب اٹھ بیٹھو۔ سنا نہیں تم نے۔ بہت ہو گئی، اب چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

''آہ! ہائے! خدایا! مقدس مریم!'' ضعیف آدمی درد سے کراہنے لگا۔ اس کا ستا ہوا نڈھال چہرہ بھیڑ کی کھال کے لبادے سے نمودار ہوا۔ اس کا رنگ اس زمین کی طرح مٹیالا تھا جس پر اس نے سالہا سال کاشت کاری کی تھی۔ سر کے بالوں کی رنگت برف سے ڈھکی منڈیروں کی طرح سفید تھی جن میں خزاں کے موسم میں ہل چلایا گیا تھا۔ اس نے ایک لمبا اور گہرا سانس لیا۔ اس کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں۔ ہونٹ سردی سے نیلے پڑے ہوئے تھے اور ان پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ ادھ کھلے منہ سے زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔

''اے۔ اٹھ بھی چکو۔'' اس کی بیٹی زور سے چلائی۔

''نانا!'' بستر کے قریب کھڑی ننھی بچی نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ اس کی قمیض پر سوتی ایپرن کسا ہوا تھا۔ وہ ریں ریں کرتے ہوئے

ایڑیوں کو اٹھا کر اپنے نانا کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''نانا!'' وہ بلک کر بولی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ چہرے پر اداسی کھنڈی تھی۔

''نانا!'' اس نے ایک بار پھر اسے پکارا اور اس کا تکیہ بھینچنے لگی۔

''چپ ہو جاؤ!'' اس کی ماں کی چنگھاڑ سنائی دی۔ اس نے بچی کو گدی سی پکڑ کر چولہے کی طرف دھکا دیا۔

''دفع ہو۔ خبیث کتیا!'' وہ گھریلو پالتو کتیا پر چلائی جو بوڑھی اور نیم اندھی تھی اور اس کے قریب کھڑی بستر سونگھتے ہوئے عورت سے ٹکرا گئی تھی۔

''دفع بھی ہو جاؤ مردار۔ جاتی ہو یا......'' اس نے لکڑی کی کھڑاویں اٹھا کر اسے اتنے زور سے ماریں کہ وہ لڑھکتی چلی گئی اور چیاؤں چیاؤں کرتی ہوئی چولہے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ وہ بری طرح کراہ رہی تھی۔ وہ مٹھی سے ناک اور آنکھیں ملتے ہوئی دوبارہ پھنکاری:

''پاپا! میرا موڈ خراب ہونے سے پہلے اٹھ جاؤ۔''

بیمار بوڑھا خاموش پڑا تھا۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا اور سانس بتدریج بھاری ہو رہا تھا۔ اس میں زندگی کے آثار زیادہ نہیں تھے۔

''چلو اٹھو کیا ارادہ ہے؟ کیا یہاں مرنے کا پروگرام ہے؟ نہیں میں سب جانتی ہوں۔ جو لینا کے پاس جا کر مرو بوڑھے کتے! جسے ساری جائیداد دے دی ہے۔ وہی تمہاری تیمارداری بھی کرے گی...... چل اب اٹھ...... میں اب بھی تمہیں نرمی سے کہہ رہی ہوں۔''

''او میرے پروردگار...... مقدس مسیح! ہائے مقدس مریم......''

اس کا پسینے اور اضطراب میں بھیگا ہوا چہرہ تشنج کے ایک اچانک جھٹکے سے کھنچ گیا۔ اس کی بیٹی نے وحشیانہ طریقے سے لحاف کھینچ لیا اور بوڑھے کو کمر کی دونوں اطراف سے پکڑ کر بستر سے باہر گھسیٹا۔ وہ آدھا بستر کے اندر اور آدھا باہر ہو گیا۔ نچلا دھڑ نیچے لٹک رہا تھا جبکہ شانے اور سر بستر پر پڑے ہوئے تھے۔ وہ چوبی تختے کی طرح بے حس و حرکت تھا بے جان سا، اکڑا ہوا!

''پادری...... ہائے خدایا!'' بھاری سانسوں کے درمیان وہ بڑبڑایا۔

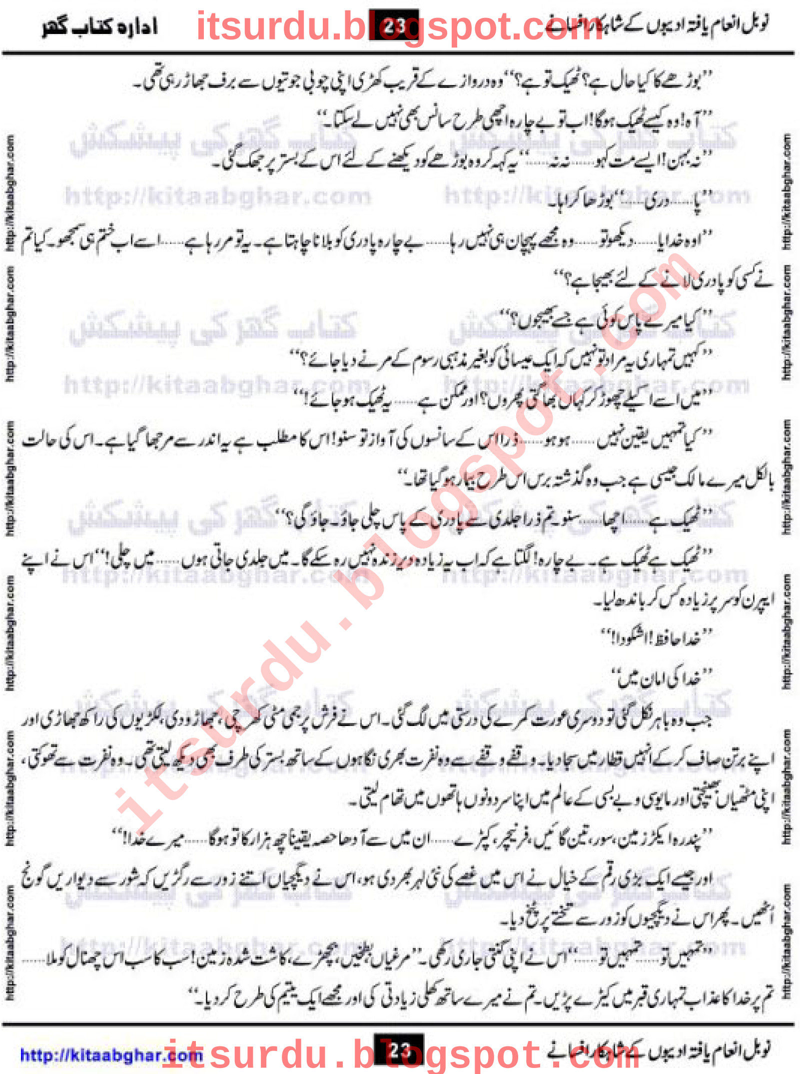
''میں ابھی تمہارے پادری کو بلاتی ہوں بوڑھے کم بخت! تم سور خانے میں مرو گے شیطان...... کسی کتے کی طرح۔'' اس نے بوڑھے کی بغل میں ہاتھ دے کر اسے اوپر اٹھایا، لیکن فوراً ہی نیچے چھوڑ دیا اور رضائی سے اچھی طرح ڈھک دیا۔ کیونکہ کھڑکی میں اس نے کسی کی جھلک دیکھ لی تھی...... کوئی گھر کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ بوڑھے کے پیر دوبارہ بستر میں دھکیل سکے۔ اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا۔ غصے سے پاگل ہوتے ہوئے اس نے بستر پر زور سے لات رسید کی اور بستر کو اطراف سے دبا دیا۔

وجیاک نامی کسان کی بیوی اندر آئی ''یسوع مسیح رحم کرے!''

''تا ابد!'' سامنے والی بڑبڑائی اور اپنی آنکھوں کے گوشوں سے وجیاک کی بیوی کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھا۔

''کیا حال ہیں؟ کیا ہو رہا ہے؟''

''شکر ہے خدا کا...... گزر رہی ہے......''



”بوڑھے کا کیا حال ہے؟ ٹھیک تو ہے؟“ وہ دروازے کے قریب کھڑی اپنی چوبی جوتیوں سے برف جھاڑ رہی تھی۔

”آہ! وہ کیسے ٹھیک ہوگا! اب تو بے چارہ اچھی طرح سانس بھی نہیں لے سکتا۔“

”نہ بہن! ایسے مت کہو...... نہ نہ......“ یہ کہہ کر وہ بوڑھے کو دیکھنے کے لئے اس کے بستر پر جھک گئی۔

”پا...... دری......“ بوڑھا کراہا۔

”اوہ خدایا...... دیکھو تو...... وہ مجھے پہچان ہی نہیں رہا...... بے چارہ پادری کو بلانا چاہتا ہے۔ یہ تو مر رہا ہے...... اسے اب ختم ہی سمجھو۔ کیا تم نے کسی کو پادری لانے کے لئے بھیجا ہے؟“

”کیا میرے پاس کوئی ہے جسے بھیجوں؟“

”کہیں تمہاری یہ مراد تو نہیں کہ ایک عیسائی کو بغیر مذہبی رسوم کے مرنے دیا جائے؟“

”میں اسے اکیلے چھوڑ کر کہاں بھاگتی پھروں؟ اور ممکن ہے...... یہ ٹھیک ہو جائے!“

”کیا تمہیں یقین نہیں...... ہوہو...... ذرا اس کے سانسوں کی آواز تو سنو! اس کا مطلب ہے یہ اندر سے مرجھا گیا ہے۔ اس کی حالت بالکل میرے مالک جیسی ہے جب وہ گذشتہ برس اس طرح بیمار ہو گیا تھا۔“

”ٹھیک ہے...... اچھا...... سنو۔ تم ذرا جلدی سے پادری کے پاس چلی جاؤ۔ جاؤ گی؟“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ بے چارہ! لگتا ہے کہ اب یہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکے گا۔ میں جلدی جاتی ہوں...... میں چلی!“ اس نے اپنے ایپرن کو سر پر زیادہ کس کر باندھ لیا۔

”خدا حافظ! اشکوا!“

”خدا کی امان میں“

جب وہ باہر نکل گئی تو دوسری عورت کمرے کی درستی میں لگ گئی۔ اس نے فرش پر جمی مٹی کھرچی، جھاڑو دی، لکڑیوں کی راکھ جھاڑی اور اپنے برتن صاف کر کے انہیں قطار میں سجا دیا۔ وقفے وقفے سے وہ نفرت بھری نگاہوں کے ساتھ بستر کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ وہ نفرت سے تھوکتی، اپنی مٹھیاں بھینچتی اور مایوسی و بے بسی کے عالم میں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتی۔

”پندرہ ایکڑ زمین، سور، تین گائیں، فرنیچر، کپڑے...... ان میں سے آدھا حصہ یقیناً چھ ہزار کا تو ہوگا...... میرے خدا!“

اور جیسے ایک بڑی رقم کے خیال نے اس میں غصے کی نئی لہر بھر دی ہو، اس نے دیگچیاں اتنے زور سے رگڑیں کہ شور سے دیواریں گونج اٹھیں۔ پھر اس نے دیگچیوں کو زور سے تختے پر پٹخ دیا۔

”تمہیں تو...... تمہیں تو......“ اس نے اپنی گنتی جاری رکھی۔ ”مرغیاں، بطخیں، بچھڑے، کاشت شدہ زمین! سب کا سب اس چھنال کو ملا...... تم پر خدا کا عذاب، تمہاری قبر میں کیڑے پڑیں۔ تم نے میرے ساتھ کھلی زیادتی کی اور مجھے ایک یتیم کی طرح کر دیا۔“

اس کا غصہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔ وہ طیش کے عالم میں لپک کر بستر کی طرف بڑھی اور پوری قوت سے چیخی۔

"اُٹھ جاؤ کم بخت"

جب بوڑھے نے کوئی حرکت نہ کی تو اس نے اپنی مٹھیاں لہراتے ہوئے اسے دھمکایا اور چہرے کے اوپر منہ کر کے چیخی:

"تم اس لئے یہاں آئے ہو کہ آرام سے مرو اور مجھے تمہارا کفن دفن کرنا پڑے۔ یہی سوچا تھا ناں تم نے؟ لیکن میں اس طرح نہیں سوچتی تم مجھے یہ سب کچھ کرتے دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہو گے۔ اگر جولینا تمہیں اتنی ہی عزیز ہے تو تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ جلدی سے اٹھو اور اس کے پاس چلے جاؤ۔ اس ضعیفی میں تمہاری دیکھ بھال کو میں ہی رہ گئی تھی! وہ تمہاری پیاری ہے اور اگر تم سمجھتے ہو کہ......"

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی کیونکہ اسے گھنٹی کی آواز سنائی دی تھی۔ چند ثانیے بعد مذہبی رسوم کے لئے درکار ساز و سامان کے ساتھ پادری اندر آ گیا۔

انگوا اپنے قدموں پر جھک گئی۔ غصے کے سبب آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں کو اس نے پونچھا، پھر شکستہ تسلے میں پاکیزہ پانی انڈیلا، موصلی کا برش قریب رکھا اور باہر گلی میں نکل گئی جہاں پادری کے ساتھ آنے والے کچھ لوگ انتظار میں تھے۔

"یسوع مسیح رحم فرمائیں!"

"تا ابد!"

"کیا ہوا ہے؟"

"اوہ، کچھ نہیں! بس یہی کہ وہ مرنے کے لئے یہاں چلا آیا ہے...... ہمارے پاس...... جن کے ساتھ اس نے زیادتیاں ہی کی ہیں اور اب وہ مر کے نہیں دے گا...... ہائے...... میں دکھیاری!"

"یہ تو سچ ہے۔ وہ سسک سسک کر مرے گا اور تم کڑھ کڑھ کر جیو گی۔" ان سب نے یک زبان ہو کر کہا اور اپنے سر ہلائے۔

"وہ بھی اپنا ہی باپ!" وہ پھر شروع ہو گئی۔ "کیا ہم نے...... انٹیک اور میں نے اس کا خیال نہیں رکھا؟ اس کے لئے کام نہیں کیا؟ اس کے لئے پسینہ نہیں بہایا؟ اتنا ہی جتنا کہ دوسروں نے؟ ایک انڈہ تک میں نے نہ بچایا نہ کبھی مکھن کا ایک آدھ پونڈ! بلکہ سب اس کے حلق میں ٹھونسا۔ اپنی بچی کے منہ سے دودھ کا ایک ایک قطرہ چھین کے میں نے اسے دیا کیونکہ یہ بوڑھا ہے اور پھر میرا باپ...... اور اسے دیکھو! گیا اور سب کچھ تو سک کو دے آیا۔ پندرہ ایکڑ زمین...... مکان...... گائیں...... سارے سور...... بچھڑے...... بیل گاڑیاں...... سارے کا سارا فرنیچر...... کیا یہ کچھ بھی نہیں؟ مجھ پر رحم کرو...... کیا اس دنیا میں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں؟...... ہائے...... اُف!"

وہ دیوار کے ساتھ لگ گئی اور اونچی آواز میں سسکیاں لینے لگی۔

"نہ رو، بہن نہ رو! خدا رحیم و کریم ہے۔ ایک دن وہ تمہاری فریاد ضرور سنے گا۔"

"بیوقوف! اس طرح کی باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟" بولنے والی کے شوہر نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جو غلط ہے، وہ غلط ہے۔ بوڑھا

چلا جائے گا، لیکن غریبی موجود رہے گی۔"

"جب بیل پیر اٹھانے کو تیار نہ ہو تو اس سے ہل جتوانا بہت مشکل ہوتا ہے۔" ایک اور آدمی نے دانشمندانہ انداز میں کہا۔

"آہ...... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آدمی ہر چیز کا عادی ہو جاتا ہے حتیٰ کہ جہنم کا بھی۔" ایک تیسرا شخص بڑبڑایا اور اپنے دانتوں کے درمیان خلاء میں سے تھوک کی پچکاری پھینکی۔

اس کے بعد اس مختصر سے ہجوم پر سکوت چھا گیا۔ تیز ہوا سے دروازہ ہلنے لگا۔ درزوں میں سے برف اُڑ کر اندر فرش پر آ گئی۔ کسان کسی گہری سوچ میں غرق کھڑے تھے اور پیروں کو گرم رکھنے کی خاطر بار بار زمین پر مار رہے تھے۔ عورتیں جن کے ہاتھ ان کی سوتی اپرنوں میں دبکے ہوئے تھے، ایک دوسرے کے ساتھ جڑی، بے چینی سے رہائشی کمرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

آخر کار گھنٹی بجی اور انہیں کمرے میں آنے کی اجازت ملی۔ وہ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے ایک ایک کر کے کمرے میں داخل ہونے لگے۔ جاں بہ لب بوڑھا پشت کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کا سر تکیے میں دھنسا ہوا تھا۔ اس کا زردسینہ سفید بالوں سے ڈھکا ہوا تھا اور کھلی قمیض میں سے دکھائی دے رہا تھا۔ پادری اس کے اوپر جھک گیا اور عشائے ربانی کی ٹکیا اس کی باہر لٹکتی ہوئی زبان پر رکھ دی۔ کمرے میں موجود بھی افراد گھٹنوں کے بل جھک گئے۔ ان کی آنکھیں چھت کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور وہ اپنی چھاتیاں پیٹتے ہوئے، آہیں بھرتے ہوئے، گریہ زاری کر رہے تھے۔ عورتیں زمین پر جھک گئیں اور بین کرنے لگیں "یسوع مسیح کی بھیڑ، جس نے دنیا کو گناہوں سے نجات دلانے کی خاطر اپنی جان دے دی۔"

اندھی کتیا گھنٹی کی مسلسل ٹن ٹن سے پریشان ہو کر کمرے کے ایک کونے میں جا کر غرانے لگی۔ پادری نے آخری رسم ادا کی اور قریب المرگ بوڑھے کی بیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: "تمہارا آدمی کہاں ہے اشکوا؟"

"وہ کہاں ہو گا مقدس باپ! اپنے روزانہ کے کام پر ہی گیا ہے۔"

ایک پل کے لئے پادری متامل کھڑا رہا۔ اس نے اپنے ارد گرد لوگوں کے اجتماع کو دیکھا، اپنے قیمتی فر کے فرغل کو شانوں پر کھینچا، لیکن وہ موقع کی مناسبت سے بولنے کے لیے کوئی موزوں الفاظ نہ سوچ سکا اور فقط سر ہلا کر رہ گیا۔ کمرے سے باہر نکل کر اس نے اپنا سرخ و سپید ہاتھ اجتماع کی طرف بڑھا دیا۔ سب گھٹنوں کے بل جھک کر اس کے ہاتھ کو باری باری عقیدت سے بوسہ دینے لگے۔ اس کے بعد پادری باہر چلا گیا۔

پادری کے جاتے ہی سارا اجتماع منتشر ہو گیا۔ دسمبر کا مختصر سا دن اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ ہوا کی تیزی میں اب کمی آ گئی تھی، لیکن برف موٹے موٹے بھاری گالوں کی صورت میں گر رہی تھی۔ شام کا دھندلکا کمرے میں اتر آیا تھا۔ اشکوا آگ کے سامنے بیٹھی تھی اور خشک لکڑیوں کو ایک ایک کر کے توڑتی ہوئی بے دھیانی سے آتش دان میں پھینکتی جا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی کسی خاص پہلو پر غور کر رہی ہے کیونکہ گاہے گاہے اس کی نگاہیں کبھی بستر اور کبھی کھڑکی کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ بیمار آدمی خاصی دیر سے بے حس و حرکت تھا۔ وہ بے چین ہو گئی، اپنی جگہ سے اٹھی، تھوڑی دیر تک ساکت کھڑی رہی، ارد گرد کا جائزہ لیا، کچھ سن گن لینے کی کوشش کی اور واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

رات تیزی سے اتر رہی تھی۔ کمرے میں گہرا اندھیرا ہو گیا تھا۔ ننھی لڑکی آتش دان کے قریب کٹی بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ آتش دان میں آگ



مدہم پڑتی جارہی تھی۔ دہکتے کوئلوں سے خارج ہونے والی سرخ روشنی عورت کے گھٹنوں اور فرش کے ایک حصے پر پڑ رہی تھی۔ اندھی کتیا چیاؤں چیاؤں کرکے دروازہ کھرچنے لگی۔ سیڑھی پر بیٹھی مرغیاں بھی کبھی آہستہ اور کبھی اونچی آواز میں کڑکڑ کرنے لگتیں۔ اب کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ گیلے فرش سے ٹھنڈ کا اخراج ہو رہا تھا۔ اچانک اشکوو اٹھی اور کھڑکی کے قریب جاکر باہر گلی میں جھانکنے لگی۔ گلی ویران تھی۔ شدید برف باری ہو رہی تھی جس کے سبب چند قدم کے فاصلے پر موجود چیزیں بھی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی تھیں۔ بے خیالی میں وہ مڑی اور ایک بار پھر بستر کے قریب آکر رک گئی، لیکن فقط ایک ثانیے کے لئے، پھر اچانک ہی اس نے بڑی بے رحمی سے رضائی کھینچی اور اسے دوسرے بستر پر اچھال دیا۔ اس نے قریب المرگ بوڑھے کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے اوپر اٹھا لیا۔

"ماگدا!" "دروازہ کھولو!"

ماگدا خوفزدہ ہو کر اپنی جگہ سے اچھلی اور دوڑ کر دروازہ کھول دیا۔

"یہاں آؤ......اسے پیروں سے پکڑو!"

ماگدا نے آگے بڑھ کر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے نانا کے پیر تھام لئے اور سوالیہ نگاہوں سے اپنی ماں کی جانب دیکھا۔

"چلو......اسے اٹھا کر لے جانے میں میری مدد کرو......اس طرح مت گھورو......چلو......اٹھاؤ اسے......بس تمہیں یہی کرنا ہے۔" اس نے سختی کے ساتھ حکم دیا۔

بوڑھا آدمی وزنی تھا، لیکن مکمل طور پر لاچار! صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ ہوش سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا، وہ اس احساس سے بے خبر دکھائی دیتا تھا۔ عورت نے اسے سختی سے تھام رکھا تھا۔ اس نے بوڑھے کو اٹھایا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے چلی کیونکہ ننھی لڑکی نے دہلیز سے ٹھوکر کھائی تھی۔ نانا کے پیر اس کے ننھے ننھے ہاتھوں سے چھوٹ گئے تھے اور برف پر دو لکیریں کھنچتے جارہے تھے۔

اس وقت ہڈیوں تک میں سرایت کو جانے والی ٹھنڈ کے باعث جاں بہ لب بوڑھے کو ہوش آ گیا۔ صحن میں آکر اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بڑبڑانا شروع کر دیا "جولیشا......او خدا......جو......"

"تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم چیخو......جتنا چیخ سکتے ہو چیخو، کوئی تمہاری آواز نہیں سنے گا۔ چاہے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخو۔" وہ اسے صحن کے پار گھسیٹ کر لے گئی اور اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے سور خانے کا دروازہ کھولا، بوڑھے کو اندر کھینچا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا دیا۔ سورنی گھر گھراتی ہوئی آگے بڑھی، اس کے پیچھے اس کے پلے لپکے۔

"مالوشیا! مالو، مالو، مالو!"

سور، باڑے میں سے باہر نکل آئے اور عورت نے دروازہ ایک دھماکے سے بند کر دیا، مگر پھر فوراً پلٹی اور بوڑھے کی قمیض پھاڑ کر اس کے سینے پر آویزاں تھیلی کھینچ کر علیحدہ کی اور اسے اپنے لبادے میں چھپا لیا۔

"اب یہاں مرو کوڑھی!" اس نے بوڑھے کی برہنہ پنڈلی پر زور کی لات رسید کی جو دروازے میں اٹکی ہوئی تھی۔ پھر دروازہ بند کیا اور

واپس ہولی۔

سور صحن میں اودھم مچا رہے تھے۔ اس نے مڑ کر نہ دیکھا۔

"مالوشا، مالو، مالو، مالو!"

سور بھاگتے ہوئے اس کے پاس گئے۔ وہ آلوؤں کا تسلا بھر کر لائی اور سوروں کے آگے خالی کر دیا۔ سورنی نے وحشیانہ انداز سے آلوؤں پر منہ مارنا شروع کر دیا۔ سورنی کے بچے بھی اپنی گلابی تھوتھنیاں گھسیڑ رہے تھے۔ ان کی کھینچا تانی اس وقت تک جاری رہی جب تک سب کچھ ختم نہ ہو گیا۔ اب ان کے چٹخارے لینے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اشکووا نے آتش دان کے اوپر بنی کارنس پر ایک چھوٹا سا لیمپ جلایا اور تھیلی کھول کر دیکھنے لگی۔ وہ کھڑکی کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ تھیلی کھولتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھر آئی۔ چاندی کے دو روبل اور کچھ بنک نوٹ تھیلی میں سے برآمد ہوئے تھے۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ ویسا نہیں کہتا تھا۔ وہ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ اس نے اپنی تجہیز و تکفین کے لئے پیسے رکھے ہوئے ہیں۔" اس نے نوٹ اور سکے کپڑے میں لپیٹے اور صندوق میں رکھ دیئے۔

"دھوکے باز! خدا کرے تم ہمیشہ کے لئے اندھے ہو جاؤ۔" عورت نے بددعا دی۔ اس نے برتنوں کو سیدھا کیا اور دھیمی ہوتی ہوئی آگ کو تیز کرنے کی کوشش کی۔

"لعنت ہو اس منحوس لڑکے پر! اس کی وجہ سے گھر میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں۔" وہ باہر آئی اور حلق پھاڑ کر چیخنے لگی۔

"اگنات!"

لیکن لڑکے کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہ تھا۔ تقریباً نصف گھنٹہ گزرنے کے بعد چوری چوری اٹھتے قدموں تلے برف چرمرائی۔ ایک پرچھائیں کھڑکی کے قریب دکھائی دی۔ اشکووا نے آدھ جلی لکڑی اٹھائی اور نیم وا دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ تقریباً نو برس کا ایک لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔

"حرام خور، کاہل! آوارہ! سارے گاؤں میں کتے کی طرح گھومتے پھرتے ہو اور گھر میں پانی کی ایک بوند نہیں۔" لڑکے کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر دوسرے ہاتھ میں تھامی ہوئی لکڑی سے وہ اسے بری طرح پیٹنے لگی۔

"اوئی ماں! اب نہیں جاؤں گا......ماں، مجھے چھوڑ دے......ماں......"

ماں نے اچھی طرح اس کی دھنائی کی اور اپنا سارا غصہ اس پر نکال دیا۔

"ماں......اوئی......ہائے......کوئی مجھے بچائے......یہ مجھے مار دے گی!"

"کتے، آوارہ، سارا دن پھرتے رہتے ہو اور گھر میں پانی کی ایک بوند بھی نہیں اور نہ جلانے کی لکڑی......کیا میرا یہی کام رہ گیا ہے کہ تم کو پیٹ بھرنے کو دیتی رہوں اور اس کے بدلے میں تم مجھے پریشان کرتے رہو؟" اس نے زور سے لکڑی کی ایک اور ضرب لگائی۔

آخر کار لڑکے نے خود کو چھڑایا، کھڑکی میں سے باہر کودا اور آنسوؤں بھری آواز میں ماں پر چلایا۔

''کتی، کمینی! خدا کرے تیرے ہاتھ کہنیوں تک گل سڑ جائیں۔ تم سورنی! خدا کرے تم پر بجلی گرے! جب تک میں تمہارے لئے پانی لاؤں، تم انتظار کرتے کرتے مر جاؤ اور مٹی کا ڈھیلا بن جاؤ...... کتی ماں!''

وہ روتا چیختا گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔

کمرہ اچانک ہی عجیب طرح سے خالی خالی لگنے لگا۔ آتش دان کے اوپر بنی کارنس پر رکھے لیمپ کی لو کپکپا رہی تھی۔ ننھی لڑکی سسکیاں لے رہی تھی۔

''تم کیوں ٹسوے بہا رہی ہو؟''

''ماں...... وہ...... وہ...... نانا......''

وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔ لگتا تھا اسے بخار ہے۔ اس نے اپنی ننھی ننھی مٹھیوں سے اپنی آنکھیں ملیں اور نیند میں ڈوب گئی۔ نیند میں بھی وہ گاہے گاہے ہچکیاں لے رہی تھی۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد شوہر گھر لوٹ آیا۔ وہ ایک لحیم شحیم شخص تھا۔ اس نے بھیڑ کی کھال کا لبادہ پہن رکھا تھا اور مفلر اپنی ٹوپی کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ سردی سے اس کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا اور مونچھیں برف کی تہہ جمنے سے کسی برش کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے اپنے بوٹوں سے برف جھاڑی، سر سے ٹوپی اور مفلر اتارے اور لبادے پر سے برف گرائی۔ اس نے سردی سے سن اپنے ہاتھ بغلوں میں دبائے اور بنچ گھسیٹ کر آگ کے قریب لاتے ہوئے اس پر دھم سے بیٹھ گیا۔

اس نے بند گوبھی سے بھری دیگچی آگ پر سے اتاری اور اسے اپنے شوہر کے آگے رکھ دیا۔ اس نے ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا کاٹا اور چمچ کے ساتھ اپنے شوہر کو تھما دیا۔ کسان خاموشی سے کھانا کھانے میں جت گیا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے اپنے لبادے کے بٹن کھولے، ٹانگیں پساریں اور پوچھا ''کھانے کو کچھ اور ہے؟''

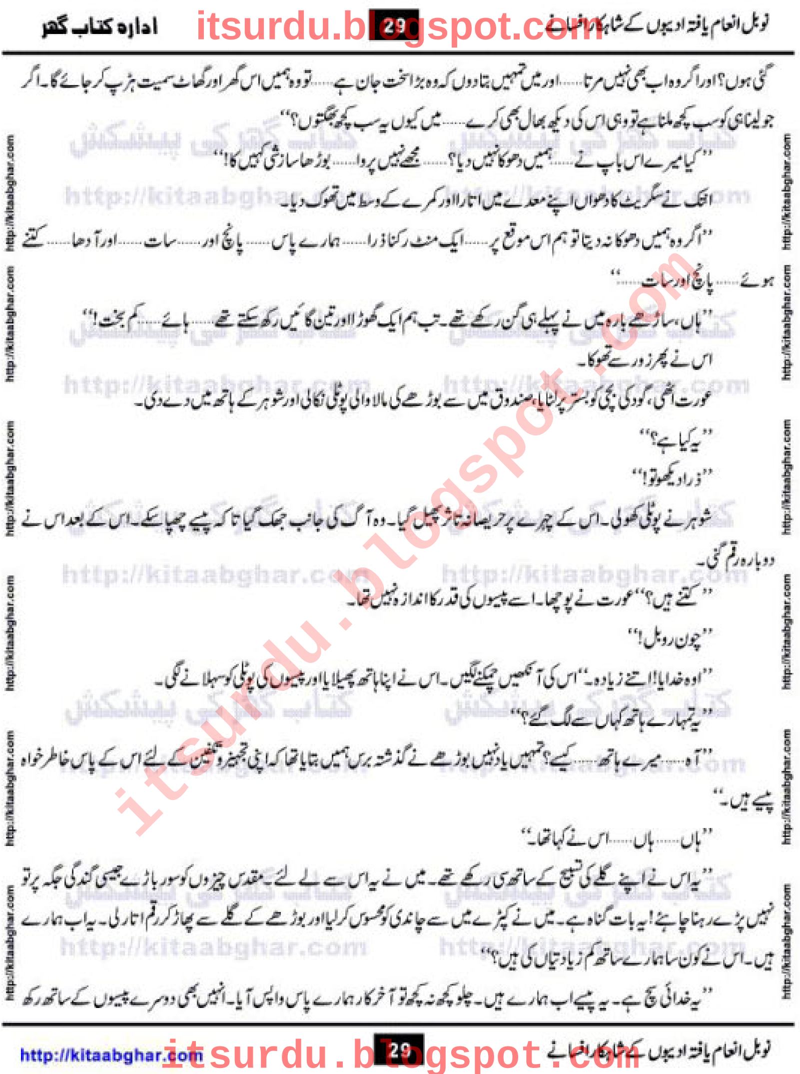
عورت نے شوہر کو دوپہر کا بچا ہوا دلیہ دیا۔ اس نے ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا لیا اور چمچ سے دلیہ کھانے لگا۔ فارغ ہو کر اس نے اپنی جیب میں سے ایک تھیلی نکالی اور تمباکو کے ساتھ ایک سگریٹ بنائی۔ اس نے سگریٹ سلگائی، آتش دان میں کچھ اور لکڑیاں پھینکیں اور آگ کے قریب ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے کمرے میں نگاہ دوڑائی اور پوچھا ''بوڑھا کہاں ہے؟''

''اسے کہاں ہونا چاہئے؟ سور خانے میں!''

کسان نے سوالیہ نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھا۔

''میں نے سوچا بستر میں لیٹے لیٹے وہ سستی کیوں پھیلائے اور بستر کی چادریں گندی کرے؟ اگر اس نے مرنا ہی ہے تو وہاں جلدی مر سکے گا...... کیا اس نے مجھے پھوٹی کوڑی بھی دی ہے؟ وہ میرے پاس آیا کس لئے ہے؟ کیا میں اس کے کفن دفن اور کھانے پینے پر خرچ کرنے کے لئے رہ



گئی ہوں؟ اور اگر وہ اب بھی نہیں مرتا...... اور میں تمہیں بتادوں کہ وہ بڑا سخت جان ہے...... تو وہ ہمیں اس گھر اور گھاٹ سمیت ہڑپ کر جائے گا۔ اگر جولیناہی کو سب کچھ ملنا ہے تو وہی اس کی دیکھ بھال بھی کرے...... میں کیوں یہ سب کچھ بھگتوں؟"

"کیا میرے اس باپ نے...... ہمیں دھوکا نہیں دیا؟...... مجھے نہیں پروا...... بوڑھا سازشی کہیں کا!"

اتک نے سگریٹ کا دھواں اپنے معدے میں اتارا اور کمرے کے وسط میں تھوک دیا۔

"اگر وہ ہمیں دھوکا نہ دیتا تو ہم اس موقع پر...... ایک منٹ رکنا ذرا...... ہمارے پاس...... پانچ اور...... سات...... اور آدھا...... کتنے ہوئے...... پانچ اور سات......"

"ہاں، ساڑھے بارہ میں نے پہلے ہی گن رکھے تھے۔ تب ہم ایک گھوڑا اور تین گائیں رکھ سکتے تھے...... ہائے...... کم بخت!"

اس نے پھر زور سے تھوکا۔

عورت اٹھی، گودی بچی کو بستر پر لٹایا، صندوق میں سے بوڑھے کی مالا والی پوٹلی نکالی اور شوہر کے ہاتھ میں دے دی۔

"یہ کیا ہے؟"

"ذرا دیکھو تو!"

شوہر نے پوٹلی کھولی۔ اس کے چہرے پر حریصانہ تاثر پھیل گیا۔ وہ آگ کی جانب جھک گیا تاکہ پیسے چھپا سکے۔ اس کے بعد اس نے دوبارہ رقم گنی۔

"کتنے ہیں؟" عورت نے پوچھا۔ اسے پیسوں کی قدر کا اندازہ نہیں تھا۔

"چون روبل!"

"اوہ خدایا! اتنے زیادہ۔" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور پیسوں کی پوٹلی کو سہلانے لگی۔

"یہ تمہارے ہاتھ کہاں سے لگ گئے؟"

"آہ...... میرے ہاتھ...... کیسے؟ تمہیں یاد نہیں بوڑھے نے گذشتہ برس ہمیں بتایا تھا کہ اپنی تجہیز و تکفین کے لئے اس کے پاس خاطر خواہ پیسے ہیں۔"

"ہاں...... ہاں...... اس نے کہا تھا۔"

"یہ اس نے اپنے گلے کی تسبیح کے ساتھ ہی رکھے تھے۔ میں نے یہ اس سے لے لئے۔ مقدس چیزوں کو سور باڑے جیسی گندی جگہ پر تو نہیں پڑے رہنا چاہئے! یہ بات گناہ ہے۔ میں نے کپڑے میں سے چاندی کو محسوس کر لیا اور بوڑھے کے گلے سے پھاڑ کر رقم اتار لی۔ یہ اب ہمارے ہیں۔ اس نے کون سا ہمارے ساتھ کم زیادتیاں کی ہیں؟"

"یہ خدائی سچ ہے۔ یہ پیسے اب ہمارے ہیں۔ چلو کچھ نہ کچھ تو آخر کار ہمارے پاس واپس آیا۔ انہیں بھی دوسرے پیسوں کے ساتھ رکھ

دو۔ان سے ہمارا کام چل سکتا ہے۔ابھی کل ہی سولوج نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے ایک ہزار روبل ادھار لینا چاہتا ہے۔اس کے بدلے میں ضمانت کے طور پر وہ اپنے کاشت شدہ پانچ ایکڑ کھیت، جو جنگل کے قریب ہیں، مجھے دے دے گا۔"

"کیا تمہارے پاس اتنے پیسے ہیں؟"

"میرا خیال ہے ہیں تو سہی!"

"کیا بہار آنے پر تم خود ان کھیتوں میں بیج بوؤ گے؟"

"شاید......اگر میرے پاس اتنے پیسے نہ بنے تو میں سورنی بیچ دوں گا۔اگر اس کے بچے بھی بیچنا پڑے تو بیچ دوں گا۔مجھے ہر صورت میں اسے پیسے ادھار دینے ہیں۔اس میں قرض چکانے کی سکت نہیں۔"

اس نے بات آگے بڑھائی۔"مجھے پتا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ہم دونوں وکیل کے پاس جائیں گے اور اسٹام پر لکھوائیں گے کہ اگر اس نے پانچ برس کے اندر اندر قرض نہ چکایا تو زمین میری ہو جائے گی۔"

"کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟"

"بالکل کر سکتا ہوں میں ایسا۔تم نہیں جانتی ہو کہ دومن نے وجیاک کے کھیت کس طرح ہتھیا لئے تھے؟ چلو چھوڑو......یہ لو......یہ چاندی کے سکے تم رکھ لو۔جو دل چاہے منوا لینا۔اگنات کہاں ہے؟"

"پتا نہیں، کہیں بھاگ گیا ہے۔میں کیا کروں، گھر میں پانی کی ایک بوند بھی نہیں۔"

ایک لفظ کہے بغیر کسان اٹھا، مویشیوں کو دیکھا، باہر جا کر پانی اور ایندھن لے آیا۔

دیگچی میں رات کے کھانے کے لئے سالن ابل رہا تھا۔اگنات محتاط انداز سے کمرے میں داخل ہوا۔کسی نے اس سے کچھ نہ کہا۔سب کے سب خاموش تھے اور عجیب سی بے چینی میں ڈوبے ہوئے تھے۔بوڑھے آدمی کا کسی نے ذکر نہ کیا جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔

انٹک اپنے پانچ ایکڑوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔اسے یقین تھا کہ یہ پانچ ایکڑ اب اس کے ہو گئے ہیں۔ایک پل کے لئے اس کے دماغ میں بوڑھے کا خیال آیا، لیکن فوراً ہی اس کا دھیان اس سورنی کی طرف چلا گیا جس کے بارے میں اس نے سوچ رکھا تھا کہ جیسے ہی وہ اپنے بچوں کو دودھ پلانا بند کرے گی وہ اسے ٹھکانے لگا دے گا۔اس کی نگاہیں جب بھی بوڑھے کے خالی بستر پر پڑتیں، وہ تھوک دیتا جیسے کسی ناگوار خیال سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہو۔وہ پریشان تھا۔رات کا کھانا بھی اس نے ادھورا ہی چھوڑ دیا اور کھانا کھاتے ہی بستر پر سونے کیلئے جا لیٹا۔دیر تک وہ کروٹیں بدلتا رہا۔آلو، بند گوبھی اور دلیہ ڈبل روٹی کھانے سے اسے بدہضمی کا احساس ہو رہا تھا، لیکن جلد ہی وہ پرسکون ہو گیا اور اسے نیند نے آ لیا۔

جب ہر سو خاموشی چھا گئی تو اشکوا نے آہستگی سے بغلی کمرے کا دروازہ کھولا جہاں پٹ سن کے گٹھے رکھے ہوئے تھے۔ان گٹھوں کے نیچے سے اس نے ایک پوٹلی نکالی اور اس میں لپیٹے ہوئے نوٹوں کو احتیاط سے باہر نکالا۔اس نے اپنے نوٹ بھی ان پیسوں میں رکھ دیئے۔اس نے پیسوں کو کئی بار سہلایا، پوٹلی کو کئی بار کھولا اور بند کیا اور اس وقت تک یہ عمل دہراتی رہی جب تک اس کا دل نہیں بھر گیا۔اس کے بعد اس نے بتی بجھائی اور اپنے

شوہر کے پہلو میں لیٹ گئی۔

اسی دوران سور خانے میں پھینکا ہوا بوڑھا آدمی مر گیا۔ سور خانے میں شاخوں اور گھاس پھونس سے بنے تختوں کی اوٹ اسے موسم کی شدت اور ہوا کی سختی سے بچا نہ سکی۔ بے چارگی سے کپکپاتی ہوئی، بوڑھے آدمی کی داد فریاد کسی نے نہ سنی۔ بند دروازے تک گھسٹ کر آتے اور دروازہ کھولنے کی کوشش میں اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی سعی کرتے اسے کسی نے نہ دیکھا۔ اس نے موت کو خود پر فتح پاتے محسوس کیا۔ یوں لگا موت ایڑیوں سے ہوتی ہوئی اس کی چھاتی تک آ پہنچی ہے۔ موت نے اسے سختی سے بھینچ لیا اور پکڑ کر بری طرح جھٹکے دیئے۔ اس کے جبڑے بھینچ گئے اور بھینچے چلے گئے حتیٰ کہ وہ انہیں کھولنے اور مدد کے لئے چیخنے کے قابل نہ رہا۔ اس کی شریانیں اکڑنے لگیں حتیٰ کہ آہنی تاروں کی طرح ہو گئیں۔ کمزوری کے باوجود اس نے خود کو آگے کی طرف گھسیٹا، آخر دہلیز پر آ کر وہ ہمت ہار گیا۔ اس کے ہونٹوں پر جھاگ جم گیا تھا۔ اس احساس کے باعث کہ اسے سردی میں مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں دہشت جم گئی تھی۔ ایک منجمد چیخ کی طرح درد کے تاثر نے اس کے چہرے کو بگاڑ دیا تھا۔ وہیں دروازے کی چوکھٹ پر وہ مرا پڑا تھا۔

اگلی صبح اجالا ہونے سے پہلے اتنک اور اس کی بیوی بیدار ہو گئے۔ اتنک کے دماغ میں سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ بوڑھے کا کیا بنا ہو گا! وہ بوڑھے کو دیکھنے گیا، لیکن سور خانے کا دروازہ نہ کھل سکا۔ اندر لاش نے دروازے کے پٹ کو کسی شہتیر کی طرح روک رکھا تھا۔ آخر کار بہت کوشش کے بعد وہ اتنا سا دروازہ کھول پایا کہ کھسک کر اندر جا سکے...... لیکن فوراً ہی وحشت زدہ ہو کر باہر نکل آیا۔ خوف سے اس کی حالت غیر ہو گئی۔ اس نے تیزی سے صحن عبور کیا اور گھر کے اندر چلا آیا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس کا جسم یوں کانپ رہا تھا جیسے زور کا بخار چڑھا ہو۔ وہ دروازے کے قریب کھڑا ہانپتا رہا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔

اس وقت اشکوا اپنی بچی ماگدا کو دعا سکھا رہی تھی۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے شوہر کو دیکھا۔

"تمہارا احساب کیا جائے۔" وہ بے خیالی میں بڑبڑائی۔

"تمہارا احساب......" بچی نے دعا ادھوری چھوڑ دی۔

"کیا جائے گا......"

"کیا جائے گا......" گھٹنوں پر جھکی بچی نے کسی بازگشت کی طرح دعا کے الفاظ دہرائے۔

"کیا وہ مر گیا؟" عورت نے شوہر سے پوچھا، پھر بچی سے کہا "زمین پر......"

"ہاں، وہ دروازے کی اوٹ میں پڑا تھا" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"جیسے کہ آسمان پر......"

"لیکن ہم اسے وہاں نہیں چھوڑ سکتے۔ لوگ کہیں گے ہم نے جان چھڑانے کیلئے اسے وہاں پھینک دیا۔ ہم اسے وہاں نہیں......"

"تم کیا چاہتے ہو؟ مجھے اس کے ساتھ کیا کرنا ہو گا؟"

"مجھے کیا پتا تمھیں کچھ کرنا پڑے گا...... ہم اسے یہاں لاسکتے ہیں۔" انگف نے مشورہ دیا۔

"دیکھو......اسے وہیں سڑنے دو۔اسے یہاں لے آئیں؟ نہیں......اگر......"

"بے وقوف اسے دفنانا تو پڑے گا۔"

"لیکن ہمیں برائی اور شر سے بچا...... تم یہ کیا آ ہمیں مکاری ہو چڑیل؟ چلو دعا پڑھو...... ہمیں...... شر...... سے بچا......"

"میں کفن دفن کے خرچے کے بارے میں کیوں سوچوں؟ قانونی طور پر تو یہ تو مک کا فرض ہے۔" وہ شوہر سے مخاطب ہوئی۔ پھر بچی سے کہا:

"آمین"

"آمین"

عورت نے بچی کے سینے پر کراس کا نشان بنایا، اپنی انگلیوں سے اس کی ناک صاف کی اور اپنے شوہر کے پاس گئی۔

"ہمیں اسے لا نا یہاں لانا ہوگا۔" شوہر نے سرگوشی کی۔

"گھر کے اندر...... یہاں؟"

"تو اور کہاں؟"

"گائے کے چھپر تلے! ہم چھپرے کو باہر نکال کر اسے بیچ پر لٹادیں گے۔ وہاں سیدھا پڑا رہے گا...... چاہے تو...... وہ ہے بھی تو ایسا ہی۔"

"ہمیں چاہیے کہ اسے یہاں لے آئیں۔" شوہر نے زور دے کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تو پھر اسے یہاں لے آؤ......"

"ٹھیک ہے...... لیکن......"

"احمق خر دماغ!" وہ غرائی۔

"ابھی اندھیرا ہے۔" اس نے عذر پیش کیا۔

"اگر تم دن چڑھنے کا انتظار کرو گے تو لوگ دیکھ لیں گے۔"

"آؤ، دونوں چلتے ہیں۔"

"نہیں تم اسے لے کر آؤ۔"

"تم آتی ہو یا نہیں بدذات عورت!" وہ اپنی بیوی پر برسا۔ "وہ تمہارا باپ ہے، میرا نہیں۔" وہ پیر پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

عورت بغیر کوئی لفظ منہ سے نکالے اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔

جب وہ سور خانے میں داخل ہوئے تو دہشت سے ان کے قدم زمین پر جم گئے۔ ایک خوفناک بُو سے ان کا دم گھٹنے لگا جیسے لاش میں سے بخارات اُٹھے ہوں۔ بوڑھا آدمی برف کی طرح وہاں منجمد پڑا تھا۔ اس کا آدھا دھڑ فرش پر جم گیا تھا۔ دونوں نے زور لگا کر اسے فرش سے علیحدہ کیا اور

دہلیز پر سے گھسیٹتے ہوئے صحن میں لے آئے۔

اسے دیکھتے ہی انگلوواتے خوف سے بری طرح کانپنا شروع کر دیا۔ صبح کے ملگجے اجالے میں برف کی سفید چادر سے ڈھکا وہ بہت ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ درد سے اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ زبان باہر لٹک رہی تھی اور اس میں بتیسی اس طرح پیوست تھی کہ خوف آتا تھا۔ اس جگہ پر نیلے نیلے داغ ابھر آئے تھے۔ وہ سر سے پیر تک گندگی میں لتھڑا ہوا تھا۔

''پکڑو اسے۔'' اننگ نے جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''یہ سردی سے کتنا خوفناک ہو گیا ہے!''

طلوع آفتاب سے پہلے کی یخ ہوا کے تھپیڑے ان کے چہروں پر پڑ رہے تھے۔ جھولتی شاخوں پر سے برف کڑکڑاتی ہوئی نیچے گر رہی تھی۔ سیاہ آسمان کے پس منظر میں یہاں وہاں اکا دکا ستارے ابھی تک ٹمٹما رہے تھے۔ گاؤں کی جانب سے ہوا کے دوش پر پانی کھینچنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور مرغ یوں بانگیں دے رہے تھے جیسے تبدیلی موسم کی نوید سنا رہے ہوں۔

بوڑھے کو پیروں سے پکڑ کر اٹھانے سے پہلے انگلوواتے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ہاتھوں پر اپنا ایپرن لپیٹ لیا۔ بوڑھا بہت بھاری تھا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اسے اٹھایا۔ جونہی انہوں نے بوڑھے کو بنچ پر لٹایا، انگلوواتے اپنے شوہر کی طرف ایک پھٹی ہوئی چادر پھینکی تا کہ وہ لاش ڈھانپ سکے اور گھر کی طرف بھاگ گئی۔

بچے آلو چھیلنے میں مصروف تھے۔ وہ دروازے پر کھڑی انتظار کرتی رہی۔

''ہو گیا ختم...... چلو اندر آ جاؤ...... خدایا! تم نے کتنی دیر لگا دی۔''

''اسے غسل کرانے کے لئے ہمیں کسی کو بلانا پڑے گا۔'' شوہر اندر آیا تو عورت نے اسے ناشتا دیتے ہوئے کہا:

''میں اس گونگے بہرے کو لے آؤں گا۔''

''آج کام پر مت جاؤ۔''

''جاؤں...... نہیں...... نہیں میں......''

اس کے بعد دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی اور بغیر رغبت کے انہوں نے اپنا ناشتا ختم کر لیا۔ روزانہ کی طرح انہوں نے مل کر شوربے کا ایک بڑا پیالہ ختم کیا۔

جب وہ صحن میں گئے تو تیز تیز قدم اٹھاتے آگے بڑھے۔ انہوں نے دوسری طرف دیکھنے کیلئے سر گھمانے کی کوشش نہ کی۔ وہ پریشان تھے، لیکن اس کا سبب جاننے سے قاصر تھے۔ انہیں کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ شاید یہ لاش کا ایک مبہم سا خوف تھا یا موت کی دہشت! جس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا اور وہ بالکل خاموش تھے۔

دن چڑھا تو اننگ گاؤں کے گونگے بہرے کو بلا لایا۔ گونگے بہرے نے لاش کو غسل دیا، کفن پہنایا اور باہر لٹا کر اس کے سرہانے ایک مقدس موم بتی جلا دی۔ اس کے بعد اننگ پادری کو بوڑھے کی موت کی خبر دینے اور گاؤں کے سرپنچ کو یہ بتانے چل دیا کہ متوفی کے کفن دفن کے

اہتمام کی اس کی حیثیت نہیں۔

"توک ہی اس کی تجہیز وتکفین کے اخراجات برداشت کرے گا۔اسی کو سارا پیسہ اور جائیداد ملی ہے۔"

جلد ہی بوڑھے کے مرنے کی خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی صورت میں لاش دیکھنے جمع ہو گئے۔وہ مناجات پڑھتے اور سر ہلاتے ہوئے بوڑھے کی موت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔

تیسرے روز، تدفین سے تھوڑی دیر قبل توک کی بیوی آ پہنچی۔گلی میں وہ اپنی بہن کے روبرو آ گئی جو پانی کی بالٹی اٹھائے گائے کے باڑے کی طرف جا رہی تھی۔

"یسوع مسیح رحم فرمائیں!" دروازہ کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ منمنائی۔

"دیکھا......دیکھا......اب آ گئی ہے یہ یہودا کی روح!" اشکووا نے بالٹی نیچے رکھ دی۔"اب آ گئی ہے ہماری جاسوسی کرنے! آخر اس بوڑھے سے تم نے پیچھا چھڑا ہی لیا ناں، ہے ناں؟ اس نے سب کچھ تو تمہارے حوالے کر دیا ہے......پھر بھی تمہیں اپنی منحوس شکل لے کر یہاں آنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ آوارہ کہیں کی! اب تم وہ چیتھڑے سمیٹنے آئی ہو جو وہ بوڑھا چھوڑ گیا ہے؟ بولو؟"

"میں نے شہر سے اسے صدری خرید کر دی تھی۔وہ اسے پہن سکتا تھا، لیکن بھیڑ کی کھال کا لبادہ مجھے واپس چاہئے۔وہ میں نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے خریدا تھا۔" تو میکووا نے آہستگی سے کہا۔

"واپس چاہئے؟ خارش زدہ کتیا، تمہیں وہ واپس چاہئے؟" اشکووا چیخی۔"ٹھہر ذرا، میں تمہیں واپس دیتی ہوں......ذرا دیکھو تو تمہیں کیا چیز ملتی ہے......" اس نے ارد گرد کسی ایسی چیز کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں جو اس کا مقصد پورا کر سکے۔

"لے جاؤ واپس! ہمت ہے تو لے جاؤ واپس! تم نے اس بڈھے کی چاپلوسی کی اور نہ جانے کیا پٹی پڑھائی کہ اس کا دماغ چل گیا اور اس نے ہر چیز تمہیں سونپ دی، میری حق تلفی کی اور پھر......"

"سب کو پتا ہے کہ زمین ہم نے اس سے خریدی تھی۔کئی گواہ ہیں اس بات کے......"

"خریدی تھی؟ ذرا اسے دیکھو بڑی آئی خریدنے والی، تمہارا مطلب ہے کہ خدا کی جیتی جاگتی آنکھوں کے نیچے تمہیں جھوٹ بولتے ہوئے کوئی ڈر نہیں لگتا؟ خریدی تھی؟ دھوکے باز! چور، کمینی! پہلے تم نے اس کے پیسے چرا لئے اور پھر......کیا تم اسے سوروں والے برتن میں کھانا نہیں دیتی تھیں؟ خدا گواہ ہے کہ اسے سوروں والی بالٹی میں سے آلو کھانا پڑے تھے۔تم اسے گائے کے باڑے میں سلاتی تھیں کیونکہ تم کہتی تھیں اس سے بدبو آتی ہے جس سے کھانا تمہارے حلق سے نیچے نہیں اترتا۔چندرہ ایکڑ زمین......اور اس طرح کی محتاج زندگی......اتنی جائیداد کے بدلے اور تم اس کی پٹائی بھی کرتی تھی۔تم سورنی، بندریا۔"

"اپنی گندی زبان کو لگام دو، ورنہ میں اسے اس طرح بند کروں گی کہ ساری زندگی یاد رکھو گی بازاری عورت!"

"تو پھر آؤ، سامنے آؤ بھکارن، بدذات!"

''میں بھکارن ہوں؟''

''ہاں،تم!تم گندی نالی میں سڑو گی۔اگر تو کمک تم سے شادی نہ کرتا تو تمہاری لاش کیڑے کھاتے۔''

''میں بھکارن ہوں تو تم گندی مردار!''

دونوں ایک دوسرے پر لپکیں۔انہوں نے ایک دوسرے کے بال پکڑ لئے اور تنگ گلی میں لڑنے لگیں۔وہ کرخت آواز میں ایک دوسرے پر چلا رہی تھیں۔

''تو آوارہ،بدچلن،بازاری عورت!یہ لو...... یہ ایک تمہارے لئے...... اور یہ ایک میرے میرے پندرہ ایکڑ کے لئے اور یہ ایک ان تمام زیادتیوں کے لئے جو تم نے میرے ساتھ کیں،گندی کتیا!''

''خدا کے لئے بند کرو یہ لڑائی!چھوڑو،چھوڑو ایک دوسرے کو۔یہ گناہ ہے اور باعث شرم بھی!''ہمسائے چلائے۔

''مجھے جانے دو بوڑھی!چھوڑو مجھے جانے دو!''

''میں مار مار کر تیرا بھرکس نکال دوں گی۔میں تمہارے ٹکڑے کردوں گی،غلاظت!''

دونوں نیچے گر پڑیں۔وہ ایک دوسرے کو اندھا دھند ٹھوکریں مار رہی تھیں۔وہ بالٹی پر گر پڑیں اور لڑھکتی ہوئی گندے پانی میں لتھڑ گئیں۔آخر کار وہ غصے سے گنگ ہو گئیں،ان کے سانس پھول گئے۔وہ ایک دوسرے کو پیٹ رہی تھیں۔لوگ انہیں علیحدہ کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔بڑی مشکل سے انہوں نے دونوں کو جدا کیا۔ان کے چہرے سرخ ہو گئے تھے اور ان پر خراشیں پڑ گئی تھیں۔وہ غلاظت میں لتھڑ گئی تھیں اور بالکل چڑیلیں لگ رہی تھیں۔ان کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔وہ ایک دوسرے پر ایک بار پھر لپکیں مگر لوگوں نے انہیں دوبارہ علیحدہ کر دیا۔

آخر کار اشکوا نے غصے اور تھکاوٹ سے وحشیانہ انداز میں چیخنا شروع کر دیا۔اس نے دیوانوں کی طرح اپنے بال کھینچے اور واویلا کرنے لگی۔

''اوہ یسوع مسیح!اوہ مقدس مریم!اس خبیث عورت کو دیکھو!ان ظالموں پر لعنت...... اوہ...... اوہ......''

وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر روئے جا رہی تھی۔تو میکوا گھر سے باہر چیخ چلا اور لعنت پھٹکار کر رہی تھی۔اس نے زور زور سے اپنی ایڑیاں دروازے میں ماریں۔

تماشائی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں کھڑے ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہوئے اپنے پیر برف میں مار رہے تھے۔عورتیں دیوار پر لگے سرخ دھبوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔بدن کو چیر دینے والی سرد ہوا سے بچنے کیلئے انہوں نے اپنے گھٹنے سکوڑ رکھے تھے۔وہ گاہے گاہے ایک دوسرے کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگتیں اور چرچ کی طرف جانے والی سڑک پر نگاہیں جما دیتیں۔درختوں کی ٹنڈ منڈ شاخوں کے عقب میں چرچ کی چوٹیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ہر ایک دو منٹ بعد کوئی نہ کوئی لاش دیکھنے چلا آتا،چنانچہ لوگوں کی آمد مسلسل جاری تھی۔نیم وا دروازے میں سے موم بتیوں کے ننھے زرد شعلے دکھائی دے رہے تھے اور اس لرزتے اجالے میں تابوت میں لیٹے بوڑھے آدمی کی ایک ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دے جاتی۔ہوا میں سلگتی ہوئی اگربتی کی مہک پھیل رہی تھی۔دعاؤں کی بھنبھناہٹ اور گونگے بہرے کی خرخراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔

آخر کار پادری آ پہنچا۔ چیڑھ کا سفید تابوت اٹھایا گیا اور چھکڑے پر لاد دیا گیا۔ عورتوں نے روایتی گریہ زاری شروع کر دی اور مخصوص بین کرنے لگیں۔ اجتماع گاؤں کی لمبی لمبی گلیوں میں سے گزرتا ہوا قبرستان کی طرف بڑھنے لگا۔

پادری نے مرحوم کی مغفرت کے لئے اولین الفاظ کہے۔ وہ اجتماع کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس نے اپنے لبادے کے اوپر فر کا فرغل پہن رکھا تھا اور سر پر کالی چوکور ٹوپی اوڑھے ہوئے تھا۔ تیز ہوا سے اس کے فرغل کا کونا پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے لاطینی مناجات کے الفاظ اس طرح وقفے وقفے سے نکل رہے تھے جیسے وہ منجمد ہو گئے ہوں۔ وہ اکتاہٹ کا شکار، بیزار اور بے چین دکھائی دیتا تھا اور اس کی نگاہیں دور کسی نقطے پر بھٹک رہی تھیں۔ تیز ہوا تابوت کے غلاف کو اڑا رہی تھی جس پر مصور جنت اور دوزخ کی تصاویر باہم گڈ مڈ ہو رہی تھیں اور آگے پیچھے پھڑ پھڑا رہی تھیں، جیسے جھونپڑیوں کی قطاروں کو اپنا نظارہ کرانے کیلئے مضطرب ہوں۔ جھونپڑیوں کے آگے عورتیں سروں پر شالیں لئے جبکہ مرد ننگے سر باہم جڑے کھڑے تھے۔ جنازہ آگے بڑھا تو مرد وزن احترام سے جھک گئے۔ انہوں نے اپنے اپنے سینوں پر صلیب کا نشان بنایا اور اپنی چھاتیاں پیٹنے لگے۔ جھاڑیوں کے عقب سے کتے بے تحاشا بھونک رہے تھے۔ ان میں سے کچھ تنگ دیواروں پر چڑھ گئے اور لمبی آواز میں رونے لگے۔ ننھے منے متجسس بچوں نے بند کھڑکیوں کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا۔ ان کے ساتھ کھڑے پوپلے منہ والے بوڑھوں کے چہرے بھی دکھائی دے رہے تھے جن پر پڑی جھریاں پت جھڑ میں ہل چلائے کھیتوں کی طرح تھیں۔

پادری کے پیچھے پیچھے لڑکوں کی ایک ٹولی دوڑ پڑی۔ ان لڑکوں نے سوتی پتلونیں اور پیتل کے بٹنوں والی نیلی جیکٹیں پہن رکھی تھیں۔ ان کے پیروں میں چوبی سینڈل تھے۔ وہ تابوت کے غلاف پر بنی جنت اور دوزخ کی تصاویر کو دیکھتے ہوئے اپنی باریک کپکپاتی آواز میں مناجات بھی گا رہے تھے۔

اگنات سب سے آگے، ایک ہاتھ میں غلاف تھامے احساس تفاخر کے ساتھ بلند آواز میں گا رہا تھا۔ سردی اور گرمی سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، لیکن وہ رکا نہیں جیسے یہ ظاہر کرنے کو بے تاب ہو کہ صرف اسے ہی مناجات گانے کا حق حاصل ہے کیونکہ یہ اس کا نانا ہے جسے قبرستان کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔

جنازے کے شرکا گاؤں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ تیز ہوا انتک کے یخم شحم جثے سے ٹکرا رہی تھی جو سب سے اونچا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے لیکن وہ تیز ہوا کو خاطر میں نہ لایا۔ اس کی پوری توجہ گھوڑوں اور تابوت کو سیدھا رکھنے پر تھی جو سڑک کے ہر گڑھے پر خطرناک انداز میں ایک طرف کو جھک جاتا تھا۔

دونوں بہنیں تابوت کے بالکل پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔ وہ دعائیں بدبدا رہی تھیں اور کھا جانے والی نگاہوں سے ایک دوسری کو گھور بھی رہی تھیں۔

"شوشو! گھر جاؤ!...... فوراً جاؤ بدذات!" ایک ماتم گسار نے پتھر اٹھانے کیلئے ہاتھ نیچے کیا۔ گاڑی کے پیچھے آتی ہوئی کتیا نے یہ دیکھ کر اپنی دم ٹانگوں کے بیچ دبائی اور سڑک کنارے پتھروں کے ڈھیر کے پیچھے دبک گئی۔ جنازہ تھوڑا سا آگے بڑھا تو وہ پتھروں کے ڈھیر کے پیچھے سے نکل کر تیزی سے آئی اور گھوڑوں کے ساتھ لگ کر چلنے لگی۔ پھر اسے کسی نے نہ بھگایا۔

لاطینی مناجات اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ عورتوں نے چیختی آوازوں میں پرانی مناجات گانا شروع کر دی:

"وہ جو پروردگار کی پناہ میں رہتا ہے۔"

لیکن اب کے آواز دھیمی ہی رہی۔ تیزی سے بڑھتے ہوئے برفانی موسم نے گیت کی لے کو بلند نہ ہونے دیا۔ جھٹ پٹا چھا رہا تھا۔ تیز برفانی ہوا حد نظر تک پھیلے ڈھلوان میدانوں سے برف کے بادل اڑائے لا رہی تھی۔ ان میدانوں میں یہاں اور وہاں ٹنڈ منڈ درخت کھڑے تھے۔ برفانی ہوا جنازے کے شرکاء پر کوڑے برسا رہی تھی۔ چاروں طرف پتھروں اور درختوں پر، اور سڑک کے دونوں اطراف برف کے بڑے بڑے ڈھیر لگنے شروع ہو گئے تھے۔

موسم کی شدت کے سبب جنازے کے شرکاء جب بے چین ہو کر اردگرد بڑھتی ہوئی برف کی سفید چادر کو دیکھتے تو بار بار ان کے گانے کا سلسلہ ٹوٹ جاتا۔ ہوا کے تھپیڑے جب برف کی اس چادر پر پڑتے تو کبھی وہ ساتھ ساتھ متحرک دکھائی دیتی اور کبھی ساحل سے ٹکرانے والی بڑی بڑی موجوں کی طرح ریزہ ریزہ ہوتی دکھائی دیتی اور ماتم گساروں کے برہنہ چہروں پر ہزاروں سوئیاں بن کر آ چبھتیں۔ موسم کی شدت میں اضافے کے پیش نظر کچھ لوگ تو آدھے راستے ہی سے لوٹ گئے جبکہ دوسرے اپنی رفتار تیز کرتے ہوئے بعجلت قبرستان کی طرف بڑھنے لگے۔ اب وہ تقریباً دوڑ رہے تھے۔ جب وہ پہنچے تو قبر تیار تھی۔ انہوں نے تیز تیز مناجات گائی۔ پادری نے تابوت پر مقدس پانی چھڑکا۔ مٹی اور برف کے منجمد ڈھیلے قبر میں لڑھکائے اور اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔

توک نے سب لوگوں کو اپنے گھر مدعو کیا تھا کیونکہ عزت مآب پادری نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو یہ مذہبی رسم پبلک ہاؤس میں غیر مذہبی انداز سے انجام پذیر ہوگی۔ اس دعوت کے جواب میں انٹک نے اس پر لعنت بھیجی۔ وہ چاروں بشمول انٹک اور کسان سمولوج سرائے کی جانب مڑ گئے۔ انہوں نے چار جام شراب کے پیے، سموسے کھائے اور رقم کے لین دین کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ کمرے کی گرمی اور شراب کی حرارت نے انٹک کو ہوش سے بیگانہ کر دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا گھر کی طرف اس حالت میں آ رہا تھا کہ اس کی بیوی نے اسے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ قرض ملنے کی امید میں ایک اور جام چڑھانے کی غرض سے سمولوج سرائے میں رک گیا لیکن انٹک سر پر پاؤں رکھ کر گھر کی طرف بھاگا کیونکہ اسے بہت سردی لگ رہی تھی۔

انٹک کہہ رہا تھا:

"دیکھو تو......ماں پانچ ایکڑ میرے ہیں......میرے، سنا تم نے!؟ میں خزاں میں ان کھیتوں میں گندم کا بیج ڈالوں گا......جو کاشت کروں گا......اور بہار میں آلو اگاؤں گا......میرے ہوئے......سب میرے......مجھے......خدا کا سہارا......وہ کہتا ہے......"

انٹک نے یکا یک گیت گانا شروع کر دیا۔

طوفان میں اضافہ ہو گیا تھا۔ تیز ہوا کی چنگھاڑ سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

"خاموش ہو جاؤ! گر پڑو گے اور سب کچھ یہیں انجام کو پہنچ جائے گا۔"

''......اس کے فرشتے......نگرانی......پر مامور ہیں......''

وہ کہتے کہتے ایک دم رک گیا۔ تاریکی گہری ہوگئی تھی۔ دو فٹ کے فاصلے پر بھی کچھ دیکھنا دشوار ہوگیا تھا۔ طوفان زوروں پر تھا۔ ہوا کا شور عروج پر پہنچ چکا تھا۔ میاں بیوی کو یوں گمان ہو رہا تھا جیسے برف کے پہاڑ ان پر گر رہے ہیں۔ جب وہ تو مک کی جھونپڑی کے پاس سے گزرے تو مرحوم کی آخری رسومات کی آوازیں ان کی سماعت سے ٹکرائیں مگر وہ آگے بڑھ گئے۔

''یہ کتے، کمینے! ایلیرے! تھوڑا انتظار کرو۔ میں تمہیں اپنے پانچ ایکڑ دکھاؤں گا......پھر میرے پاس دس ہو جائیں گے......تب تم مجھ پر رعب نہیں جما سکو گے......کتے کی نسل!......آ ہا......میں محنت کروں گا......آہ......ماں؟......کیا ہمیں بیل جائیں گے؟''

اس نے اپنی چھاتی پر مکا مارتے ہوئے مخمور دیے گھمائے۔ وہ اسی طرح بڑبڑا تا رہا۔ جب وہ گھر پہنچے تو بیوی نے اسے بستر پر دھکیل دیا جہاں وہ کسی مردے کی طرح چت پڑا رہا مگر سویا نہیں۔ کچھ دیر بعد وہ چلایا۔

''آگنات!''احتیاط سے۔''

اس کا لڑکا ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا مبادا باپ لات نہ رسید کر دے۔

''آگنات! کتے ہمردار! تم اول درجے کے کسان بنو گے......دو ٹکے کے پیشہ ور اور بھکاری نہیں......سمجھے!''

اول فول بکتے ہوئے اس کا ہاتھ بستر سے نیچے ڈھلک گیا۔

''پانچ ایکڑ میری ملکیت ہیں......میرے ہیں......کم بخت بدنیش......تیری ایسی تیسی......''

وہ بڑبڑا تا رہا۔ حتیٰ کہ اُسے گہری نیند نے آلیا۔

☆......☆......☆

گدھ

ہنرک پونٹو پیداں کا شمار ڈنمارک کے ممتاز اور عالمی شہرت یافتہ کہانی کاروں اور ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ 24 جولائی 1857ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے واجبی تعلیم پائی۔ کسی بھی تعلیمی درسگاہ سے سند یافتہ نہیں تھے۔ اس کے باوجود اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر کچھ عرصہ ایک سکول میں بچوں کو درس دینے پر مامور رہے۔ وہ عقیدتاً آزاد خیال تھے۔ ان میں بے پناہ تخلیقی صلاحتیں تھیں۔ انہوں نے اپنے ملک کے معروضی حالات، طرزِ زندگی اور سماجی حقائق کو اپنے ناولوں اور کہانیوں کا موضوع بنایا۔ ان کی نثر نگاری نے ڈینش ادب پر گہرے نقوش ثبت کیے۔ ''سرزمین جس کا وعدہ کیا گیا'' ان کی اہم تصنیف ہے۔ آفاقی سطح پر اس ناول میں ہر خطۂ زمین کی دیہی زندگی کی عمومی نمائندگی موجود ہے۔ تاہم ان کی تحریریں صرف دیہی موضوعات کا احاطہ نہیں کرتیں۔ انہوں نے ڈنمارک کی شہری زندگی کو بھی ماہرانہ اور فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ بطور مثال ان کے ناول ''خوش قسمت پیٹر'' کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ ایک اور ناول ''مُردوں کی سلطنت'' کی فضا یاس و قنوطیت سے پُر ہے۔ مگر یہ مصنف کے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ اس وقت کے ڈنمارک کی حقیقی فضا کی آئینہ دار ہے۔ ہنرک پونٹو پیداں اعلیٰ اقدار کے مبلغ اور سماج میں ان کے فروغ کے علم بردار تھے۔ حرص، طمع، خود غرضی اور استحصالی ہتھکنڈوں سے ان کی نفرت سے آگہی حاصل کرنا ہو تو ان کے زیرِ نظر افسانہ ''گدھ'' کا مطالعہ ہی کافی ہے۔ یہ ان افسانوں میں سے ایک ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں 1917ء میں ادب کا نوبل انعام عطا کیا گیا۔ ہنرک پونٹو پیداں 21 اگست 1943ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

☆......☆......☆

دور اُفتادہ سرزمین میں کھلے سمندر کے کنارے مچھیروں کی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ بستی کیا ہے، ریت میں آدھی دھنسی ہوئی دس بارہ چوبی سیاہ جھونپڑیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ جھونپڑیاں اس ریتلی چٹان پر قدرے پیچھے ہٹ کر واقع ہیں جس کے عمودی کٹاؤ کے ساتھ دم توڑتی ہوئی لہریں آ کر ٹکراتی اور سفید جھاگ اُڑاتی ہیں۔ گرمیوں کے خاموش اور سنسان دنوں میں تپتا ہوا سورج جھونپڑیوں کی سیاہ لکڑی کی گوند پگھلا دیتا ہے اور ریت گرم ہو کر قدموں تلے سلگنے اور دہکنے لگتی ہے۔ ایسے میں مچھیروں کی اس ساحلی بستی کا اکیلا پن سوا ہو جاتا ہے اور سمندر کا گہرا سبز پانی تا حدِ نظر پھیلی خاموشی اور تنہائی کو دیکھ کر اداسی کی چادر اوڑھ لیتا ہے۔ ساحل کی تپتی ریت یا اس چٹان کے ارد گرد اس وقت کوئی بھی ذی روح دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ ریتلی چٹان سے پرے گھاٹ پر لنگر انداز خالی کشتیاں یا پھر بانسوں پر جھولتے، ماہی گیروں کے گیلے جال دیکھنے والوں کو اپنی جانب ضرور متوجہ کرتے ہیں جنھیں خشک کرنے کی غرض سے ایک قطار میں پھیلا دیا گیا ہے۔ سورج ڈھلنے تک یہی منظر برقرار رہتا ہے۔ پھر جیسے ہی دھوپ کی تمازت کم ہوتی

بے نیم برہنہ بچوں کے گروہ شور مچاتے ساحل پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے نظر آتے ہیں اور ریتلی چٹان پر جا بجا گرمی میں جھلسی ہوئی رنگت والی عورتیں سینڈ ھوری اسکرٹ کے ساتھ باریک، میالے اور پھول دار بلاؤز پہنے آگ جلاتی نظر آتی ہیں تاکہ شام کے لئے موٹے چاول اور مچھلی پر مشتمل کھانا تیار کر سکیں...... مگر جب سال کے وہ مہینے آتے ہیں جب دن اور رات دونوں کا دورانیہ برابر ہو جاتا ہے اور سمندر کی شوریدہ سر لہریں اپنے جلو میں تیز ہوائیں اور طوفان لے کر آتی ہیں تو اس بستی کے مچھیرے اپنی چوبی جھونپڑیاں اٹھا کر ریتلی چٹان سے بہت پیچھے لے جاتے ہیں۔ ان دنوں ریتلی چٹانوں سے سر ٹکرانے والی موجوں میں کسی اژدھے کی سی طاقت در آتی ہے۔ بپھرے ہوئے سمندر کا جھاگ پھوار بن کر ریتلی چٹان کی اوپری سطحوں پر جہ در تہہ بچھ جاتا ہے۔ بسا اوقات کوئی جنونی لہر چٹان کو غسل دیتی ہوئی نشیب میں اتر جاتی ہے۔ ایسے میں ماہی گیری کم اور جھونپڑیوں کی مرمت زیادہ ہوتی ہے۔ کیا مرد اور کیا عورتیں سب کے سب تختوں کے درمیان موجود جھریوں اور سوراخوں کو بند کرنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں یا چھتوں پر پتھر جماتے نظر آتے ہیں تاکہ جھونپڑیاں تیز ہوا میں کہیں سمندری بگلوں کے مانند اڑ ہی نہ جائیں۔ طوفان دم لیتا ہے تو مچھیروں کی بستی تھکاوٹ کے مارے نیند میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ تب کوئی شخص باہر نکل کر غضب ناک سمندر سے رزق مانگنے کی تاب نہیں رکھتا۔

ایسی ہی ایک اندھیری، سیاہ اور طوفانی رات کا ذکر ہے۔ بپھرے ہوئے سمندر سے مہیب آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ شوریدہ سر لہریں ساحل سے سر پٹک رہی ہیں۔ طوفانی ہوا کے تھپیڑے، بے قابو لہروں کی معیت میں انتہائی طاقت اور شدت کے ساتھ پانی میں ابھری ہوئی چٹانوں سے ٹکراتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی دیو قامت پرندہ گھبراہٹ اور بدحواسی میں اڑتے ہوئے اپنے بڑے بڑے پر پھڑپھڑا رہا ہے۔

اس لمحے ماہی گیروں کی اس ساحلی بستی کے مکین، ساحل پر واقع ایک اونچے ریتلے ٹیلے پر ایک مدھم سی لالٹین کے گرد دائرہ بنائے بیٹھے ہیں۔ زرد روشنی میں ان کے چہروں پر بکھری ہوئی ناتراشیدہ اور الجھی ہوئی داڑھیاں انھیں مزید وحشی بنا رہی ہیں۔ انہوں نے گدھوں کے سے پر اُمید انداز میں اپنے سر اس طرح گھٹنوں میں دے رکھے ہیں جیسے غنودگی میں ہوں۔ سب کے سب مہر بہ لب ہیں۔ ان کے عقب میں یہاں، وہاں جھونپڑیوں کے کھلے دروازوں میں بکھرے بالوں والی نیم برہنہ عورتوں کے ہیولے دکھائی دے رہے ہیں۔

اچانک سمندر سے ایک مختلف آواز ابھرتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہوا کی مخالف سمت کسی نے دروازہ کھولا ہے مگر وہ تیز طوفانی ہوا کے زور سے بند ہو گیا ہے۔ یہ مختلف آواز سنتے ہی دائرے میں بیٹھے اُجڈ مردوں میں کوئی شخص رینگ کر ریتلی چٹان کے کنارے تک جاتا ہے اور ایک ہاتھ کان کے قریب لے جا کر اس آواز کو سننے کی کوشش کرتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد ایک اور آدمی دائرے سے اُٹھ کر وہاں پہنچ جاتا ہے اور اس کے ساتھ لیٹ کر یہی عمل دہراتا ہے۔ دونوں کے درمیان طویل خاموشی کو توڑ دینے والے چند غنودہ الفاظ کا تبادلہ ہوتا ہے۔ چند لمحوں بعد کھردرے کپڑوں میں ملبوس بڑھی ہوئی داڑھیوں اور چوڑے چکلے کندھوں والے درجن بھر مرد اندھیرے سے برآمد ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں رسے، سیڑھیاں اور کشتیوں میں استعمال ہونے والے دھاتی اوزار ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے کوئی بات کئے بغیر ریتلی چٹان کے نشیب میں اُتر جاتے ہیں اور ایک منظم گروہ کی شکل میں مشرق کا رخ کرتے ہیں۔ جونہی وہ اندھیرے میں گم ہوتے ہیں، جھونپڑیوں کے نیم وا دروازوں میں کھڑی نیم برہنہ عورتیں جھونپڑیوں کے دروازے بند کر دیتی ہیں...... اور ایک بار پھر چہار سو سمندر کا مہیب شور چھا جاتا ہے۔

چند ثانیے بعد سیاہ آسمان کے مشرق کنارے پر واقع ریتلی چٹانوں پر ایک شعلہ بھڑکتا ہے۔ یہ گندے سیاہ تیل میں بھیگی ہوئی گیلی لکڑی کی مشعل ہے جو سرخ چنگاریاں پیدا کرتے ہوئے تڑتڑ جل رہی ہے۔

کافی دیر اسی طرح گزر جاتی ہے۔

پھر سمندری طوفان میں ساحل سے قدرے فاصلے پر ملی جلی انسانی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ جیسے ہی یہ چیخیں ابھرتی ہیں، ریتلی چٹان کے عقب میں عین اس لمحے مشعل گل ہو جاتی ہے اور ہر طرف اندھیرا اچھل جاتا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ سمندر میں کسی جہاز کو حادثہ پیش آ گیا ہے اور وہ بے رحم طوفان کی زد پر ہے۔ مشعل کی روشنی نے بدقسمت جہاز کو امید کی کرن دکھائی ہے مگر جہاز بھٹک کر چٹانوں سے ٹکرا گیا ہے اور آہستہ آہستہ نامہربان سمندر میں غرق ہو رہا ہے۔ جہاز کے عرشے پر چیخ پکار اور بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ کپتان کی گونج دار آواز اور نظم وضبط قائم رکھنے کے احکام، بدحواس آوازوں، خوفزدہ چیخوں اور مایوسی بھری گالیوں میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ ان آوازوں میں ایک آواز سب سے نمایاں ہے...... اور وہ ہے ایک خوفزدہ عورت کی چیخیں۔

دائرے میں بیٹھے ہوئے مہر بہ لب، غنودہ سے ماہی گیروں پر ان آفت رسیدہ انسانوں کی چیخ پکار کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا ہے۔ ڈوبتے جہاز کے ملاحوں کی جھلاہٹ بھری آواز اور طوفانی تھپیڑوں سے لڑنے کی بے سود کوششوں سے ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی ہے۔ سہمی ہوئی عورت کی، وقفے وقفے سے بلند ہونے والی چیخیں سن کر وہ شرارت بھری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور ان کے ہونٹوں پر ایک شیطانی سی مسکراہٹ کھیل جاتی ہے۔

چند ہی ثانیے بعد سمندر کی سطح پر یکایک خوفناک تلاطم برپا ہوتا ہے اور لہریں مہیب آواز کے ساتھ اٹھنے لگتی ہیں اور وہ یکے بعد دیگرے توپوں کی دھمک سے مشابہ آوازوں کے ساتھ ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ کوئی چیخ سنائی نہیں دیتی۔

تھوڑی دیر گزرتی ہے تو ریتلے ٹیلوں اور سمندر کے درمیان موجیں مارتے متلاطم پانی کی سطح جہاز کے ملبے سے بھر جاتی ہے جو اس طرح ادھر سے ادھر گردش کر رہا ہے جیسے ابلتے ہوئے پانی کے دیگچے میں ہو۔ پانی کچھ ملبہ ساحل پر پھینک دیتا ہے اور باقی ماندہ، موجوں کے جلو میں، مزید تھپیڑے سہنے کے لئے گہرے پانیوں میں لوٹ جاتا ہے۔ لگتا ہے جہاز کے مسافروں میں سے کوئی ابھی تک موت سے نبرد آزما ہے کیونکہ اسی اثناء میں لہریں رسے سے بندھا مستول کا ایک بڑا سا ٹکڑا ساحل پر لا کر پٹخ دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک مصیبت زدہ آدمی چمٹا ہوا ہے۔ وہ مدد کے لئے چیختا ہے۔ اس کی چیخ میں تکلیف کے احساس کے ساتھ ساتھ جان بچ جانے کی خوشی بھی شامل ہے۔

دائرے میں بیٹھے ہوئے آدمی چیخ سن کر اس طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ وہ مصیبت زدہ آدمی کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ جو مدد کے لئے ہاتھ آگے بڑھاتا ہے۔ دائرے سے اٹھ کر جانے والے آدمیوں میں سے ایک، اس کا ہاتھ تھامنے کے بجائے اس کے پہلو میں بڑے پھل کا چھرا گھونپ دیتا ہے۔ دوسرے مرد اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ لالٹین ریت پر، اس اجنبی کے چہرے کے قریب لائی جاتی ہے جہاں وہ آخری سانسیں لیتے ہوئے انہیں پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

''یہ شراب ہے!'' لالٹین بردار شخص اجنبی کے گیلے کوٹ کا ابھار دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔ باقی اس کی تائید میں سر ہلاتے ہیں۔ ایک موٹا آدمی جھک کر اس کے کوٹ کی جیب ٹٹولتا ہے اور شراب کی بوتل نکال کر اپنے ایک ساتھی کے حوالے کر دیتا ہے۔ سب کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے اور وہ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اسی لمحے موٹے آدمی کی نظر اجنبی کے کانوں میں چمکنے والی بالیوں پر پڑتی ہے۔ یہ یقین کرنے کے لئے کہ وہ پھر اٹھ کھڑا نہ ہو، موٹا آدمی ایک بار پھر اس کے پہلو میں چھرا گھونپ دیتا ہے اور رازداری سے اس کی بالیاں نوچ کر اسے خون ابلتے زخم سمیت ساحل پر تڑپتا چھوڑ کر دوسری طرف نکل جاتا ہے جہاں اس کے ساتھی ہک لگے بانسوں اور رسوں کی مدد سے، جھاگ اڑاتی لہروں میں سے جہاز کا ملبہ اور شکستہ سامان کھینچنے میں مصروف ہوتے ہیں۔

پھر جب سمندری سطح پر پھیلی سرمئی اور ٹھنڈی دھند کے عقب سے سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے تو ساحل کی ریت پر پنیر کے ڈبے، شراب کے ڈرم، تختے، بانس اور رسے بکھرے نظر آتے ہیں۔ جس تیزی سے لہروں نے انہیں ساحل پر پھینکا ہے، اسی تیزی سے اجنبی مسافروں کی لاشوں کی تلاشی لی جاتی ہے اور قیمتی اشیاء قبضے میں لے لی جاتی ہیں۔ چوبی صندوقوں کو توڑ کر اور چرمی تھیلوں کو چھروں سے پھاڑ کر ان میں سے رنگین ریشمی پیراہن، ظروف اور زیورات سمیت لے جاتے ہیں۔ پھر ناکارہ اشیاء کو واپس لہروں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

جس وقت یہ کارروائی عروج پر ہوتی ہے، ماہی گیروں کی چوبی جھونپڑیوں سے نیم برہنہ عورتیں بڑے بڑے برتنوں میں گرم شراب لاتی اور مردوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ صبح کی سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی وہ ایک دوسرے کے قریب سمٹ آتی ہیں اور ریتلے ٹیلے کے کنارے کھڑے ہو کر للچائی نظروں سے ریت پر ڈھیر قیمتی اشیا کو دیکھنے لگتی ہیں۔

دوپہر کے وقت جب غارت گری اپنے اختتام کو پہنچتی ہے تو برہنہ لاشوں کو نہایت احتیاط سے ریت میں دفن کر دیا جاتا ہے اور لوٹ کا مال اور شراب کے ڈرم خوشی خوشی جھونپڑیوں میں لائے جاتے ہیں، پھر ریتلی چٹان پر ایک شاندار ضیافت کا اہتمام ہوتا ہے۔ کیا مرد، کیا عورتیں اور کیا بچے سب بھنی ہوئی مچھلی، پنیر اور شراب سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ شام تک جاری رہتا ہے اور پھر رات کی تاریکی چھانے پر کامیاب لوٹ مار اور شراب کے نشے میں بدمست مرد اپنی مائل بہ کرم عورتوں کو دبوچ لیتے ہیں تاکہ ریتلی چٹان پر آباد ان کی مختصر بستی کی آبادی میں اضافہ ہو سکے۔

مگر یہ بہت پرانے زمانے کی بات ہے۔ اس زمانے کی جب انسان نے آج جیسی تہذیبی اور تمدنی ترقی نہیں کی تھی۔ اب لوگ پرانے وقتوں کی یہ وحشت ناک کہانیاں اور قصے بھلا چکے ہیں۔ چوبی جھونپڑیوں والی اس بستی کی جگہ سمندری موجوں نے برسہا برس تک ریت کی اتنی تہیں بچھا ڈالی ہیں کہ ماضی، اپنے تمام تر آثار سمیت ریت میں دفن ہو چکا ہے۔

تاہم یہ ہو سکتا ہے کہ موسم گرما کی کسی خوشگوار شام، جب سورج خون کی طرح سرخ بادلوں کے پیچھے غروب ہو رہا ہو، اور سمندر کی سطح پر شعلوں کی سی لو پھیلی ہو، تو کسی معزز خاندان کا سربراہ، جو ملک کے اس خوبصورت حصے کی سیر پر نکلا ہو، اس جگہ تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جائے اور اردگرد کے دلکش منظر میں کھو کر، بچوں کو طوفانی راتوں کی وہ وحشیانہ اور دہشت ناک حقیقی کہانیاں سنائے جو ماضی میں اس مقام پر واقع بستی میں وقوع پذیر ہوئی تھیں۔

جس وقت وہ انہیں یہ کہانیاں سنا رہا ہوگا، تو یقیناً وہ انہیں بتائے گا کہ اس مقام پر واقع مچھیروں کی بستی کی جگہ اب لائف بوٹ اسٹیشن تعمیر ہو چکا ہے۔ یہ دکھانے کے ساتھ ساتھ، وہ مشرق کی سمت اشارہ کرے گا جہاں روشنی کا ایک مینار جہازوں کی رہنمائی کے لئے سر اٹھائے کھڑا ہے تاکہ وہ زیر آب زمین کی آخری حد تک کا تعین کر سکیں۔ یہ دیکھتے ہوئے پس منظر میں دور تک پھیلا ہوا وہ ساحلی شہر بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہے گا جہاں کبھی پرانے زمانے میں اجڈ اور وحشی مچھیرے رہا کرتے تھے۔

ریتلے ٹیلے پر، جس نے حیرت انگیز طور پر اپنی سنڈی جیسی شکل برقرار رکھی ہے، ماہی گیروں کی بستی کی جگہ اب پکے مکانوں پر مشتمل ملاحوں، ماہی گیروں، حکومتی کارندوں اور تجارت پیشہ لوگوں کی کالونی آباد ہے، جو عقب میں دور تک، خلیج کے کنارے کنارے گھومتی، شہری آبادی سے ناتا جوڑ چکی ہے۔ اس کالونی میں ایک خوبصورت گرجا گھر ہے، تاجروں کے لئے ایک وسیع سرائے، اشیائے ضرورت کا بازار، سیاحوں کا ہوٹل اور تفریحی کشتیوں کا کلب۔ سرسبز پہاڑوں کے پس منظر میں، جن پر حکومتی نگرانی میں خوب شجرکاری کی گئی ہے، مکانوں کی سرخ چھتیں عجب بہار دکھاتی ہیں۔

موسم گرما کے خاموش دنوں میں، جب سورج چند پرانی بچی کھچی چوبی جھونپڑیوں کے تختوں کی گوند پگھلانے لگتا ہے اور ساحلی ریت کو اس قدر گرم کر دیتا ہے کہ وہ پاؤں کے نیچے دہکنے اور سلگنے لگتی ہے تو کالونی پھر ویسی ہی اداس و تنہا دکھائی دینے لگتی ہے، جیسے زمانہ قدیم میں مچھیروں کی مذکورہ بستی دکھائی دیتی تھی۔ یہ تنہائی اور اداسی ان سیاہ بانسوں اور ان پر جھولتے گیلے جالوں تک پھیل جاتی ہے جو دھوپ میں سوکھ رہے ہوتے ہیں۔ دھوپ ڈھلتی ہے تو ساحل ریت پر اسی طرح نیم برہنہ بچے شور مچاتے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے نظر آتے ہیں اور گرمی میں جھلسی ہوئی رنگت والی، سرخ، سینڈ ھوری اسکرٹ اور پھول دار بلاؤز میں ملبوس عورتیں گھروں میں تیل کے چولہوں پر چاول اور مچھلی پکاتی نظر آتی ہیں۔

ساحل کے کنارے مصور، ایزل جمائے، قطار در قطار، زرد چھتریوں تلے کھمبوں کے نیچے مینڈکوں کی طرح بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ جگہ جگہ شاعر، ہاتھوں میں کاپیاں پکڑے، کسی گہری سوچ میں گم بیٹھے نظر آتے ہیں اور سیاح اس عجیب منظر نامے کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔

سہ پہر کے وقت دھوپ اور گرمی کی شدت میں کمی آ جاتی ہے اور سفید رنگت کا ایک غبار کالونی کے اوپر چھانے لگتا ہے۔ گھروں کے باہر بطخیں، سؤر اور بچے عالم غنودگی میں ریت پر دراز نظر آتے ہیں۔ نیند کی ماری برہنہ عورتیں بیزاری سے دروازوں سے اندر اور باہر آتی جاتی نظر آتی ہیں۔ کبھی کبھی ان کی نظریں ان جوان لڑکیوں کی طرف اٹھ جاتی ہیں جو ریت کنارے بیٹھے سیاحوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور پہیلیوں میں مصروف ہوتی ہیں۔

سیاحوں کے ہوٹل کی سیڑھیوں پر چند خوش پوش ادھیڑ عمر سیاح ہاتھوں میں دوربینیں لئے ساحل کی جانب دیکھتے نظر آتے ہیں۔ ان کے عقب میں خوش مزاج عورتیں اپنے ہیٹ سروں پر جمائے، آنکھوں پر چشمے لگائے، اپنے ساتھیوں کی نگاہوں کا تعاقب کر رہی ہوتی ہیں۔

ریتلی چٹان پر چند ماہی گیر، منہ میں پائپ دبائے، اپنے جال مرمت کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ آنکھوں پر ہیٹ رکھے ریت پر سو رہے ہوتے ہیں جبکہ کچھ سمندر کی طرف سرسری نظروں سے دیکھتے ہوئے آپس میں گپ شپ میں مصروف ہوتے ہیں۔ حد نظر تک پھیلا ہوا کالا نیلا سمندر یوں خاموش دکھائی دیتا ہے جیسے وہ بھی اپنی شوریدہ سری سے تھک گیا ہو۔ اس کی پرسکون لہریں یہ پیغام دیتی نظر آتی ہیں کہ ماہی گیروں، کشتی رانوں اور جہاز رانوں کیلئے زندگی اور نقل و حرکت قطعی محفوظ ہے۔

ایسی ہی ایک سہ پہر کا ذکر ہے۔ ایک بہت بڑا اسٹیمر دھواں اڑاتا شمال مشرق کی سمت رواں دواں نظر آ رہا تھا۔ یہ "ٹو برادرز" نامی برطانوی اسٹیمر تھا جو کائی گٹ کی سمت جا رہا تھا اور بظاہر اس کی منزل ناروے یا سویڈن کی کوئی بندرگاہ تھی۔ ڈیک پر سب اچھا کی صورت حال تھی۔ تھوڑی دیر پہلے آواز کی بازگشت سے زیرآب چٹانوں کی موجودگی کی خبر دینے والا آلہ استعمال کیا گیا تھا۔ کوئی خطرے کی بات نہیں تھی۔

نچلے عرشے پر سرخ دھاری دار قمیضوں میں ملبوس جرمن، سویڈش اور آئرش ملاحوں پر مشتمل ملاحوں کی ٹولی اوندھے منہ سائے میں لیٹی ہوئی تھی۔ جہاز کا کپتان بذاتِ خود نگرانی کر رہا تھا اور ساحل کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ وہ ایک اونچی جگہ اپنے کیبن میں بیٹھا تھا۔ وہ درمیانے قد کا بے حد موٹا انگریز تھا۔ اس کی گردن دہری اور چھوٹی تھی، رخسار سرخ اور پھولے ہوئے تھے اور چہرے پر ملائمت تھی۔ وہ اپنی سفیدی مائل نیلی آنکھوں سے شیشے کی کھڑکی سے سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا اور آہستگی سے سگار پی رہا تھا۔

وہ اکیلا نہیں تھا۔ ایک دبلی پتلی انگریز لڑکی قریباً اس کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی اور گاہے گاہے اپنی انگلیوں میں دبے سینڈوچ پر اپنے دانت گاڑ رہی تھی۔ وہ ایک پرکشش لڑکی تھی۔ دونوں خاموش تھے۔ جب بھی کپتان بے خیالی میں کچھ آگے جھک جاتا اور اس کے سگار کا دھواں لڑکی کو کھانسنے پر مجبور کر دیتا تو وہ بے ساختہ، لاڈ سے اس کی الجھی ہوئی سنہری داڑھی کو کھینچتی مگر اس گوشت کے پہاڑ کی طرف سے ناراضی کی ہلکی سی پھنکار اسے متنبہ کرنے کے لئے کافی ثابت ہوتی اور وہ فوراً داڑھی چھوڑ کر بلی کے کسی خوفزدہ بچے کی طرح ملتجی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگتی۔

یہ "نیل میری" تھی۔ اس نے اپنا یہی نام بتایا تھا۔ مگر کیپٹن چارلس...... اگر کبھی اسے اس سے بات کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی...... تو اسے "میری" کہہ کر بلاتا تھا۔ عملہ، جسے شاذ ہی اسے دیکھنے کا موقع ملتا، باورچی اور خدمت گار اسے "مس" کہہ کر مخاطب کرتے۔ اور جب وہ ڈیک پر کسی انگریز لیڈی کی طرح کوٹ پہنے نپے تلے قدموں سے روزانہ چہل قدمی کے لئے نکلتی تو ملاح اس کے لئے نرم روئی سے راستہ چھوڑ دیتے۔ ان کے کسی انداز سے اس بات کا اظہار نہ ہوتا کہ وہ اس کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔

وہ اس جہاز پر دو ماہ پہلے لیورپول سے سوار ہوئی تھی اور اس دوران کیپٹن چارلس نے بارہا اپنی بھاری مٹھی اپنے کیبن کی میز پر مار کر اس سے اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ اسے اگلی برطانوی بندرگاہ پر اتار کر پستی اور مفلسی و بدحالی کی اس گندی بستی میں واپس بھیج دے گا جہاں سے وہ آئی تھی۔ مگر موسم گرما کی سبک ہواؤں اور کئی نفع بخش پھیروں نے اسے نرم کر دیا تھا۔ لڑکی کی نگاہوں میں ہمیشہ ایک التجا ہوتی اور وہ اپنا نازک بازو پیار سے اس کی موٹی گردن میں حمائل کر کے اس طرح اسے دیکھتی کہ اسے چربی بھرے سینے کے نیچے کوئی شے دھڑکتی محسوس ہونے لگتی۔ وہ ہر بار اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ میری کی عمر بمشکل سولہ سترہ سال تھی۔

کیپٹن نے پانی کی طرف دیکھتے ہوئے اب اپنی گردن کرسی کی پشت گاہ سے ٹکا دی تھی۔ میری جس نے سینڈوچ ختم کر لیا تھا، آہستگی سے اس کے قریب کھینچ آئی تھی اور اپنی سبزی مائل نیلی آنکھوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کیپٹن نے اسے سرسری نظروں سے دیکھا اور دور افق پر نظریں جما کر کسی خیال میں کھو گیا۔ وہ عجیب سے سپنے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ وہ میری کو گرمیوں کے اختتام...... بلکہ سردیوں کے آخر تک اپنے پاس رہنے دے؟ بلکہ لڑکی سے شادی ہی کیوں نہ کر لے۔ اسے اس کے ساتھ کی عادت ہو گئی تھی اور اب یہ خیال کہ وہ میری کو اپنے

ساتھ نہ رکھے کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ بلاشبہ اگر وہ اس سے شادی کر لیتا تو اس کے ساتھی اس پر خوب ہنستے۔ گریگ ماؤتھ میں اس کے گھر والے بھی تضحیک و تعجب کا اظہار کرتے۔ کیوں نہ انہیں ہنسنے دیا جائے، جب تک وہ سمندر میں تھا اسے اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اس کے ماضی کے بارے میں اس کے پاس کافی عذر موجود تھا۔ وہ ایک گھٹیا، مفلس، باپ کی بیٹی تھی۔ اس کی ماں نے جو خوراک کی کمی کے باعث، کمزور اور بیمار تھی اسے پیٹ کی خاطر بچپن ہی میں اپنا پیشہ سکھا دیا تھا۔ میری جو بالکل بچی تھی اسے ان باتوں کا کچھ پتہ نہ تھا۔ ہر رات جب سوروں اور بھینسوں جیسے بھاری اور جاندار مرد اسے بھنجوڑ کر چلے جاتے تو وہ گھنٹوں تکلیف اور درد سے سسکتی رہتی۔ نشے میں دھت باپ ان مردوں سے ملی ہوئی رقم چھین لیتا اور جب وہ کھانے کے لئے اس رقم سے کچھ مانگتیں تو انہیں لاتوں تھپڑوں اور گھونسوں سے دھن کر رکھ دیتا۔ میری ذلت کے معنوں سے آشنا نہیں تھی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ زندگی جسے وہ گزار رہی ہے ذلت کی زندگی ہے یا نشیبی جگہوں پر کوڑے سے اٹی سیلن زدہ گلیوں اور جھونپڑوں میں رہنا زیادہ باعث ذلت ہے۔ اسے بس یہ پتا تھا کہ یہ زندگی تکلیف دہ ہے جس میں زخم پر زخم لگتا ہے، مار پہ مار پڑتی ہے اور ناتواں جسم کے ساتھ بھوک سے لڑنا پڑتا ہے۔

چنانچہ ایک روز وہ گھر سے نکل بھاگی تھی اور روٹی اور سائبان کی تلاش میں اس جہاز پر پہنچ گئی تھی۔ اسی دوران جبکہ کیپٹن اپنے سپنوں میں کھویا ہوا تھا اور نازک میری اس کے سینے سے سر لگائے غنودگی کی حالت میں، اس کے سانس کے زیر و بم کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہی تھی، انہیں کئی ہلکے ہلکے جھٹکے محسوس ہوئے اور پھر ایک بڑے جھٹکے کے ساتھ اسٹیمر ایک دم رک گیا۔ اسٹیمر کے انجن تیز آوازیں نکالنے لگے تھے۔

کیپٹن چارلس کا بھاری جسم ایک لمحے میں چستی کی حالت میں لوٹ آیا۔ اس نے میری کو اپنی گود سے پرے دھکیلا اور بھاگتے ہوئے باہر نکلا۔ اس نے انجن بند کر کے ریلنگ سے نیچے جھانکا۔ جہاز کم گہرے پانی میں جا کر ریتلی زمین میں دھنس چکا تھا۔ ریلنگ سے سمندر کے کم گہرے پانی سے ریت پر چمکتے گھونگھے اور بے شمار کنکریاں دکھائی دے رہی تھیں جن سے اسٹیمر آہستگی سے ٹکرایا تھا۔

اس کا چہرہ جو خوف سے بالکل سفید پڑ گیا تھا، یہ یقین کرنے کے بعد کہ جہاز کے ڈھانچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، دوبارہ سرخی کی طرف لوٹ آیا اور اس نے ان ملاحوں سے جو جہاز کے ہر حصے سے دوڑتے ہوئے اوپر چلے آ رہے تھے ایک گہری سانس لے کر کہا "کچھ نہیں ہوا خیر ہے۔"

"آدھی رفتار!...... پیچھے کرو، پیچھے کرو...... آدھی رفتار!" اس نے چلا کر انجینئر کو ہدایت دی۔ اور جب انجن ٹھیک طرح دوبارہ چلنے لگے تھے اس نے سگار کے کش لیتے ہوئے کئی بار اوپر سے نیچے چکر لگائے۔

مگر جہاز اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "پوری رفتار! پوری رفتار!" مگر جہاز وہیں رہا، جہاں وہ پھنس چکا تھا۔ انجن چیختے رہے، دھواں اگلتے رہے مگر صورتحال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔

اس دوران یہ ہنگامی صورتحال ایک مصور اور اس کے لئے ماڈل بن کر کم گہرے پانی میں جال کھینچتے، ملاحوں کی توجہ حاصل کر چکی تھی۔ لمحوں میں یہ خبر پوری کالونی میں اور پھر شہر میں، جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں ساحل اور ریتلی چٹان پر کالونی کے مرد عورتیں اور بچے جمع ہو گئے۔ سب کی نگاہیں شمال مشرق کی جانب ریت سے نبرد آزما اس آہنی دیوار کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں جس کی چنگھاڑ انہیں صاف سنائی دے رہی تھی۔ مردوں کے چہرے پر خوشی کے احساسات صاف دیکھے

جا سکتے تھے۔ وہ بات بات پر ہنس رہے تھے اور آپس میں ٹھٹھہ مذاق کر رہے تھے۔

سیاحوں کی بڑی تعداد جو اس ہجوم میں شامل تھی، اپنے کیمروں کو فوکس کر کے اس جہاز کی تصویریں بنانے لگی تھی۔ سیاحوں کے ہوٹل کی سیڑھیوں پر تل دھرنے کی جگہ باقی نہ بچی تھی۔ کھلی کار میں سوار ایک پولیس آفیسر اور کمشنر بھی تماشائیوں میں شامل ہو گئے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے سوال پوچھ رہے تھے۔ انہیں یہ جاننے کا تجسس تھا کہ جہاز کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا ہے۔ ہر کوئی پوچھ رہا تھا کہیں وہ ڈوب تو نہیں رہا؟ جلد ہی سب کو معلوم ہو گیا کہ جہاز ریت میں پھنس گیا ہے۔ یہ سن کر ایک تاجر جو اپنے دفتر میں بیٹھا تھا، پر جوش انداز میں اپنی کرسی سے اٹھا اور نوکر کو حکم دیا کہ بارے وسکی کی ایک بوتل لائے۔ ہمسائے اور دوست خوش خوش ایک دوسرے کے پاس پہنچے اور ہر جگہ کافی کی خوشبو بھری بھاپ اڑتی نظر آنے لگی حتیٰ کہ چلنے پھرنے سے معذور بوڑھے لوگ بھی کسی نہ کسی طرح نزدیکی ٹیلے پر پہنچ گئے اور چیختے چنگھاڑتے اسٹیمر کو ریت کی گرفت سے نکلنے کی کوشش میں مشکل سے دوچار دیکھ کر پوپلے منہ سے ہنسنے لگے۔

ادھر ساحل پر لوگوں کا ہجوم تھا، سمندر میں، ساحل سے چند سو گز دور، اسٹیمر کے اردگرد سالویج کارپوریشن کی کشتیوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ جب بھی کیپٹن نظر آتا، ان کشتیوں سے لوگ چیخ چیخ کر اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرتے۔ کیپٹن چارلس یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے اس کے اردگرد جو لوگ جمع ہیں وہ اس کی موجودگی محسوس نہیں کر رہا۔ اپنے اسسٹنٹ کے ذریعے اس نے تمام اجنبی لوگوں کو جہاز پر آنے سے منع کر دیا تھا اور کسی طرح کی امداد قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے اپنی کشتی نیچے اتارنے کا حکم دیا۔ اس نے کچھ ملاحوں کو دو لنگر جہاز سے دور لے جا کر ڈالنے کی ہدایت کی۔ یہ جہاز کی عقبی جانب مضبوط زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ انجینئر کو اس نے حکم دیا کہ وہ بھاپ آخری حد تک جہاں سرخ نشان تھا، بڑھا دے کیونکہ وہ ہر حال میں یہاں سے نکلنا اور اپنے سفر پر روانہ ہونا چاہتا تھا۔

اس ساری کارروائی کے دوران وہ بے چینی سے کبھی اوپر عرشے پر جاتا اور کبھی نیچے اتر تا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے وسکی کے گھونٹ بھر کر اپنا ذہنی تناؤ کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری کی بلی جیسی آنکھیں برابر اس کا طواف کر رہی تھیں۔ اس نے ایک دوبار اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

آخر کار دونوں لنگر ڈال دیے گئے۔ مشین دوبارہ حرکت میں آئی، زنجیریں اور رسے کھینچ دیے گئے مگر جہاز نے اپنی جگہ سے ایک انچ حرکت بھی نہیں کی بلکہ ہر کوشش کے بعد جہاز ریت میں مزید دھنستا چلا گیا۔

ساحل پر لوگوں کے ہجوم میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جہاز کے اردگرد جمع کشتیوں کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔ ملاح ایک دوسرے کی کشتیوں کو ٹھوکریں مارتے ہوئے چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے اور آپس میں ٹھٹھے کر رہے تھے۔ انہیں خصوصی طور پر اس بات میں دلچسپی تھی کہ جہاز میں کس قسم کا مال لدا ہوا تھا۔ کپاس اور لوہا ہوتا تو انہیں اسے محفوظ مقام تک لے جانے کی زیادہ مزدوری ملنے کی امید تھی۔ وہ اندازہ لگا رہے تھے کہ کپاس یا لوہا ہی ہو گا۔ کوئلہ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اسے ساحل پر اتارنے والی کوئی مشین نظر نہیں آ رہی تھی۔

ان کشتیوں سے کچھ دور چھ چپوؤں والی ایک کشتی پانی میں کھڑی تھی۔ اس پر کمشنر سوار تھا۔ وہ بھاری جسم کا ایک بارعب شخص تھا۔ وہ پر وقار

انداز میں کھڑا اس سارے منظر کو بظاہر بے توجہی اور عدم دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ حقیقت میں اس سے زیادہ کسی شخص کو اس معاملے میں دلچسپی نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ...... محض اپنی وہاں موجودگی کے باوصف...... اسے قانونی طور پر یہ حق حاصل تھا کہ وہ اس رقم کا ڈیڑھ فیصد حصہ وصول کرے جو جہاز کو وہاں سے نکالنے کی صورت میں سالویج کمپنی کو حاصل ہونا تھا۔

کسٹم آفیسر، جو درمیانے قد کا فربہ اندام شخص تھا، ایک اور کشتی میں اس کے قریب پہنچا اور اسے سلیوٹ کیا۔ اس نے سنہری فریم کا چشمہ پہن رکھا تھا اور دھوپ میں اس کی سرخ داڑھی چمک رہی تھی۔

"تمہاری کیا رائے ہوگی آفیسر؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا "اگر دن کے درمیانی حصے میں، ایسے موسم میں تمہیں سمندر میں کشتی لے جانی پڑے اور معلوم ہو کہ سب بے فائدہ رہا......!"

کمشنر نے کچھ ایسے انداز میں کندھے اچکائے جنہیں کوئی معانی بھی پہنائے جا سکتے تھے۔

"میرا خیال ہے اس میں کوئلہ لدا ہوا ہے۔" اس نے مزید کہا۔ "لوگ یہی کہہ رہے ہیں۔"

"خدا جانے!" کمشنر نے مسکنت بھرے لہجے میں کہا اور جہاز کی سمت دیکھتے ہوئے بولا "یہ دیکھنے میں کوئے کا اسٹیمر لگتا ہے...... برطانوی اسٹیمر"

کسٹم آفیسر دوبارہ ہنسا۔

"برطانوی اور ایسا سخت اور بہترین جیسا برطانوی گائے کا گوشت! ویسے آفیسر تم اس کی کوئی توجیہ پیش کر سکتے ہو کہ وہ کپتان اب تک کیوں اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ اس طرح باہر نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا؟"

"ہوسکتا ہے...... کہ اب بھی وہ کامیاب ہو جائے۔" کمشنر نے قدرے ہمدردانہ لہجے میں کہا، البتہ اس کے ہونٹوں کے کپکپاتے گوشے اس کی اندرونی بے چینی دکھاتے ہوئے، اس ہمدردی کی نفی کر رہے تھے۔

"معاف کیجئے گا صاحبان، کیا یہ درست ہے کہ سالویج کمپنی کے کرین والے اسٹیمر کو یہاں پہنچنے کے لئے تار بھیجا گیا ہے؟" ایک شخص نے استفسار کیا۔ وہ ریشمی کپڑے کا گرے ہیٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے چار تجربہ کار ملاحوں سمیت ایک کشتی کرائے پر حاصل کی تھی اور اب جذبات سے مغلوب، کپکپاتے جسم کے ساتھ، کشتی میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ میں اس نے جاسوسوں جیسی عینک پکڑ رکھی تھی۔ "کیا واقعی، جیسا کہ مجھے کسی نے بتایا ہے، تھوڑی دیر میں اسٹیمر یہاں پہنچنے والا ہے؟"

"ہاں، ہوسکتا ہے چند منٹ بعد اسٹیمر یہاں پہنچ جائے۔" کمشنر نے مشرق کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ جزیرہ نما کی جنوبی سمت سے چھوٹے سائز کا کرین بردار اسٹیمر آتا دکھائی دیا۔ کمشنر نے اپنے ملاحوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے فوراً چپو پانی میں اتارے۔ چند منٹوں بعد کشتی برطانوی جہاز کے قریب پہنچ گئی۔

کمشنر نے نائب سے اپنا تعارف کروایا اور اس سے پوچھا کہ کیا انہیں کسی قسم کی مدد درکار ہے؟ نائب نے اوپر کپتان کی طرف دیکھا جو کیبن میں بیٹھا تھا اور کمشنر کی پیشکش دہرائی۔ کیپٹن چارلس نے، جس نے اپنے کیبن سے کرین بردار اسٹیمر کو کچھ فاصلے پر ٹھہرتے اور لنگر پھینکتے دیکھ لیا

تھا، اپنے دانت بھینچ کر جواب دیا:

"نہیں! ہمیں کسی طرح کی مدد درکار نہیں۔"

نائب کو اس کا جواب قبول کرنے میں قدرے تامل ہوا۔ وسکی کی ایک بوتل کیپٹن کے سامنے پڑی تھی اور وہ تیسرا گلاس خالی کر چکا تھا۔ کمشنر نے اسکا جواب پا کر کشتی موڑنے کا حکم دیا اور ساحل کی طرف روانہ ہوا۔ چند گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ ہجوم بڑھتا گیا۔ عورتیں اپنے خاوندوں کے لئے کھانا لے کر ریت کے ٹیلے پر پہنچ گئیں۔ وسکی کی بوتلیں لنڈھائی جا رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سب جشن کے موڈ میں ہیں۔

غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے سمندر کی سطح میں یکا یک تلاطم محسوس ہونے لگا اور وہ کشتیاں جو ہنوز جہاز کے گرد کھڑی تھیں آپس میں ٹکرانے لگیں۔ اگرچہ بادلوں کا کہیں نشان تک نہ تھا مگر سورج عجیب انداز میں دھندلا ہو گیا تھا اور افق کی جانب سمندر کی سطح بلند نظر آ رہی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد سمندر اتنا شوریدہ سر ہو گیا کہ بپھری ہوئی لہروں کے غضب سے بچنے کیلئے ملاحوں کو اپنی کشتیاں ساحل پر لے جانا پڑیں۔ انہوں نے کشتیاں ساحل پر لے جا کر محفوظ طریقے سے باندھ دیں۔ اب آسمان بادلوں سے ڈھک چکا تھا اور طوفانی ہوا کی شدت اس قدر زیادہ تھی کہ جہاز کی پوزیشن خطرناک ہو گئی۔ ریت میں پھنسے پھنسے اس کی چوڑی سمت سمندر کی جانب ہو گئی تھی اور لہریں مہیب تھپیڑوں کے ساتھ اس کی آہنی دیوار سے وحشیانہ انداز میں ٹکرا رہی تھیں۔ انہوں نے دفعتاً نوٹ کیا کہ جہاز کے عرشے پر افراتفری کا سماں ہے۔ ملاح ادھر سے ادھر بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ ایک کشتی نیچے لٹکائی جا رہی تھی اور لنگر کی زنجیر گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ جہاز کو اس مصیبت سے نکالنے کے لئے آخری فیصلہ کن کوشش کی جانے والی ہے۔ جہاز کی چمنی سے سیاہ دھوئیں کے بادل مرغولوں کی صورت میں برآمد ہو رہے تھے اور عملے نے تن دہی سے کام شروع کر دیا تھا۔ انجن شور مچا رہے تھے۔

اور پھر جہاز کے انجن ایک دم بند ہو گئے۔ کئی منٹ کے وقفے کے بعد جب اندھیرا تیزی سے پھیلتا دکھائی دے رہا تھا، مایوسی کی علامت زرد جھنڈا آہستہ آہستہ چڑھایا گیا جس نے تیز ہوا کے دوش پر لہراتے ہوئے گویا عملے کی شکست کا اعلان کیا۔ ساتھ ہی بھاپ کے وسل نے بیٹھی ہوئی، بلند آواز میں مدد مانگنے کا سگنل دیا۔

"اب وہ مدد کے لئے پکار رہا ہے!" وہ سب ہنستے ہوئے ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ضلع کی آٹھ ملاحوں والی کشتی ساحل پر پہنچ چکی تھی۔ اسے سمندر میں اتارا گیا۔ کمشنر اور ضلع اتارنی جنہوں نے ہنگامی مدد کی شرائط طے کرنا تھیں، کشتی میں سوار ہو گئے۔ ان کے ساتھ سیاہ کوٹ میں ملبوس ایک پستہ قد شخص بھی تھا جس نے اپنا سرخ ہیٹ بائیں ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ یہ سالویج کمپنی کا ایجنٹ تھا جو اس وقت اسٹیمر سے ساحل پر اترا گیا تھا جب کمشنر نے پہلے پہل جہاز کے کیپٹن سے مدد فراہم کرنے کی بات کی تھی اور اس یقین کے ساتھ ساحل پر رہا تھا کہ آخر کار مصیبت زدہ جہاز کا کیپٹن مدد کا طلب گار ضرور ہوگا۔

اگرچہ سمندر بپھرا ہوا تھا مگر کشتی کے مشاق عملے نے انہیں باسہولت جہاز کے پاس پہنچا دیا۔ نائب نے تینوں افراد کا جہاز پر استقبال کیا اور انہیں عرشے کے نیچے پی آفیسرز میس میں لے گیا۔ وہاں کیپٹن چارلس پہلے سے موجود تھا۔ وہ نشے کے زیر اثر نظر آتا تھا اور اس نے لمبی میز کے پیچھے

کرسی سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ میز پر ایک لالٹین روشن تھی، جس کی روشنی، ٹین کی، پالش شدہ دیوار سے ٹکرا کر منعکس ہو رہی تھی اور میز کے اردگرد ساری جگہ کو روشنی بخش رہی تھی۔ باقی کمرے میں سبزی مائل اندھیرا تھا۔

کیپٹن نے تینوں اجنبی افراد سے بغیر کسی خیر مقدمی جملے کے سیدھے سبھاؤ سوال کیا:

"کتنا خرچ آئے گا؟"

سالویج کمپنی کے ایجنٹ نے جہاز کے مال برداری کے کاغذات دیکھنے کی اجازت طلب کی۔ جب کاغذات لائے گئے تو اس نے کارگو کی قیمت، جہاز کی گنجائش اور اس کی حالت کا تعین کرنے کے بعد کچھ حساب لگایا اور بولا:

"چھ ہزار پونڈ"

کیپٹن چارلس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے حیرت کے دھچکے نے اس کا سارا نشہ ہرن کر دیا ہو، مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا اور اس کے نیلاہٹ زدہ سفید ہونٹوں پر، مایوسی سے آلودہ، ایک پروقار مسکراہٹ ابھری۔

"اچھا تو یوں ہے۔" اس نے جیسے ان سے نہیں، اپنے آپ سے کہا۔

ماحول پر چند منٹوں کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ سمندر کی لہریں جہاز کی آہنی دیوار سے ٹکرا رہی تھیں۔ کیپٹن کے عین عقب میں ان کے ٹکراؤ سے اس تنگ کمرے میں مہیب اور عجیب ڈراؤنی آوازیں آ رہی تھیں۔ نوجوان اناڑی جو ایسے بھیانک مناظر دیکھنے کا عادی نہیں تھا، سہما ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد سے زرد تر ہوتا جا رہا تھا اور وہ مسلسل دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کے سروں پر، عرشے پر چلنے والے ملاحوں کے بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دے رہی تھی۔

"چار ہزار پونڈ" بالآخر کیپٹن نے زبان کھولی۔

ایجنٹ نے انکار میں کندھے اچکائے "ناممکن"

کمشنر نے جس کے فرائض میں یہ بات شامل تھی کہ وہ کیپٹن کی معاونت کرے اور جہاز کے مفادات کا خیال رکھے، معاملہ طے کرانے کی کوشش کی مگر چونکہ اسے علم تھا کہ سالویج کمپنی کبھی بھی اپنے تخمینے کو بدلنے پر تیار نہیں ہوتی، اور یہ بات بھی اہم اور اس کے اپنے مفاد میں تھی کہ معاوضے کی رقم زیادہ سے زیادہ رہے اس لیے اس نے ہمدردانہ لہجے میں سادہ ترین انگریزی میں کیپٹن کو سمجھانے کی کوشش کی:

"جہاز کو درپیش خطرہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس لئے آپ کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ آپ سالویج کمپنی کا تخمینہ قبول کر لیں۔"

ایجنٹ نے سر ہلا کر کمشنر کی تائید کی اور مزید کہا کہ اگر ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کے لگائے ہوئے تخمینے کے مطابق رضامندی کا اظہار نہ کیا گیا تو اس کے لئے رات کے وقت بپھرے ہوئے سمندر میں اپنا اسٹیمر روکے رکھنا ممکن نہ ہوگا۔ وہ اپنا اسٹیمر واپس لے جائے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس نے جو ہمدردانہ اور رعایتی پیشکش کی ہے وہ بہت محدود مدت کے لئے ہے۔

کیپٹن چارلس اب بھی خاموش تھا۔ اس نے اپنا بھاری بازو میز پر رکھا ہوا تھا اور معاملہ فہم نگاہوں سے آہستگی سے باری باری، سر ہلاتے

ہوئے تینوں افراد کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنے نائب کی طرف دیکھا جو اس کی طرف سے بطور گواہ اس جگہ موجود تھا۔

''کاغذ قلم لاؤ۔'' کیپٹن نے بالآخر اسے ہدایت کی اور یک لخت تھکا تھکا دکھائی دینے لگا۔

چند گھنٹوں بعد ''نوبراورز'' ریت سے نکل کر آرام دہ حالت میں گہرے سمندر میں کھڑا تھا۔ سیاہ طوفانی رات میں، جب ابھی ساحل کے کنارے آباد کالونی کی ہر کھڑکی سے روشنی پھوٹ رہی تھی اور لوگ سالویج سے حاصل ہونے والی مزدوری کے پیسوں سے ریستورانوں میں مزے اُڑا رہے تھے اور شراب خانے خوشی سے مغلوب لوگوں سے بھرے ہوئے تھے، غیر ملکی جہاز مشرق کی سمت اپنے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

دیارِ غیر میں

امریکہ کے عالمی شہرت یافتہ کہانی کار اور ناول نگار ارنسٹ ہمنگوے کی تاریخ پیدائش 12 جولائی 1899ء ہے۔ ان کے والد کا نام ڈاکٹر ایڈمنڈ کلیئرنس تھا۔ ہمنگوے زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ انہوں نے 1917ء میں ہائی اسکول کی سند حاصل کی۔ وہ اونچے قد کے جسیم نوجوان تھے۔ انہیں باکسنگ، فٹ بال، شکار اور مہم جوئی سے رغبت تھی۔ قدرت نے انہیں بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں بھی عطا کی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم چھڑی تو والد کی مرضی کے خلاف فوج میں شمولیت کے لئے جا پہنچے مگر کسی کوتاہی کے سبب مسترد کیے گئے اور ریڈ کراس ایمبولینس کے دستے کے ساتھ اٹلی کے محاذ پر پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے انسانوں کی درندگی کے بدترین مظاہر دیکھے۔ انہیں ادھڑی ہوئی لاشوں اور جلے ہوئے گوشت کے لوتھڑوں کو محاذ سے اسپتال پہنچانے کا دل سوز فریضہ سرانجام دینا پڑا۔ فرائض کی بجا آوری کے دوران مشین گن کی گولیوں سے زخمی ہوئے تو ایمبولینس ڈرائیور کی ڈیوٹی سے دست بردار ہونا پڑا۔ دوران علاج ایک خوبرو نرس کے عشق میں گرفتار ہو گئے مگر اسے رومانیہ کا ایک افسر لے اڑا۔ 1919ء میں امریکہ واپس آئے اور کینیڈا کے اخبار "ٹورنٹو سٹار" میں بطور نامہ نگار اور فری لانس صحافی کام کرنے لگے۔ ان تمام مصروفیات کے دوران افسانہ نگاری اور ناول نویسی کا شغل بھی جاری رکھا۔ ارنسٹ ہمنگوے نے چار خواتین سے شادیاں کیں جن سے ان کے تین بیٹے تولد ہوئے۔ ان کے 12 ناول اور کہانیوں کے 12 مجموعے شائع ہوئے۔ متفرق موضوعات پر 9 کتابوں کے خالق ہیں۔ ان کی کئی کہانیوں اور ناولوں پر فلمیں بنیں جن میں "سنوز آف کالی من جارو"، "اے فیئرویل ٹو آرمز" اور "اولڈ مین اینڈ دی سی" قابل ذکر ہیں۔ وہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا گہرا شعور رکھنے والے ادیب تھے۔ جیمز جوائس نے ہمنگوے کے بارے میں ایک مرتبہ کہا تھا: "اس نے زندگی اور ادب کے درمیان حائل پردے کو کم کر دیا ہے جس کی کوشش ہر تخلیق کار کرتا ہے۔ کیا آپ نے "صاف اور روشن جگہ" پڑھی ہے؟...... یہ ایک شاہکار ہے۔ بلاشبہ یہ لکھی گئی کہانیوں میں سے ایک بہترین کہانی ہے۔"

وہ حقیقت نگار تھے مگر رومانویت کو کلی طور پر رد نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی تحریروں میں ایسے مثبت کردار بطور ہیرو پیش کرتے ہیں جو فطرتاً مہم جو ہیں اور خطرات سے کھیلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اپنے ناولوں میں انہوں نے انسانوں کو بڑے شاندار انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے بیانیے میں بظاہر سادگی اور کفایت لفظی ہے مگر اس سہل انداز تحریر کی نقل کرنا آسان نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے انداز سے ملکی اور غیر ملکی افسانہ نگاروں کی بڑی تعداد کو متاثر کیا ہے۔ ان کی ادبی صلاحیتوں کے اعتراف میں انہیں 1953ء میں پولٹزر پرائز اور 1954ء میں ادب کا نوبل انعام عطا کیا گیا۔ مگر وہ شدید علالت کے باعث انعام وصول کرنے سویڈش اکیڈمی، سٹاک ہوم نہ جا سکے۔ بدقسمتی سے وہ شکاری مہمات کے دوران دو بار زخمی ہوئے تھے۔ دایاں کندھا، بازو اور بائیں ٹانگ متاثر ہوئی۔ بائیں کان کی سماعت اور بائیں آنکھ کی بینائی بھی عارضی طور پر جاتی رہی۔ ایک بار آتش زدگی کے سبب چہرہ جھلس گیا۔ ہمنگوے نے 62 برس کی عمر میں سر پر شاٹ گن کا فائر کر کے خودکشی کا ارتکاب کیا تھا۔ خودکشی کی تاریخ 2 جولائی 1961ء ہے۔

☆......☆......☆

موسم خزاں میں جنگ ہنوز جاری تھی مگر ہم اس میں حصہ نہیں لے رہے تھے۔ میلان میں شدید سردی تھی اور اندھیرا جلدی پھیلنے لگتا تھا۔ جب برقی قمقمے جلتے تو سڑکوں کے کنارے روشن کھڑکیاں دیکھنا اچھا لگتا۔ دکانوں پر بڑی رونق نظر آتی۔ لومڑیوں کی کھال میں برف کے ذرے اٹکے دکھائی دیتے اور ان کی دُمیں ہوا میں لہراتیں۔ بھوکے ہرن بظاہر بھاری معلوم ہوتے۔ فضا میں محو پرواز پرندوں کے پروں کو ہوا موڑنے لگتی۔ بہت سرد خزاں تھی اور پہاڑوں کی سمت سے یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔

ہر سہ پہر ہمیں اسپتال جانا پڑتا تھا۔ وہاں جانے کے لئے شہر کے اندر سے کئی راستے تھے۔ نہر کے ساتھ دو راستے تھے مگر وہ طویل تھے۔ اسپتال کسی بھی راستے سے جائیں نہر کو ضرور پار کرنا پڑتا۔ اس پر تین پل تھے۔ ان میں سے ایک پر مکئی کے دانے بیچنے والی عورت بیٹھی تھی۔ ہمیں اس کے چولہے کے قریب کھڑا ہونا بہت اچھا لگتا۔ گرم گرم دانے جیب میں ڈال کر چلتے ہوئے خوشگواری کا احساس ہوتا۔ اسپتال بہت پرانا اور قابل دید تھا۔ صدر دروازے سے داخل ہوں تو سامنے وسیع احاطہ تھا۔ باہر نکلنے کا راستہ عقبی جانب تھا۔ احاطے میں سے اکثر جنازے نکلتے نظر آتے۔ پرانی عمارت سے پرے اینٹوں سے بنے نئے کمرے تھے۔ جہاں ہم ہر سہ پہر ملتے۔ درپیش صورتحال نے ہمیں نرم خو بنا دیا تھا اور ہم بڑے انہماک اور دلچسپی سے ان مشینوں کو استعمال کرتے جن کے بارے میں کہا گیا تھا کہ بہت فرق ڈالیں گی۔

ڈاکٹر اس مشین کی طرف بڑھا جہاں میں بیٹھا تھا اور پوچھنے لگا:

"جنگ سے پہلے تمہیں کس چیز میں بہت دلچسپی تھی؟ کیا تم کوئی کھیل کھیلنا پسند کرتے تھے؟"

"ہاں۔ فٹ بال۔" میں نے جواب دیا۔

"شاباش۔" وہ مسکرایا "تم دوبارہ فٹ بال کھیلنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ پہلے سے بھی بہتر کھیلا کرو گے۔"

میرا گھٹنا مڑتا نہیں تھا۔ ٹخنے سے گھٹنے کے جوڑ تک تکلیف تھی۔ جس کے سبب ٹانگ سیدھی رکھنا پڑتی۔ مشین کے ذریعے میرے گھٹنے کو آہستہ آہستہ موڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی، جیسے سائیکل چلاتے ہوئے موڑا جاتا ہے۔ ابھی تک تو یہ اسی حالت میں تھا۔ تاہم ڈاکٹر روزانہ مجھے تسلی دیتا:

"فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم جوان اور خوش قسمت ہو۔ تم دوبارہ ایک چیمپئن کی طرح کھیل سکو گے۔"

میرے پہلو میں رکھی مشین ایک میجر صاحب کے زیر استعمال تھی۔ ان کا ہاتھ چھوٹا سا تھا جیسے بچوں کا ہوتا ہے۔ اسے دو چرمی پٹیوں میں باندھا جاتا تھا جو اس کی اکڑی ہوئی انگلیوں کو اوپر نیچے حرکت دیتیں۔ جب ڈاکٹر ان کے ہاتھ کا معائنہ کرنے لگا تو انہوں نے مجھے آنکھ ماری اور ڈاکٹر سے پوچھنے لگے:

"اور کیا میں بھی فٹ بال کھیلوں گا کپتان صاحب؟"

وہ ایک بہترین تلوار باز رہ چکے تھے اور جنگ سے پہلے اٹلی کے سب سے عظیم تلوار باز تھے۔ ڈاکٹر ملحقہ کمرے میں واقع اپنے دفتر میں گیا اور ایک تصویر اٹھا لایا۔ اس میں ایک ایسا ہی ہاتھ نظر آ رہا تھا جیسا میجر صاحب کا تھا۔ دوسری تصویر میں جو مشین کے متواتر استعمال کے بعد اتاری گئی تھی، وہ ہاتھ پہلے کی نسبت بڑا لگ رہا تھا۔ میجر صاحب نے اپنے درست ہاتھ میں تصویر پکڑی اور اسے غور سے دیکھا۔

''زخم؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''صنعتی حادثہ'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''بہت دلچسپ۔ بہت دلچسپ۔'' میجر صاحب نے تصویر ڈاکٹر کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

''اب یقین آیا ہے؟''

''نہیں'' میجر نے جواب دیا۔

ہمارے علاوہ تین نوجوان روزانہ وہاں آتے تھے۔ وہ میرے ہم عمر تھے۔ تینوں کا تعلق میلان ہی سے تھا۔ ان میں سے ایک وکالت کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ایک پینٹر بننا چاہتا تھا جبکہ ایک کا ارادہ فوج میں بھرتی ہونے کا تھا۔ جب ہم ورزش سے فراغت پاتے تو بسا اوقات ہم کیفے کووا میں جا بیٹھتے۔ یہ سکالا سے متصل تھا۔ جب ہم چاروں اکٹھے ہوتے تو مختصر راستہ اختیار کرتے جو کمیونسٹوں کی آبادی کے اندر سے گزرتا تھا۔ لوگ ہم سے نفرت کرتے تھے کیونکہ ہم آفیسر تھے۔ بعض اوقات دکانوں کے اندر سے ہم پر پھبتیاں کسی جاتیں۔ ایک اور نوجوان بھی کبھی کبھار ہمارے ساتھ ہوتا۔ وہ اپنے چہرے کو ایک ریشمی نقاب سے چھپائے رکھتا تھا۔ اس کی ناک کٹی ہوئی تھی جس کی پلاسٹک سرجری ہونا تھی۔ ملٹری اکیڈمی سے اسے سیدھا محاذ پر بھیج دیا گیا تھا جہاں وہ پہلے ہی گھنٹے میں شدید زخمی ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے اس کا چہرہ از سر نو درست کیا مگر ناک ٹھیک نہیں بن رہی تھی۔ وہ ایک پرانے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جن کی ناک مخصوص طرز کی ہوتی ہے۔ پھر ایک روز وہ جنوبی امریکہ چلا گیا جہاں اسے کسی بینک میں ملازمت مل گئی تھی۔ لیکن یہ پرانی بات ہے۔ تب ہم میں سے کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ مستقبل میں کیا ہوگا۔ ہمیں صرف یہ پتا تھا کہ جنگ جاری ہے اور جاری رہے گی۔

ہم سب کے سینے پر تقریباً ایک جیسے تمغے سجے ہوئے تھے۔ سوائے نقاب پوش نوجوان کے۔ وہ محاذ پر رہا ہی کتنی دیر تھا کہ اسے تمغہ ملتا۔ وہ زرد رو قد آور نوجوان جو وکیل بننا چاہتا تھا اردیتی میں لیفٹیننٹ رہا تھا۔ اس کے سینے پر ہمارے ایک تمغے سے مشابہہ تین تمغے سجے ہوئے تھے۔ اس نے موت کے سائے میں لمبا عرصہ گزارا تھا اور قدرے الگ سا نظر آتا تھا۔ ویسے تو ہم بھی ایسے تھے اگر کوئی قدر مشترک تھی تو یہی کہ ہم ہر سہ پہر اسپتال میں اکٹھے ہوتے تھے۔ ہم جب عداوت رکھنے والوں کی آبادی سے اندھیرے راستے پر چلتے ہوئے کووا کی جانب بڑھتے تو شراب خانوں سے چھن کر باہر آتی روشنی میں عورتوں اور مردوں کے ہجوم سے ہمیں بڑی گھبراہٹ ہوتی۔ ہم ان کے درمیان کسی انجانے خوف اور عدم تحفظ کے احساس کے تحت ایک دوسرے سے جڑ کر چلتے۔ کھوے سے کھوا چھلتا۔ ہماری اندرونی کیفیات سے وہ لوگ جو ہمیں ناپسند کرتے تھے، آگاہ نہ ہو پاتے۔

ہمیں کووا بہت پسند تھا جس کا اندرونی درجہ حرارت خوشگوار رہتا۔ اندر روشنی مناسب سی ہوتی۔ بعض اوقات سگریٹوں کا دھواں اور شور ضرور ہوتا تھا۔ میزوں پر لڑکیاں اور دیوار گیر ریک میں سلیقے سے رکھے رنگین تصویروں سے مزین اخبارات ہمیں بہت اچھے لگتے۔ کووا کی ویٹرس لڑکیاں بہت محب وطن تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اٹلی میں سب سے زیادہ محب وطن ہوٹلوں اور چائے خانوں کی ویٹرس لڑکیاں ہیں۔ اور مجھے پختہ یقین ہے کہ اب بھی یہی صورتحال ہوگی۔

پہلے پہل نوجوان میرے سینے پر سجے تمغوں کے بارے میں بہت متجسس تھے۔ وہ مجھ سے استفسار کرتے کہ میں نے انہیں حاصل کرنے

کیلئے کیا کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ میں نے انہیں وہ کاغذات دکھائے جن پر بہت خوبصورت انداز میں تعریفی کلمات لکھے تھے مگر ہر سطر سے یہ حقیقت ٹپکتی تھی کہ مجھے محض اس لئے تمغوں کا مستحق سمجھا گیا کہ میں ایک امریکی تھا۔ اس کے بعد میرے ساتھ ان کا رویہ خاصا بدل گیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ میں مخالفوں کے مقابلے میں بہر حال ان کا ساتھی تھا۔ میں ان کا دوست تھا مگر سچی بات یہی ہے کہ تعریفی اسناد پڑھنے کے بعد وہ مجھے اپنا نہیں سمجھتے تھے کیونکہ انہیں اپنے تمغے کمانے کیلئے مختلف حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ میں زخمی ضرور ہوا تھا۔ مگر سب جانتے تھے کہ میرا زخمی ہونا تو ایک حادثاتی امر تھا۔ مگر مجھے اپنے تمغوں پر شرمندگی کا احساس نہیں ہوتا تھا بلکہ مے نوشی کے بعد مجھے یہی خیال آتا کہ میں نے بھی ان کی طرح بہادری اور دلیری دکھا کر تمغے حاصل کیے تھے۔ مگر جب اندھیرے سنسان راستے سے گزر کر میں سرد ہوا کے تھپیڑوں سے بچتا، سٹریٹ لائٹ کے قریب ہونے کی کوشش کرتا ہوا اپنے ٹھکانے کا رخ کرتا تو انجانے خوف کا احساس دامن گیر رہتا۔ رات کو بستر پر لیٹے لیٹے میں موت کے ڈر سے لرز اٹھتا اور یہ سوچ میرے ذہن میں گردش کرنے لگتی کہ اگر دوبارہ محاذ پر بھیج دیا گیا تو میرا کیا بنے گا۔

تینوں تمغہ یافتہ نوجوان شاہین صفت تھے۔ میرے اندر شاہینوں والی ایک صفت بھی نہیں تھی۔ وہ الگ بات کہ دیکھنے میں میں ان لوگوں کو شکاری عقاب ہی نظر آتا ہوں گا جنہوں نے کبھی شکار نہ کیا ہو۔ وہ تینوں حقیقت حال سے باخبر تھے اس لئے ہم میں فاصلہ بڑھنے لگا۔ لیکن اس نوجوان سے میری اچھی دوستی رہی جو محاذ پر جاتے ہی زخمی ہو گیا تھا۔ اگر وہ محاذ پر رہتا تو جرأت و بہادری کے حوالے سے کیا کرتا اس کا علم کسی کو نہیں تھا۔ اس لئے وہ اسے بھی درخوراعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ تاہم میں اسے پسند کرتا تھا کیونکہ میرا یہی اندازہ تھا کہ میری طرح اس میں بھی عقابوں والی کوئی بات نہیں۔

میجر صاحب جو تلوار باز رہے تھے بہادری پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ جب ہم مشینوں پر ورزش کر رہے ہوتے تو ان کا زیادہ وقت میری گرامر ٹھیک کرنے میں گزرتا۔ انہوں نے میری اطالوی زبان بولنے کی صلاحیت کی بہت تعریف کی تھی۔ ہم آسانی سے آپس میں بات چیت کر لیتے تھے۔ ایک دن میں نے کہا کہ مجھے اطالوی زبان اتنی سہل لگتی ہے کہ میں اسے سیکھنے کے لئے مزید کوشش اور دلچسپی درست نہیں سمجھتا۔

''صحیح کہہ رہے ہو......'' میجر صاحب نے کہا۔ ''کیوں نہ اب تمہیں گرامر سکھائی جائے؟''

اور جب میں نے حامی بھری اور گرامر کے مطابق اطالوی بولنے کی مشق شروع کی تو مجھے اطالوی دنیا کی سب سے مشکل زبان لگنے لگی! پھر جب تک میری گرامر سیدھی نہیں ہوئی مجھے میجر صاحب سے اطالوی میں بات کرتے ہوئے ڈر سا لگتا۔

میجر صاحب اسپتال بہت باقاعدگی سے آتے تھے۔ شاید ہی کبھی ناغہ کیا ہو۔ مگر مجھے علم ہے انہیں ان مشینوں پر بالکل اعتماد نہ تھا۔ ایک وقت ایسا تھا جب ہم میں سے کسی کو بھی ان مشینوں پر اعتماد نہ تھا اور میجر صاحب نے صاف کہا تھا کہ یہ سب بکواس ہے۔ تب مشینیں نئی تھیں اور ہم ہی نے ان کی افادیت ثابت کرنا تھی۔

''یہ خیال ہی مضحکہ خیز ہے۔'' انہوں نے کہا ''محض ایک خیالی نظریہ...... دیگر بہت سے نظریات کی طرح۔''

میں گرامر نہیں سیکھ پا رہا تھا جس کے سبب وہ مجھے ملامت کرتے کہ میں نرا جاہل ہوں، ایک نالائق شاگرد۔ وہ خواہ مخواہ مجھ پر احمقوں کی طرح وقت ضائع کرتے رہے۔ وہ قدرے پستہ قد تھے اور کرسی پر ایستادہ حالت میں بیٹھتے تھے۔ اپنا ہاتھ مشین میں مطلوبہ جگہ رکھنے کے بعد وہ سامنے

دیوار پر نظریں جما کر کسی سوچ میں گم ہو جاتے اور چرمی پٹیوں میں بندھا ہوا ان کا ہاتھ میکانکی انداز میں اوپر نیچے حرکت کرتا رہتا۔

"جب جنگ ختم ہو جائے گی، اگر واقعی ہوگئی، تو تم کیا کام کرو گے؟" ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا "جواب گرامر کے مطابق دینا......!"

"میں واپس امریکہ جاؤں گا۔"

"کیا تم شادی شدہ ہو؟"

"نہیں۔ مگر امید ہے جلد ہی شادی ہو جائے گی۔"

"تم واقعی چغد ہو" انہوں نے تبصرہ کیا۔ مجھے ان کے لہجے میں ناراضی محسوس ہوئی۔ "آدمی کو شادی ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔"

"کیوں سینور میگورے؟"

"مجھے سینور میگورے مت کہو۔"

"آدمی کو شادی کیوں نہیں کرنی چاہیے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں کرنی چاہیے۔ ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔" انہوں نے تلخ اور رنجیدہ ہو کر دہرایا۔ "اگر آدمی نے سب کچھ کھونا ہے تو اسے خود کو ایسی صورتحال میں ڈالنا ہی نہیں چاہیے۔ اسے صرف ان چیزوں کی تمنا کرنی چاہیے جن کے کھونے کا ڈر نہ ہو۔"

وہ اس وقت رنج واندوہ کی تصویر بنے ہوئے تھے اور سامنے دیوار کو گھور رہے تھے۔

"یہ لازم تو نہیں کہ وہ انہیں کھوئے؟"

"لازم ہے، لازم ہے!" انہوں نے دیوار پر نظریں گاڑھے ہوئے کہا۔ پھر انہوں نے اپنا ہاتھ چرمی پٹیوں کی گرفت سے آزاد کیا اور اسے اپنی ران پر مارتے ہوئے تقریباً چیخ کر کہا:

"وہ اسے کھو کر رہے گا۔ مجھ سے بحث مت کرو!" پھر انہوں نے نگران کو بلایا اور بولے "اگر اس منحوس شے کو بند کر سکو......"

پھر وہ ملحقہ کمرے میں ہلکے علاج اور مالش کے لئے چلے گئے۔ میں نے سنا وہ ڈاکٹر سے اس کا فون استعمال کرنے کی اجازت طلب کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔ جب وہ واپس لوٹے تو میں دوسری مشین پر ورزش کر رہا تھا۔ انہوں نے ٹوپی پہن کر میری طرف قدم بڑھائے اور اپنا تندرست ہاتھ میرے کندھے پر رکھتے ہوئے اُداس لہجے میں کہا۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔ میں اتنا ترش رو نہیں۔ دراصل میری اہلیہ فوت ہوگئی ہیں۔ مجھے معاف کر دو۔" انہوں نے میرا کندھا تھپتھپایا۔

"اوہ......!" میں نے جذبۂ ترحم سے مغلوب ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

"مجھے یہ سن کر افسوس ہوا ہے۔"

وہ میرے قریب کھڑے ہو کر دل گرفتگی کے عالم میں اپنا نچلا ہونٹ چبانے لگے۔ "بہت مشکل ہے۔ یہ صدمہ سہنا میرے لئے آسان

نہیں۔'' انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ کھڑکی سے باہر دور خلاء میں گھور رہے تھے۔ پھر وہ کراہنے لگے۔ میں نے دیکھا ان کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ لمحہ بھر میں انہوں نے نچلا ہونٹ بھینچ کر سر اونچا کیا، جسم سیدھا کر کے چھاتی نکالی اور نپے تلے قدموں سے سپاہیانہ انداز میں چلتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے۔

ڈاکٹر کی زبانی مجھے علم ہوا کہ میجر صاحب اپنی جواں سال بیوی سے بے حد محبت کرتے تھے۔ انہوں نے اس وقت تک شادی موخر کئے رکھی تھی جب تک انہیں طبی وجوہ کی بنیاد پر محاذ سے ہمیشہ کے لئے واپس نہ بلا لیا گیا۔ مگر تقدیر گھات میں تھی۔ ان کی بیوی چند روز نمونیا میں مبتلا رہ کر فوت ہو گئی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ یوں اچانک مر جائے گی۔

میجر صاحب تین دن اسپتال نہیں آئے۔ چوتھے روز جب وہ آئے تو انہوں نے وردی پہن رکھی تھی اور ایک بازو پر سیاہ پٹی باندھ رکھی تھی۔ میں نے دیوار پر بڑی بڑی فریم شدہ تصویریں آویزاں دیکھیں جن میں مختلف انسانی اعضاء کی مذکورہ مشینوں کے ذریعے علاج سے پہلے اور بعد کی حالت کی عکاسی کی گئی تھی۔ اس مشین کے عین سامنے جو میجر صاحب کے زیر استعمال تھی ایسے ہاتھوں کی تصویریں آویزاں کی گئی تھیں جو بھی ان کے ہاتھ کی طرح مجروح تھے۔ مگر پھر بالکل تندرست ہو گئے۔ پتا نہیں ڈاکٹر وہ تصویریں کہاں سے لے آیا تھا۔ جہاں تک مجھے علم تھا، ان مشینوں کو سب سے پہلے ہم ہی نے استعمال کیا تھا۔

تاہم ان تصویروں نے میجر صاحب پر کوئی اثر مرتب نہیں کیا کیونکہ وہ نم آلود آنکھوں سے مسلسل کھڑکی سے باہر دیکھتے رہتے تھے۔

☆......☆......☆

کابلی والا

رابندر ناتھ ٹیگور بنگالی زبان کے عظیم شاعر، کہانی کار، ناول نگار، ڈراما نویس، موسیقار، مصور، سیاستدان، مفکر اور ماہر تعلیم تھے۔ وہ ایک خاص طرز زندگی اختیار کرنے والی شخصیت تھے۔ انہیں رشی منی اور روحانی گرو کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ 7 مئی 1861ء کو مغربی بنگال کے شہر کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے سکول یا کالج سے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی۔ وسیع جاگیر کا مالک ہونے کی بناء پر انہیں روزی کمانے کے لئے کسی پیشے سے منسلک ہونے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ انہوں نے اپنی زندگی تخلیقی کام کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ بنگالی شعر وادب اور فنون میں انہوں نے گراں قدر اضافہ کیا۔ ان کی اہم تصانیف میں باغبان، گیتا نجلی، سادھنا اور کہانیوں، افسانوں اور نظموں کے متعدد مجموعے شامل ہیں۔ لیکن عالمی سطح پر ان کی نظموں کا مجموعہ گیتا نجلی انہیں شہرت دوام دلانے کا سبب بنا۔ ٹیگور نے ان نظموں میں عجیب نغمگی، اسرار اور فلسفہ حیات سمویا ہے۔ ان کی ساری شاعری حساسیت اور حسن وتازگی سے مزین ہے جو بنگالی شاعری میں ایک نئی چیز تھی۔ ان کا اسلوب جدا اور انوکھا ہے۔ ان کی شاعری کے اثرات بنگالی شاعری پر بہت گہرے ہیں مگر ان کے منفرد اسلوب کو آج تک ناقابل تقلید ہونے کی سند حاصل ہے۔

جہاں تک ان کی کہانی کاری کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں کسی رائے کا اظہار کرنے کی بجائے ان کی خوبصورت اور دل کو چھو لینے والی تخلیق "کابلی والا" کا مطالعہ کر لینا کافی ہے۔ جن کے سینے میں گداز دل ہے، وہی اس تحریر کی قدر وقیمت جان سکتے ہیں۔

1913ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کو ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ فقط دو برس بعد 1915ء میں انگریز سرکار نے ان کی ادبی، علمی اور شخصی عظمت کے اعتراف میں انہیں سر کا خطاب دیا۔

ان کی تاریخ وفات 7 اگست 1941ء ہے۔

☆......☆......☆

میری بیٹی منی تھی تو صرف پانچ برس کی مگر ایک لمحے کو بھی خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔ دنیا میں قدم رکھنے کے بعد صرف بارہ مہینے میں اس نے بات کرنا سیکھ لیا۔ پھر تو جب تک وہ جاگتی رہتی دم بھر کو اس کی زبان نہ رکتی۔ اس کی ماں کبھی کبھی ڈانٹ ڈپٹ کراسے چپ کرا دیتی مگر یہ مجھ سے کیوں کر ہوتا۔ میرے خیال میں منی کی خاموشی ایک غیر فطری بات تھی جسے میں زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکتا تھا۔ یوں میری اور اس کی پہروں دل کھول کر باتیں ہوا کرتیں۔ صبح کا وقت تھا۔ میں اپنے ناول کا سترہواں باب شروع کرنے بیٹھا ہی تھا کہ منی آموجود ہوئی۔ کہنے لگی "بابا دیال، کاگ کو کوا

کہتا ہے، نرا مورکھ ہے۔ کچھ جانتا نہیں نا!" اس سے پہلے کہ میں مختلف زبانوں کا فرق اسے سمجھاتا اس نے دوسرا مضمون چھیڑ دیا: "بھولا کہتا ہے کہ آسمان پر ایک ہاتھی ہے۔ وہ اپنی سونڈ سے پانی پیتا ہے تو بارش ہوتی ہے۔ بھولا کیسی کیسی باتیں بناتا ہے۔ دن رات بکے جاتا ہے۔" یہ کہتے کہتے وہ میز کے قریب میرے پاؤں کے پاس آ بیٹھی اور میرے گھٹنوں سے کھیلنے لگی۔ ادھر میرے ناول کے سترہویں باب میں پرتاپ سنگھ، کنچن مالا کو لئے اندھیری رات میں قید خانے کے اونچے دریچے سے ندی میں کود رہا تھا۔

میرا مکان سڑک کے کنارے واقع ہے۔ اچانک منی کھیلنا چھوڑ کر کھڑکی کی طرف دوڑی اور زور زور سے غل مچانے لگی: "کابلی والا، او کابلی والا۔" ڈھیلا ڈھالا موٹا لباس پہنے، پگڑی باندھے، پیٹھ پر ایک جھولی لٹکائے اور انگوروں کے کچھ ڈبے ہاتھ میں اٹھائے ایک لمبا تڑنگا کابلی افغان ادھر سے گزر رہا تھا۔ نہ جانے اسے دیکھ کر میری بھولی بچی کو کیا سوجھا کہ یوں اسے بے ساختہ پکارنے لگی۔ مجھے خیال ہوا کہ اگر پشت پر جھولی ڈالے یہ بلائے درماں ادھر آ دھمکا تو میرے ناول کا سترہواں باب پورا نہ ہو سکے گا۔ خیر جونہی کابلی نے ہنستے ہوئے میرے مکان کا رخ کیا، بچی گھبرا کر گھر میں جا گھسی۔ اسے یہ ایمان دیکھا یقین تھا کہ اگر تلاشی لی جائے تو کابلی کی جھولی کے اندر انسانوں کے منی جیسے کئی بچے ملیں گے۔ کابلی اندر آیا اور مجھے سلام کر کے کھڑا رہا۔ میں نے سوچا کہ اگرچہ میرے ناول کا ہیرو پرتاپ سنگھ اور ہیروئن کنچن مالا، اس وقت دردناک دوراہے پر کھڑے ہیں مگر یوں اس کابلی کو گھر بلا کر بغیر کچھ دیئے ٹال دینا مناسب نہیں۔ سو میں نے کچھ الٹا سیدھا سودا کیا۔ امیر عبدالرحمٰن کا ذکر آیا کچھ روس اور انگریزوں کے درمیان سرحد کی حفاظت کے بارے میں جو معاہدہ طے پایا تھا اس کے بارے میں بھی باتیں ہوئیں۔ چلتے وقت کابلی نے مجھ سے پوچھا: "بابو جی تمہارا وہ لڑکی کدھر گیا؟" منی کے دل میں کابلی کے بارے میں جو بے بنیاد خوف پیدا ہو گیا تھا اسے دور کرنے کے لئے میں نے بچی کو بلا بھیجا۔ منی آ گئی مگر مجھ سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور کابلی اور اس کی جھولی کو مشتبہ نظروں سے دیکھتی رہی۔ کابلی نے اپنی جھولی میں سے کچھ کشمش، کچھ خوبانیاں نکال کر منی کی طرف بڑھائیں مگر اس نے ان چیزوں کو قبول نہ کیا۔ بلکہ اور بھی خوفزدہ ہو کر وہ میرے زانو سے چمٹ گئی۔ یہ تھی منی اور کابلی کی پہلی ملاقات!

کچھ دنوں بعد ایک روز میں کسی ضرورت سے گھر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ منی دروازے کے پاس بنچ پر بیٹھی ہے اور مسلسل بکے جا رہی ہے۔ کابلی اس کے پاس بیٹھا اس کی باتیں سن رہا ہے، ہنس رہا ہے اور کبھی کبھی ٹوٹی پھوٹی بنگالی میں اپنی رائے کا اظہار کر رہا ہے۔ منی کو اپنی پانچ سالہ زندگی میں میرے سوا کوئی ایسا شخص نہیں ملا تھا جو اس کابلی کی طرح پورے انہماک سے اس کی باتیں سنتا۔ میں نے دیکھا کہ منی کا چھوٹا سا آنچل بادام، کشمش، اخروٹ وغیرہ سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے کابلی سے کہا: "خان تم یہ تکلیف کیوں کرتے ہو۔ اسے چیزیں نہ دیا کرو۔" یہ کہہ کر میں نے اسے ایک اٹھنی دی جسے اس نے بغیر کچھ کہے اپنی جھولی میں ڈال لیا۔

جب میں گھر لوٹا تو دیکھا کہ اس اٹھنی نے اچھا خاصا ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ میری بیوی ایک گول سی چمکدار چیز ہاتھ میں لئے منی سے پوچھ رہی ہے: "بتا تجھے یہ اٹھنی کہاں سے ملی؟" منی کہہ رہی تھی "مجھے کابلی نے دی ہے۔" اس کی ماں نے کہا: "تو نے کابلی سے یہ اٹھنی کیوں لی؟" اس ہنگامے سے گھبرا کر میں منی کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ کابلی اور منی کی یہ دوسری ملاقات نہ تھی۔ کابلی کو جس کا نام رحمت تھا، دیکھتے ہی منی پوچھتی "کابلی، تمہاری جھولی میں کیا ہے؟" رحمت بے ضرورت ایک نون غنہ ڈال کر کہتا "ہانتھی" یعنی اس کی جھولی میں ایک ہاتھی ہے۔ کابلی کے خیال میں یہ نہایت ہی لطیف مزاح تھا۔ یہ مذاق اگرچہ چنداں لطیف نہ تھا مگر دونوں اس پر خوب ہنستے۔ ایک ادھیڑ عمر شخص سے ایک ننھی

منی لڑکی کی دلچسپ باتیں سن کر میرا بھی دل بہل جاتا۔ کابلی اکثر منی کو پستہ، بادام وغیرہ دے جاتا تھا۔ غالباً انہی تحفوں سے اس نے بچی کا دل موہ لیا تھا۔ دونوں کے درمیان خوب گھل مل کر باتیں ہوا کرتیں۔ رحمت منی سے پوچھتا "منی بابا تم سسرال کب جائے گا؟" بنگالی لڑکی شاید پیدا ہوتے ہی سسرال کے لفظ سے آشنا ہو جایا کرتی ہے لیکن ہم لوگ چونکہ نئی روشنی کے زیر اثر آ چکے تھے ہماری بچی کو اس وقت تک اس کا علم نہ تھا، تاہم بات کا جواب نہ دینا اور خاموش رہ جانا منی کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ کابلی کے سوال کے جواب میں ایک سوال جڑ دیتی "کابلی تم سسرال نہیں جاؤ گے؟" رحمت اپنے فرضی سسر کو نشانہ بناتے ہوئے ایک بھاری سا گھونسہ اٹھاتا: "ام اپنا سسر کو اس سے ماریں گے۔" منی یہ تو نہیں جانتی تھی کہ سسر کس بلا کا نام ہے مگر اس بیچارے فرضی سسر کی مشکل کا اندازہ کر کے وہ زور سے ہنس پڑتی۔

ان دنوں پت جھڑ کا موسم تھا۔ ایسے ہی دنوں میں اگلے زمانے کے راجہ مہاراجہ دنیا فتح کرنے نکلا کرتے تھے۔ میں خود کبھی کلکتہ سے باہر نہیں نکلا اسی لئے میرے خیالات دنیا بھر میں چکر لگاتے پھر رہے تھے۔ میں اپنے مکان میں گوشہ نشین ہو گیا ہوں۔ میرا دل ہر وقت باہر کی دنیا میں لگا رہتا ہے۔ کسی اجنبی ملک کا نام سنتے ہی میری سوچ کو پر لگ جاتے ہیں۔ کسی پردیسی کو دیکھتا ہوں تو تخیل کے پردے پر اس ملک کی ندی، پہاڑ اور جنگل کے دامن میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا نمودار ہو جاتا ہے۔ ایک ہنستی گاتی زندگی کا خاکہ میرے ذہن میں کھنچ جاتا ہے۔ اگرچہ میرا دل ساری دنیا میں لگا رہتا ہے لیکن میں ایسا درخت بن گیا ہوں جو اپنے پیروں کی مٹی کو مضبوطی سے پکڑے رکھتا ہے۔ جب بھی گھر سے نکلنے کی ضرورت آن پڑے تو سر پر گویا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ اسی لئے اپنے گھر میں، چھوٹے سے کمرے میں اپنے میز کے پاس بیٹھے بیٹھے اس کابلی کی باتیں سن کر سیر و سیاحت کا شوق پورا کر لیتا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی بنگالی مگر گرجدار آواز میں کابلی میری آنکھوں کے سامنے ایک نقشہ کھینچ دیتا۔ پہاڑی پگڈنڈی ہے جس کے دونوں طرف سرخی مائل پتھریلی زمین ہے۔ بے آب و گیاہ راستے پر پگڑی باندھے تاجروں اور راہگیروں کا قافلہ چلا جا رہا ہے۔ کوئی اونٹ پر سوار ہے کوئی پیدل چل رہا ہے۔ کسی کے پاس پرانی وضع کی بندوق ہے۔ کوئی ہاتھ میں برچھا اٹھائے ہوئے ہے۔

منی کی ماں کی طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ ذرا سی بات پر گھبرا جایا کرتی ہے۔ اس کی عمر زیادہ نہیں مگر زندگی کے نشیب و فراز سمجھنے کے لئے کافی ہو چکی تھی۔ پھر بھی اس کے دل میں یہ وہم بیٹھ گیا تھا کہ دنیا کا ہر کونہ چوروں، شرابیوں، سانپوں، شیروں، ملیریا کے کیڑوں اور گوروں سے بھرا پڑا ہے۔ سڑک پر معمولی سا شور ہوتا ہے تو سمجھتی کہ دنیا بھر کے شرابی، اس کے گھر کی طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ ایسی صورت میں رحمت کابلی اسے کیوں کر پسند آتا۔ اس کی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھنے کے لئے وہ مجھے بار بار تاکید کرتی۔ اس کے شکوک ہنس کر ٹالنے کی کوشش کرتا تو سوال کرنے لگتی "کیا کبھی کسی کا بچہ چوری ہوتے نہیں سنا؟ کیا کابل میں بردہ فروشی نہیں ہوتی؟ کیا ایک لمبے تڑنگے کابلی کے لئے ایک چھوٹی سی بچی کا اٹھا لے جانا ناممکن ہے؟" میں مان لیتا کہ یہ سب امکان سے باہر نہیں تھا مگر پھر بھی رحمت کابلی کے متعلق ایسا گمان رکھنا نامناسب تھا۔ خیر اعتماد کا مادہ ہر شخص میں یکساں نہیں ہوتا۔ میری بیوی بدستور بدگمان رہتی اگرچہ میں رحمت کو اپنے گھر آنے سے روک نہ سکا۔

ہر سال ماگھ کے مہینے میں رحمت کابلی اپنے وطن چلا جاتا۔ ان دنوں اسے گھر گھر جا کر اپنا بقایا وصول کرنے کی مصروفیت ہوتی تھی۔ پھر بھی اب کے برس وہ ہر روز وقت نکال کر منی کو درشن دے جاتا۔ صبح کو نہ آ سکتا تو شام کو آ جاتا۔ اسے میرے گھر پر دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوتی۔ ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے جھولی لٹکائے اس لمبے تڑنگے شخص کو اندھیری کوٹھری کے ایک کونے میں بیٹھا دیکھ کر دل میں کچھ کھٹکا تو ہوتا تھا مگر جوں ہی منی "کابلی والا، کابلی

والا' پکارتی، کھلکھلاتی ہوئی دوڑتی ہوئی چلی آتی اور دونوں میں مذاق کی جانی بوجھی باتیں شروع ہو جاتیں، تو دیکھنے والوں کو قدرے اطمینان ہو جاتا۔

کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ جاتے جاتے جاڑا اپنا زور دکھا رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا پروف دیکھ رہا تھا۔ صبح کی دھوپ جو کھڑکی سے ہو کر میرے پیروں پر پڑ رہی تھی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ کوئی آٹھ بجے کا عمل ہوگا۔ صبح کے ٹہلنے والے اپنے سر اور کان گلوبند میں لپیٹے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ اتنے میں گلی میں سے شور و غل بلند ہونے لگا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا کہ رحمت کو دو پولیس والے پکڑے لئے جاتے ہیں۔ تماشائی لڑکوں کا ایک ہجوم بھی ہمراہ ہے۔ رحمت کے کپڑوں پر خون کی چھینٹیں تھیں۔ میں نے باہر نکل کر سپاہیوں سے ماجرا دریافت کیا۔ کچھ ان لوگوں سے کچھ رحمت سے سن کر پتہ چلا کہ ہمارے پڑوس میں ایک شخص نے رحمت سے ایک رام پوری چادر ادھار لی تھی جس کا کچھ روپیہ باقی رہ گیا تھا مگر اب وہ شخص چادر لینے ہی سے مکر گیا۔ اسی تکرار میں بات بڑھ گئی اور رحمت نے اسے چھرا مار دیا۔ رحمت اس شخص کو موٹی موٹی گالیاں دے رہا تھا۔ اتنے میں "کابلی والا، کابلی والا" پکارتی ہوئی منی گھر کے باہر آ موجود ہوئی۔

رحمت کا چہرہ خوشی سے پھول کی طرح کھل گیا۔ آج کابلی کے پاس جھولی نہیں تھی چنانچہ "ہاتھی" کا ذکر نہ ہوا۔ منی نے اچانک پوچھا "کابلی، کیا سسرال جاؤ گے؟" رحمت نے ہنس کر کہا "وہیں جا رہا ہوں۔" لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے جواب سے منی کو لطف نہیں آیا تو اپنے ہاتھ سے اشارہ کر کے اس نے کہا "ان سسروں کو مار کے پڑا کر دیتا لیکن کیا کروں ہاتھ بندھا ہے۔" ایک شخص پر قاتلانہ حملہ کرنے کے جرم میں رحمت کو کئی سال کی سزا ہو گئی۔

کچھ دنوں کے بعد ہم لوگ اس قصے کو بھول گئے۔ ہمیں کبھی بھولے سے بھی خیال نہ آیا کہ ایک آزاد پہاڑی باشندہ قید خانے کے اندر کیوں کر دن گزار رہا ہے۔ منی کی اس فراموش کاری پر مجھے شرم آتی۔ اپنے پرانے دوست کو بھول کر اس نے نبی سائیں سے دوستی کر لی تھی۔ پھر جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی دوستوں کو چھوڑ کر سہیلیوں سے راہ و رسم بڑھانے لگی۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ میرے کمرے میں بھی شاذ و نادر ہی آتی جیسے مجھ سے لڑائی ہو گئی ہو۔

کئی برس بیت گئے۔ وہی خزاں کے دن ہیں۔ منی کی شادی طے پا چکی تھی۔ پوجا کی چھٹیوں میں شادی انجام پائے گی۔ درگا مائی جس دن کیلاش سدھاریں گی میرے گھر کی رونق بھی ہمیں اندھیرے میں چھوڑ کر پیا کے آنگن کا رخ کرے گی۔

آج کی سویر بڑی خوشگوار جیسے برسات نے ساری فضا کو دھو ڈالا ہو۔ صبح کی دھوپ سہاگے میں تپے ہوئے سونے کی طرح دمک رہی ہے۔ یہاں تک کہ کلکتہ کی گلیوں میں بوسیدہ مکانوں کی شکستہ اینٹیں بھی دھوپ میں نکھری نکھری لگ رہی ہیں۔ ہمارے گھر پر صبح ہی سے شہنائی بجنا شروع ہو گئی ہے۔ شہنائی کا ہر سر میرے دل کو مسل رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنے والی جدائی کا خیال میرے دل کو جو دکھ دے رہا ہے بھیرویں کا رنگ اسے دھوپ کی چادر کی صورت میں ساری دنیا میں پھیلا رہا ہے۔ انگنائی میں شامیانہ تاننے کے لئے بانس کی کھونٹیاں گاڑی جا رہی ہیں۔ برآمدے میں فانوس لٹکانے کے لئے ٹھک ٹھک ہو رہی ہے۔ لوگوں کے آنے جانے اور ہانک پکار میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا اخراجات کا حساب لکھ رہا ہوں۔ اتنے میں رحمت کابلی داخل ہوا اور سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ میں پہلی نظر میں تو اسے پہچان بھی نہیں سکا کیونکہ نہ اس کے پاس جھولی تھی نہ لمبے لمبے بال اور نہ ہی بدن میں پہلی سی چستی تھی۔ میں نے پوچھا "رحمت تو کب آیا؟" بولا "بابو جی کل شام جیل سے چھوٹ کر

آیا ہوں۔" اس کی بات میرے کانوں کو بھلی نہ لگی۔ میں نے ایک خونی کو پہلی بار اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ میرا دل سہم گیا۔ جی میں آئی کہ وہ چلا جائے تو اچھا ہو۔ میں نے اس سے کہا "آج ہمارے گھر پر ایک تقریب ہے، مجھے ذرا بھی فرصت نہیں۔ آج جاؤ۔" یہ سن کر وہ فوراً چل پڑا مگر دروازے تک جا کر جھجکتا ہوا بولا "کیا بچی کو ایک دفعہ دیکھ نہیں سکتا؟" اس کا خیال تھا کہ مِنّی پہلے جیسی ہی ہوگی اور "کابلی والا، کابلی والا" پکارتی ہوئی دوڑی آئے گی۔ مِنّی کے لئے انگوروں کا ڈبہ اور کاغذ میں لپٹے ہوئے کچھ کشمش بادام وہ اپنے کسی ہم وطن سے لیتا آیا تھا کیونکہ اس کی اپنی جھولی تو تھی نہیں۔ میں نے پھر کہا "گھر پر ایک تقریب ہے، آج کسی سے بھی ملاقات نہیں ہو سکتی۔" وہ کچھ ملول ہو کر چپکا کھڑا رہا پھر "بابو سلام" کہہ کر باہر نکل گیا۔ میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ سوچا کہ اسے واپس بلا لوں۔ اتنے میں دیکھا کہ وہ خود پلٹ کر آ رہا ہے۔ قریب آ کر بولا "یہ انگور اور کچھ کشمش بادام بچی کے لئے لایا تھا اسے دے دیجئے گا۔" میں نے قیمت ادا کرنے کیلئے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا "بابو جی آپ ام پر برابر مہربانی کیا ہے سو ام کبھی بھول نہیں سکتا۔ ام کو دام مت دو۔ بابو جی تمہارا جیسا لڑکی ویسا دیس میں ہمارا بھی ایک لڑکی ہے۔ ام اس کو یاد کر کے اپنی لڑکی کے واسطے کچھ میوہ لے آیا کرتا ہے۔ ام آپ کے پاس سودا بیچنے نہیں آتا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے میں ہاتھ ڈال کر ایک تہہ کیا ہوا میلا سا کاغذ نکالا اور دونوں ہاتھوں سے دھیرے دھیرے کھول کر میری میز پر بچھا دیا۔ اس پر ایک ننھے سے ہاتھ کی چھاپ تھی۔ فوٹو تھا نہ رنگین تصویر تھی۔ بچی کے ہاتھ میں کوئی رنگ لگا کر اس نے کاغذ پر چھاپ اتار لی تھی۔ ہر سال رحمت کلکتہ آ کر گھر گھر میوہ وغیرہ بیچا کرتا اور اس چھاپے کو سینے سے لگائے رکھتا۔ شاید اس سے بیٹی کی جدائی کا کچھ مداوا ہو جاتا ہو۔

چھاپ کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرے اور اس کے درمیان کوئی فرق نہ رہا۔ میں بھول گیا کہ وہ ایک کابلی میوہ فروش ہے اور میں ایک معزز بنگالی ہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ میری ہی طرح وہ بھی ایک بچی کا باپ ہے۔ دور دیس کی بیٹی کے ہاتھ کی چھاپ مجھے اپنی مِنّی کی یاد دلا گئی۔ میں نے فوراً اسے اندر سے بلا بھیجا۔ عورتوں نے اعتراض کرنا چاہا مگر میں نے ایک نہ سنی۔

لال ریشمی ساڑھی پہنے، پیشانی پر چندن کی لکیریں، دلہن کے لباس میں شرماتی لجاتی مِنّی میرے نزدیک آ کر کھڑی ہو گئی۔ کابلی اسے دیکھ کر ہچکچا گیا اور پرانی طرز پر باتیں نہ کر سکا۔ ہنستے ہوئے صرف اس نے یہ پوچھا "مِنّی بابا سسرال جا رہی ہو؟" مِنّی پہلے کی طرح رحمت کو جواب نہ دے سکی اور شرما کر منہ پھیر لیا۔ مجھے وہ دن یاد آ گیا جب کابلی کے ساتھ مِنّی کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میرا دل کرومنس لینے لگا۔

مِنّی کے واپس جانے کے بعد رحمت ایک ٹھنڈی سانس لے کر زمین پر بیٹھ گیا۔ غالباً اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کی اپنی لڑکی بھی اتنے دنوں میں مِنّی کی طرح سیانی ہو چکی ہوگی اور اس سے نئی طرح سے بات چیت کرنی پڑے گی۔ نہیں معلوم آٹھ سال کے عرصے میں اس پر کیا گزری ہوگی۔ صبح کی خوشگوار دھوپ میں شہنائی بج رہی تھی اور رحمت خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے اسے ایک نوٹ دیا اور کہا "رحمت اپنی لڑکی کے پاس جاؤ۔ تم باپ بیٹی کے ملنے سے میری مِنّی کی شادی میں برکت ہوگی۔" اس نوٹ کے دینے سے مجھے شادی کے ساز و سامان میں کس قدر کمی کرنا پڑی۔ میں نے بجلی کی بتیوں کی تعداد گھٹا دی اور بینڈ باجا بھی نہ منگایا۔ اس سے عورتوں کو بہت ملال ہوا مگر مجھے ایسی خوشی نصیب ہوئی جو شاید دنیا کے سارے ساز و سامان اکٹھا کر کے بھی نہ ہوتی۔

☆......☆......☆

دیوار

عظیم فرانسیسی فلاسفر، ڈرامہ نگار، نقاد، صحافی اور سیاسی مدبر ژاں پال سارتر کو بیسویں صدی کی ایک اہم شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ سارتر کی ادبی خدمات کے پیش نظر 1964ء میں انہیں نوبل انعام کا حقدار گردانا گیا مگر انہوں نے یہ انعام وصول کرنے سے معذرت کر لی۔ وہ 21 جون 1905ء کو پیرس میں تولد ہوئے۔ ان کے والدین پروٹسٹنٹ عیسائی تھے مگر سارتر نے شعور کی منزل پر قدم رکھنے کے بعد مذہب سے بے گانگی اور الحاد کی روش پر چلنا اختیار کیا۔ انہوں نے باقاعدہ شادی نہیں کی مگر اپنی عمر بھر کی ساتھی سیمون ڈی بیووار کی رفاقت میں زندگی کے پچاس برس گزار دیے۔ ان کی اپنی کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ مگر انہوں نے اپنی مددگار، نائب مدیرہ مس آرلیت کو بیٹی کی حیثیت سے اپنا لیا تھا۔ زندگی کے ابتدائی دور میں وہ دو برس، (31-1929) تک فرانس کی فوج میں بطور سارجنٹ خدمات سرانجام دیتے رہے۔ فلسفے میں اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ فرانس کے متفرق اعلیٰ تعلیمی اداروں میں فلسفہ کے پروفیسر کی حیثیت سے پڑھاتے رہے۔ 1939ء میں وہ دوسری بار فوج میں شامل ہوئے اور اس خفیہ مزاحمتی جنگ میں شریک رہے جس کا مقصد فاشزم اور نازی جارحیت کا مقابلہ کرنا تھا۔ سارتر کی تصانیف کو نئے خیالات، حق گوئی اور فلسفۂ وجودیت کے فنکارانہ اظہار کی بدولت عالمگیر شہرت نصیب ہوئی۔ وہ فلسفی کا دماغ اور شاعر کا دل رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت فلسفے اور ادب عالیہ کے خوبصورت امتزاج کی علامت تھی۔ پس ماندہ قوموں کے لئے ان کی جدوجہد بھی بیسویں صدی کی تاریخ کا حصہ ہے۔ دنیا انہیں الجزائر کی تحریک آزادی کی واشگاف حمایت کے حوالے سے بھی ہمیشہ یاد رکھے گی۔ سارتر کو فرانس کا ضمیر کہا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ جب ان کے خیالات وافکار کی بناء پر صدر ڈیگال کے مشیروں نے انہیں مشورہ دیا کہ سارتر کو گرفتار کر لیا جائے تو صدر ڈیگال نے یہ کہتے ہوئے ان کی تجویز رد کر دی:

"سارتر تو فرانس ہے۔ میں فرانس کو کیسے گرفتار کر سکتا ہوں؟"

زیر نظر کہانی "دیوار" سارتر کے فن کی نمائندہ تحریر ہے۔ اس کا شمار دنیا کی چند اعلیٰ ترین کہانیوں میں ہوتا ہے۔ سارتر اس کہانی میں زندگی کا یہ ہولناک رخ دکھانے میں کامیاب رہے کہ ہر ذی نفس ذاتی سطح پر بے یقینی کی فضا میں سانس لیتا ہے۔ وہ ایسی کائنات میں زندہ ہے جو کسی ضابطۂ حیات کی پابند نہیں۔ فرد سے کائنات کی لاتعلقی کا احساس "دیوار" کے مرکزی کردار پر اچانک اپنے عقائد و نظریات کی بے وقعتی واضح کرتا ہے تو اسے ادراک ہوتا ہے کہ وہ اصول و نظریات جنہیں وہ اتنا مقدس اور عزیز سمجھتا تھا، دراصل کتنے بے حقیقت ہیں۔ آخری سعی کے طور پر وہ اپنی انا سلامت رکھنا چاہتا ہے مگر اتفاقات زمانہ میں فرد کی انا بھی بے وقعت ثابت ہوتی ہے۔ یہ انسانی بے بسی کی انتہا ہے جس پر وہ ہنستا ہے تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اس لازوال افسانے کے خالق ژاں پال سارتر اس فانی دنیا سے 15 اپریل 1980ء کے دن چلے گئے۔

☆......☆......☆

آخر کار انہوں نے مجھے ایک بڑے سے سفید کمرے میں دھکیل دیا۔ وہاں اتنی تیز روشنی تھی کہ میری آنکھیں چندھیانے لگیں۔ کمرے میں چار آدمی ایک میز کے پیچھے سر جھکائے بیٹھے کاغذات کی جانچ پڑتال کر رہے تھے۔ یہ فوجی نہیں تھے۔ دیوار کے ساتھ متعدد قیدی سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان میں سے چند کو میں جانتا تھا۔ میرے سامنے بھورے بالوں والے دو غیر ملکی قیدی تھے۔ ان کی آپس میں خاصی مشابہت تھی۔ مجھے وہ حلیے سے فرانسیسی لگ رہے تھے۔ ان میں جو چھوٹا تھا وہ اپنی پتلون کو بار بار کھینچ کر اوپر کر رہا تھا۔

کارروائی مکمل ہونے میں تقریباً تین گھنٹے صرف ہوئے۔ میرا سارا وجود تھکن سے بے حال تھا۔ دماغ خالی خالی اور سوچنے سے عاری ہو چکا تھا۔ چوبیس گھنٹے تک شدید سردی میں کانپنے کے بعد اب اس کمرے کی حرارت مجھے بہت خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔

سپاہی قیدیوں کو باری باری میز کے سامنے لے جا رہے تھے، جہاں ان سے کم وبیش ایک جیسے سوال پوچھے جا رہے تھے:

''تمہارا پورا نام کیا ہے؟''

''تم کہاں کہاں گئے اور کیا کرتے رہے؟''

عام طور پر یہی دو سوال کئے جاتے۔ کبھی کبھی ان سوالات سے تجاوز کیا جاتا۔

''کیا تم بھی اسلحے کی تباہی میں شریک تھے؟''

''تم نو تاریخ کی صبح کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے؟''

انہیں جواب سننے میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ جب وہ سوال کر لیتے تو اپنے سامنے کھڑے قیدی کو غور سے دیکھتے اور پھر سر جھکا کر کاغذوں پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔

''کیا تم انٹرنیشنل بریگیڈ کے لئے کام کرتے رہے ہو؟'' انہوں نے ٹام سے سوال کیا اور جواب سنے بغیر لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

جوآن سے انہوں نے صرف اس کے نام کی تصدیق چاہی اور پھر دیر تک کاغذات پر کچھ رقم کرتے رہے۔

''میرا بھائی جوزے ان کے لئے کام کرتا رہا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میرا کسی جماعت سے تعلق نہیں۔ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' جوآن بولتا رہا مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں نے کہا ناں کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ دوسروں کے کئے دھرے کا میں ذمہ دار نہیں ہوں'' جوآن کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ایک محافظ اسے کھینچتا ہوا لے گیا۔ اس کے بعد میری باری تھی۔

''تمہارا نام پابلو ہے؟''

''ہاں'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ریمون کہاں ہے؟ ہماری اطلاع کے مطابق تم نے چھ سے انیس تک اسے اپنے گھر میں چھپائے رکھا ہے۔''

''آپ کو غلط اطلاع ملی ہے۔''

وہ سر نیچے جھکا کر لکھنے لگا۔ محافظ نے مجھے دھکا دیا۔

بڑے کمرے میں ٹام اور جوآن دو محافظوں میں گھرے میرے منتظر تھے۔

"یہ ابتدائی کارروائی تھی یا مقدمہ ختم ہو گیا؟" ٹام نے محافظوں سے استفسار کیا۔

"یہ مقدمہ تھا۔" ایک نے جواب دیا۔

"تو اب.............اب کیا ہو گا؟"

"فیصلہ تمہاری کوٹھری میں سنایا جائے گا۔"

ہماری کوٹھری میں بہت زیادہ ٹھنڈ تھی۔ ہم ساری رات ٹھٹھرتے رہے۔ صبح کے وقت بھی درجہ حرارت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ جوآن تمام وقت خاموش دم بخود بیٹھا رہا۔ وہ کم سن اور ناتجربہ کار تھا۔ خوف نے اسے گنگ کر دیا تھا۔

ٹام البتہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا۔ کوٹھری میں ایک بنچ تھا اور چار کمبل۔ تفتیش گاہ سے آ کر ہم الگ الگ کمبلوں پر بیٹھ گئے تھے۔

"لگتا ہے ہم ٹھکانے لگ گئے۔" ٹام نے سرد آہ کھینچی۔

"مجھے بھی یہی لگتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر چھوٹا بلاوجہ سہما ہوا ہے۔ وہ اسے کچھ نہیں کہیں گے۔"

"کیسے؟ جوآن کو؟ ہاں، یہ جوزے کا چھوٹا بھائی ہے۔ جوزے ان کے خلاف جان ہتھیلی پر رکھے نبرد آزما ہے۔"

میں نے جوآن کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور سکتے کی کیفیت میں دیوار پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔

روزن زنداں سے روشنی کے ساتھ ساتھ یخ بستہ ہوا کے جھونکے بھی اندر آ رہے تھے۔ جوآن سردی سے کپکپانے لگا۔

"خدا کی پناہ!" وہ دانت کچکچا کر بولا۔ "میں تو سزا پانے سے پہلے ہی ٹھنڈ سے اکڑ کر مر جاؤں گا۔"

ٹام نے خود کو گرم کرنے کے لئے ورزش شروع کر دی۔ وہ مضبوط جسم کا مالک تھا مگر عمر ڈھلنے کے ساتھ اس کے بدن پر موٹاپے کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔

اسے ورزش کرتے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ کل کسی وقت اس کے فربہ جسم میں گولیاں اور سنگینیں یوں اتریں گی جیسے مکھن کی ٹکیہ میں چھری اترتی ہے۔

شدید سردی کے باعث مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے بازو میرے جسم سے جدا ہو گئے ہوں۔ مجھے اپنی جیکٹ یاد آئی جو انہوں نے مجھ سے چھین لی تھی۔ انہوں نے ہمارے سارے کپڑے اتروا کر اپنے سپاہیوں کو دے دیئے تھے اور ہمیں وہ سوتی کرتے اور پاجامے پہنا دیئے تھے جو ہسپتال کے مریضوں کو موسم گرما میں پہننے کو ملتے ہیں۔

تھوڑی دیر ورزش کے بعد، ٹام سانس درست کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔

"جسم میں کچھ گرمی آئی؟" میں نے پوچھا۔

''نہیں'' اس نے بُرا منہ بنا کر کہا۔ ''مگر سانس پھول گیا۔''

آٹھ بجے کے قریب ایک فوجی افسر تین سپاہیوں کے ساتھ ہماری کوٹھڑی میں آیا۔

''ان تینوں کے نام کیا ہیں؟'' افسر نے ہمارے محافظ سے پوچھا۔

''ٹام، جوآن اور پابلو۔'' اس نے جواب دیا۔

افسر نے عینک درست کی، اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی فہرست کو غور سے دیکھا۔

''ٹام ...... ٹام ...... یہ رہا! ٹام، تمہیں سزائے موت سنائی گئی ہے۔ کل صبح تمہیں گولی ماردی جائے گی۔''

یہ کہہ کر وہ دوبارہ فہرست پر جھک گیا۔

''اور ...... تم دونوں کو بھی۔ جوآن اور پابلو۔ سزائے موت!'' اس نے فہرست پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ ناممکن ہے!'' جوآن چیخ اٹھا۔

افسر نے اسے تعجب سے دیکھا۔

''تمہارا پورا نام کیا ہے؟''

''جوآن مربل''

''یہ ...... یہاں تمہارا ہی نام ہے۔'' افسر نے مطمئن انداز میں تصدیق کی۔ ''...... اور تمہیں موت کی سزا دی گئی ہے۔''

''لیکن میں نے کچھ نہیں کیا۔'' جوآن کی آواز میں وحشت تھی۔

افسر نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور ہم دونوں کی طرف مڑتے ہوئے کہا: ''کچھ دیر میں تم لوگوں کے پاس ایک ڈاکٹر آئے گا۔ اسے رات بھر تمہارے پاس رہنا ہے۔''

ہمیں مطلع کرنے کے بعد وہ فوجی انداز میں گھوما اور نکل گیا۔

''میں نے کیا کہا تھا۔'' ٹام فوراً بولا۔ ''ہم ٹھکانے لگ گئے ہیں۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''مگر چھوٹے کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔''

میں نے یہ بات کہہ تو دی تھی مگر حقیقت یہ تھی کہ مجھے چھوٹے پر غصہ آرہا تھا۔ خوف کی زیادتی سے اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ نقوش عجیب انداز میں مسخ ہوگئے تھے۔ اس کی یہ کیفیت مجھے بے کل کر رہی تھی جس کے باعث مجھے اس پر تاؤ آنے لگا تھا۔ تین روز پہلے تک وہ محض ایک بچہ تھا مگر اب وہ کسی دوسرے سیارے کی بوڑھی مخلوق لگنے لگا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ رہا ہو بھی گیا تو دوبارہ کبھی بچہ نہیں لگے گا۔ وہ بلاشبہ ہمدردی کا مستحق تھا لیکن مجھے ہمدردی کرتے ہوئے متلاہٹ ہوتی ہے۔

سزا سننے کے بعد وہ خاموشی سے پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ رحم کے جذبے سے مغلوب ہو کر ٹام نے اسے بازو

سے پکڑ کر کھڑا کرنا چاہا مگر اس نے اپنے آپ کو نہایت شدت سے کونے میں سمیٹ لیا اور منہ بسور کر ٹام کو گھورا۔

''اسے چھوڑ دو ٹام'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''یہ دھاڑیں مارنے والا ہے''

ٹام چاہتا تھا کہ چھوٹے کو تسلی دے، اس سے ہمدردی کرے۔ اس کی خواہش ہوگی کہ اس عمل میں مصروف رہنے کے باعث خود اس کا دل بھی بہلا رہے گا۔ اور یوں وہ اپنے بارے میں سوچنے سے بچ جائے گا۔ مجھے ٹام کی یہ حرکت بری لگ رہی تھی۔ لیکن اس سے پیشتر میں نے کبھی موت کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اس سے پہلے موت واضح طور پر میرے سامنے آئی ہی نہیں تھی۔ مگر اب جبکہ موت سامنے تھی۔ میں اس کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ میں اپنے وجود میں اترتی گولیوں کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ مرنے سے پہلے چیخ مارنے کی مہلت ملتی ہوگی یا نہیں؟ تمام گولیاں جسم پھاڑ کر دوسری طرف نکل جاتی ہیں یا......؟ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ ان باتوں پر غور و فکر کرنے کے لئے تمام رات پڑی تھی۔

کچھ دیر بعد ٹام بھی خاموش ہوگیا۔ میں نے انکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ بھی زرد ہو رہا تھا۔ میں نے سر اٹھایا اور چھت کے روزن سے ایک ستارہ چمکتے دیکھا۔ سرد اور شفاف رات کی ابتداء ہو چکی تھی۔

دروازہ کھلا اور دو محافظ اندر داخل ہوئے ان کے ساتھ بھورے بالوں والا ایک باوردی آدمی تھا۔

''میں ڈاکٹر ہوں'' اس نے خوش اخلاق سے کہا۔

''جہاں تک ممکن ہوا، میں اس اذیت ناک صورت حال میں آپ کی مدد کروں گا۔''

''تم کیا کرو گے؟'' میں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

''جو تم کہو گے۔ تمہاری زندگی کے آخری چند گھنٹے خوشگوار بنانے کے لئے میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔'' ڈاکٹر کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

''تم ہمارے ہی پاس کیوں آئے اور بہت سے آدمی ہیں۔ زندان بھرا پڑا ہے۔''

''میں اس لئے آیا ہوں کہ مجھے بھیجا گیا ہے۔'' اس نے مدھم آواز میں کہا۔ پھر فوراً سنبھل کر بولا۔ ''تم سگریٹ پیتے ہو؟ میرے پاس سگریٹ ہیں۔ سگار بھی ہیں۔''

''نہیں۔ شکریہ۔'' میں نے سگریٹ لینے سے انکار کر دیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے اضطراب سے پہلو بدلا۔ میں چند لمحے اسے گھورتا رہا اور پھر اس کی موجودگی سے لاتعلق ہوگیا۔ دونوں محافظ فرش پر پڑے کمبل پر بیٹھ گئے۔ دراز قد محافظ جس کا نام پیڈرو تھا اپنی انگلیاں چٹخا رہا تھا جبکہ دوسرا نیند کے غلبے سے نجات حاصل کرنے کے لئے بار بار اپنا سر جھٹک رہا تھا۔

میں نے پشت سیدھی کی اور اپنے دونوں ساتھیوں پر نظر دوڑائی۔ ٹام اپنا سر گھٹنوں پر رکھے بیٹھا تھا۔ جو آن کی حالت قابل رحم تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے نبض ٹٹولنے کے لئے اس کی کلائی پکڑنا چاہی تو اس نے خاموشی سے اپنا بازو ڈاکٹر کی جانب بڑھا دیا۔ وہ بدستور کھلے منہ کے ساتھ نتھنے پھلا رہا تھا۔

ڈاکٹر کی اس حرکت نے مجھ پر جھنجلاہٹ طاری کر دی۔ ''کتے کے بچے!'' میں نے خود کو بڑبڑاتے سنا۔ ''میرے نزدیک آنے کی کوشش

کی تو جبڑا توڑ دوں گا۔'' وہ میرے پاس تو نہیں آیا مگر چھوٹے سے فارغ ہو کر بہت دیر تک مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہا ہے۔

''بہت شدید سردی پڑ رہی ہے۔ کیا خیال ہے؟'' اس نے عجیب انداز میں مجھ سے سوال کیا۔

''مجھے تو سردی نہیں محسوس ہو رہی۔'' میں نے جواب دیا۔ لیکن وہ حسب سابق بغور میرا جائزہ لیتا رہا۔ اچانک مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھوا تو اسے پسینے میں تر پایا۔ میرا سارا بدن پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ میرے سر کے بال گیلے ہو کر اکڑ گئے تھے۔ کپڑے بھی جسم سے چپکے ہوئے تھے۔ سخت سردی میں اس قدر پسینہ؟ عجیب انکشاف تھا۔ گھنٹے سے میری یہ حالت تھی مگر میں اس سے بے خبر تھا۔ ڈاکٹر نے میرے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکتے دیکھے تو سمجھ گیا کہ میں خوف کی شدت سے پگھل رہا ہوں۔ وہ خاموشی سے میری اس حالت کا تجزیہ کر رہا تھا۔ میرا دل چاہا اس کا منہ نوچ لوں۔ میں اس ارادے سے اٹھ کر کھڑا ہوا مگر مجھے اچانک اپنا غصہ بے جا لگا۔ اور میں نے خود پر لاتعلقی کی کیفیت طاری ہوتے محسوس کی۔ میں نے کندھے اُچکائے اور بنچ پر بیٹھ کر پسینہ پونچھنے لگا۔ جلد ہی میرا رومال بھیگ گیا۔ مگر میرے بدن سے پسینہ بدستور نمودار ہوتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے پسینہ خشک کرنے کی کوشش ترک کر دی اور خود کو ایڑی سے چوٹی تک بھیگتے محسوس کرنے لگا۔

''تم ڈاکٹر ہو؟'' جوآن نے اچانک سوال کیا۔

''ہاں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''کیا بہت دیر تک تکلیف ہوتی ہے؟''

''کب؟ اوہ اس وقت؟ نہیں!'' ڈاکٹر نے ہمدردی سے کہا۔ ''سب کچھ آناً فاناً ہو جاتا ہے۔''

''لیکن میں...... کچھ لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ کبھی کبھی...... بعض اوقات دوسری بار بھی فائر کرنا پڑتا ہے۔''

''کبھی کبھی، ہاں۔ پہلی بار چلائی جانے والی گولیاں بسا اوقات اہم اعضاء کو چھوئے بغیر بدن سے پار ہو جاتی ہیں اس صورت میں ہاں......''

''تو پھر وہ اپنی بندوقوں میں دوبارہ گولیاں بھرتے ہوں گے؟''

''بالکل۔''

''اس میں وقت لگتا ہو گا۔'' چھوٹے کی آواز میں لرزش تھی۔ وہ تکلیف کے خوف میں مبتلا تھا۔ یہ اس کی عمر کا تقاضا تھا۔ مجھے ایسی کوئی تشویش نہیں تھی۔ پسینہ آنے کی کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔

میں نے ٹام کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ بھی پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ اس منظر سے بچنے کے لئے میں نے سر اٹھایا تو چھت کے سوراخ سے آسمان نظر آیا۔ کہکشاں اسی ترتیب کے ساتھ موجود تھی۔ مگر آج ستارے مختلف دکھائی دیتے تھے۔ جب میں اپنے گھر سے آسمان دیکھا کرتا تھا تو میرے احساسات اور ہوتے تھے۔ صبح کے وقت آسمان کا گہرا نیلا رنگ دیکھ کر مجھے بحر اوقیانوس کے روشن اور خوبصورت ساحلوں کا خیال آتا تھا۔ دوپہر کے وقت مجھے دور افتادہ جزیرے کا وہ چھوٹا سا شراب خانہ یاد آتا، جہاں منہ کا ذائقہ درست رکھنے کے لئے شراب کے ساتھ زیتون کا

اچار پیش کیا جاتا تھا۔ شام کے وقت جب سائے دراز ہوتے تو میں کھیل کے اس میدان کے بارے میں سوچتا جس کا نصف حصہ روشن اور آدھا چھاؤں میں رہتا تھا۔ اور جب مجھے خیال آتا کہ زمین بھی یونہی آدھی روشن اور آدھی تاریکی میں ڈوبی آسمان کی وسعتوں میں گھوم رہی ہے تو میرے سینے میں درد کی ایک لہر اٹھتی تھی۔ مگر اس تاریک کوٹھڑی کے روزن سے آسمان دیکھتے ہوئے مجھے ماضی کی کوئی چیز یاد نہیں آئی تھی۔ میں نے آسمان سے نظریں ہٹا کر ایک گہرا سانس لیا اور ٹام کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔

آخر ٹام نے مہر سکوت توڑ ڈالی۔ خیالات کی یلغار سے بچنے کے لئے وہ گفتگو کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ میری جانب دیکھے بغیر دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ میرا رنگ زرد ہو گیا تھا اور میں پسینے میں شرابور تھا۔ ٹام کا حال بھی میرے جیسا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے آئینہ بن گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میری طرف دیکھے بغیر باتیں کر رہا تھا۔ البتہ کبھی کبھی وہ ڈاکٹر کے چہرے پر نگاہ ڈال لیتا۔ اسے ادراک تھا کہ اس وقت کوٹھڑی میں فقط ڈاکٹر ہی ایک زندہ شخص ہے۔

"تمہاری سمجھ میں آ رہا ہے؟ میں تو کچھ نہیں سمجھ پا رہا۔" ٹام نے طویل گفتگو ختم کی، تو پوچھا:

"تم کیا سمجھنا چاہ رہے ہو؟"

"ہمارے ساتھ کچھ ہونے والا ہے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"فکر مت کرو۔ سب سمجھ میں آ جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

دفعتاً مجھے ٹام کے پاس سے عجیب سی بو آتی محسوس ہوئی۔ عام حالات میں میری ناک اتنی حساس نہیں تھی۔ میں نے نتھنے پھلا کر حقیقت معلوم کرنا چاہی۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" ٹام مسلسل بول رہا تھا "میں ڈرپوک نہیں ہوں مگر کچھ پتہ تو چلے۔ دیکھو میں جانتا ہوں وہ ہمیں احاطے میں لے جائیں گے...... ٹھیک ہے؟ تمہارا کیا خیال ہے کتنے لوگ ہوں گے؟"

"کیا؟ ہاں، لوگ!! معلوم نہیں۔ پانچ...... یا آٹھ۔ اس سے زیادہ تو نہیں ہوں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ فرض کیا وہ آٹھ ہوں گے کوئی چلا کر انہیں نشانہ باندھنے کا حکم صادر کرے گا۔ ٹھیک ہے؟ فوراً مجھ پر آٹھ بندوقیں تن جائیں گی۔ میں دیوار کے دوسری طرف نکل جانے کی کوشش کروں گا۔ پورا زور صرف کر دوں گا لیکن دیوار ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے گی۔ جیسے ڈراؤنے خوابوں میں ہوتا ہے...... میں جانتا ہوں ہمارے ساتھ کیا ہو گا۔ مگر سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"مت سوچو" میں نے کہا۔ "سب جانتے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔"

"بہت درد اور تکلیف ہوتی ہو گی۔ میں نے سنا ہے چہرہ بگاڑنے کے لئے خاص طور پر آنکھوں اور منہ کا نشانہ لیتے ہیں۔ کتے۔" ٹام کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "مجھے تو ابھی سے اپنے بدن میں سوراخ ہوتے دکھائی دے رہے ہیں...... گھنٹہ بھر سے چہرے اور گردن میں درد ہو رہا ہے۔ اصل میں تو یہ درد کل محسوس ہو گا اور اس کے بعد...... اس کے بعد کیا ہو گا؟"

میں جانتا تھا وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ مگر مجھے یہی بہتر لگا کہ انجان بنا رہوں۔ جہاں تک درد کا تعلق تھا تو میں خود اپنے بدن میں سوراخ ہوتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

ٹام دوبارہ بولنے لگا۔ اس کی آنکھیں بدستور ڈاکٹر پر جمی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر ہر چیز سے لاتعلق تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر کی وہاں موجودگی کا کیا مقصد ہے۔ وہ ہماری باتیں سننے نہیں آیا تھا۔ وہ ہمارے جسموں کی نگہداشت پر مامور تھا۔ ہمارے جسم جو زندگی ہی میں مر رہے تھے۔

"بالکل جس طرح بھیانک خوابوں میں ہوتا ہے۔" ٹام بولے چلا جا رہا تھا۔

"ٹھوس چیزیں ہاتھ سے نکل جاتی ہیں۔ دھوئیں کی طرح یا جیسے ہوا یا بادل۔ یا کوئی بھی چیز۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ گولیاں اور سوراخ اور درد۔ میں بالکل ٹھیک ہوں، مگر کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ مجھے اپنی لاش دکھائی دے رہی ہے۔ یہ عام بات نہیں ہے۔ خود اپنی لاش، اپنی آنکھوں سے۔ اپنی لاش کون دیکھنا چاہتا ہے؟ میں کچھ نہیں دیکھنا چاہتا۔ کیا میں اپنی آنکھیں بند کر لوں؟ میں تو کچھ سننا بھی نہیں چاہتا۔ دنیا دوسروں کے لئے قائم رہے، مجھے کیا ہے۔ میں نے دو راتیں جاگ کر گزاری ہیں۔ کسی شے کی حد ہوتی ہے۔ آدمی بکھر جاتا ہے۔ پابلو یقین کرو میں کسی بات کا منتظر ہوں۔ مگر یہ وہ چیز نہیں ہے وہ چیز تو ہمیں بے خبری میں آ لے گی۔ پیچھے سے......"

"بکواس بند کرو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "پادری کو بلاؤں؟ وہی تمہارا ہذیان سنے گا۔"

ٹام مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اب اگر ہمیں ساتھ مرنا پڑ رہا تھا تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ میں اسے پسند کرنے لگوں۔ اس وقت ریمون میرے ساتھ ہوتا تو صورتحال مختلف ہوتی۔ ریمون میرا دوست تھا۔ ٹام اور جون کے بیچ بیٹھا میں خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔

ٹام مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ میں اس کا مسئلہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ سوچنے سے بچنا چاہتا تھا۔ اس طرح مرنا فطری نہیں تھا اور غیر فطری موت کے اس قدر نزدیک ہو کر مجھے ہر شے غیر فطری لگ رہی تھی۔ بجھے ہوئے کوئلوں کا ڈھیر، بنچ، ڈاکٹر کی شکل۔ سب کچھ غیر فطری تھا۔ ہم دونوں کے احساسات ایک طرح کے تھے۔ مگر میں اس کا سا طرز عمل نہیں اپنانا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے علم تھا کہ ہم تمام رات ایک جیسی باتیں سوچتے رہیں گے۔ ہمارے ذہن میں ایک جیسی چیزیں آئیں گی۔ ہم دونوں زرد پڑتے رہیں گے۔ کانپیں گے اور پسینے میں تر بتر ہوں گے۔ میں نے انکھیوں سے ٹام کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر موت کا سایہ تھا۔ میری انا کو دھچکا لگا۔ ایک دوسرے کی معیت میں ہمیں چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں اس سے محو گفتگو رہا تھا۔ اس کی باتیں سنی تھیں اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ہم میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہم جڑواں بھائیوں کی طرح ایک جیسے نظر آ رہے تھے۔ اس لئے کہ ہمیں ایک ساتھ موت کو گلے لگانا تھا۔

ٹام نے میری طرف دیکھے بغیر میرا ہاتھ تھام لیا۔

"پابلو۔ حیرانی ہوتی ہے۔ حیرانی ہوتی ہے کہ ہم مرتے ہیں تو ختم ہو جاتے ہیں۔ بالکل ختم۔ ہمیشہ کے لئے۔"

میں نے کوئی جواب دیئے بغیر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"نیچے دیکھو۔ گندے انسان!"

ٹام گیلے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کی پتلون سے قطرے ٹپک رہے تھے۔

''کیا! یہ کیا ہے؟؟'' اس نے اپنے نیچے دیکھ کر خوف اور حیرانی سے پوچھا۔

''تم اپنی پتلون گیلی کر رہے ہو۔'' میں نے اسے بتایا۔

''ناممکن ہے۔'' وہ غرایا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا...... مجھے تو کچھ بھی محسوس نہیں ہورہا!''

میں نے ڈاکٹر پر نظر ڈالی۔ وہ لاتعلقی سے گیلے فرش کو دیکھ رہا تھا۔ ''اس کی روکنے کی حس کمزور پڑ گئی ہے۔'' چند لمحوں بعد ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ انداز میں رائے زنی کی۔

''میں نہیں جانتا یہ کیا ہے۔'' ٹام نے سختی سے کہا ''میں ڈرا ہوا نہیں ہوں۔ خدا کی قسم میں بالکل خائف نہیں۔''

ڈاکٹر کوئی جواب دیے بغیر سر جھکا کر اپنی نوٹ بک میں کچھ تحریر کرنے لگا۔ میں اور ٹام ڈاکٹر کو دیکھ رہے تھے۔ جوآن بھی ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ ہم تینوں کی نظریں ڈاکٹر پر مرکوز تھیں کیونکہ وہ حیات تھا۔ فقط وہی زندہ آدمیوں کی طرح مصروف تھا۔ اس کا تجسس زندگی کی دلیل تھا۔ اسے سردی بھی محسوس ہورہی تھی۔ اس کا جسم زندہ آدمیوں کی طرح موسم سے متاثر ہو رہا تھا۔ جبکہ ہمیں اپنے جسموں کو محسوس کرنے کے لئے خود کو چھونا پڑ رہا تھا۔ وقفے وقفے سے مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ شاید اب میں بھی گیلے فرش پر بیٹھا ہوں مگر شرمساری سے بچنے کیلئے میں نیچے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کیفیت میں ہم سوائے ڈاکٹر کو دیکھنے کے اور کیا کر سکتے تھے؟ ڈاکٹر اپنی ٹانگوں پر مضبوطی سے کھڑا تھا۔ اس کی جسمانی حرکات وسکنات اس کے قابو میں تھیں۔ وہ سوچ سکتا تھا کہ کل شام اور پرسوں صبح اس کی مصروفیات کیا ہوں گی۔ ڈاکٹر زندہ تھا اور ہم تین سائے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کے وجود سے حرارت اور خون چوس کر ہم دوبارہ زندہ ہونا چاہتے تھے۔

دفعتاً میں اونچی آواز میں ہنسنے لگا۔ میرا قہقہہ سن کر ایک محافظ چوکنا ہوگیا۔ دوسرا بدستور کھلی آنکھوں کے ساتھ سویا رہا۔ نیند میں ڈوبے ہوئے محافظ کی آنکھوں کا سفید حصہ نظر آ رہا تھا اور منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔

میں بیک وقت تھکن اور اضطراب کا شکار تھا۔ میں سوچنا نہیں چاہتا تھا کہ صبح کیا ہوگا۔ موت کے خیال سے چھٹکارا پانے کے لئے میں بار بار سر جھٹک رہا تھا۔ مگر جونہی میری توجہ کسی اور چیز پر مرکوز ہوتی مجھے بندوق کی نالیاں دکھائی دیتیں جو دھیرے دھیرے میرے چہرے کی سمت اٹھنے لگتیں۔ کئی بار گولیاں میرے وجود کو چیرتی چلی گئیں۔ ایک بار تو مجھے بالکل یوں لگا جیسے میں واقعی ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہوں۔ میں اونگھ گیا تھا۔ وہ مجھے دیوار کی سمت کھینچ رہے تھے۔ میں پوری قوت سے مزاحمت کر رہا تھا۔ میں نڈھال ہوکر ان سے ترس کھانے اور رحم کرنے کی درخواست کرنے لگا۔ مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ گولیوں سے چھلنی ہوتے ہی میں نے چیخ مار کر آنکھیں کھول دیں۔ حواس بحال ہوتے ہی میں نے کنکھیوں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ مجھے ڈر تھا کہ شاید ڈاکٹر نے مجھے چیختے ہوئے سن لیا ہے۔ مگر ڈاکٹر ایک کونے میں بیٹھا لاتعلقی سے اپنی مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔ اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ میں پچھلے اڑتالیس گھنٹے سے جاگ رہا تھا اور اب میری آنکھوں میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ اگر میں چاہتا تو اسی لمحے گہری نیند سو سکتا تھا مگر میں اپنی زندگی کے آخری چند گھنٹے سو کر نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ وہ مجھے لینے آ جائیں گے اور میں سر جھکا کر غنودگی کے عالم میں ان

کے ساتھ چل پڑوں گا۔ میں ان سے شاید یہ بھی نہ پوچھ سکوں کہ وہ مجھے جانوروں کی طرح کیوں موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں؟ میں موت سے پہلے سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں سوچنا چاہتا تھا۔ علاوہ ازیں سوتے ہوئے مجھے ڈراؤنے خواب دیکھنے کا اندیشہ بھی لاحق تھا۔ میں نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ موت کے خیال سے بچنے کیلئے میں ماضی کے خوشگوار لمحے یاد کرنے لگا۔ کتنے دلکش چہرے تھے۔ کیسی دلچسپ باتیں تھیں۔ چھٹیاں، تہوار، میلے اور جھولے، چھوٹے ماموں اور ریمون۔ 1926ء میں تین مہینے کی بے کاری۔ وہ فاقوں کے دن۔ احتجاجی جلوس میں شرکت۔ اور غرناطہ کی وہ رات جو میں نے ایک بنچ پر جاگ کر گزاری تھی۔ میں نے تین دن سے کچھ نہ کھایا تھا اور سخت طیش میں تھا۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔

چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور آزادی کی زندگی اور خوبصورت عورتیں جن کے پیچھے میں بھاگتا تھا۔ مجھے ہنسی آنے لگی۔ میں نے دیوانگی کے عالم میں ان کا تعاقب کیا تھا۔ میں اسپین کو آزاد کرانا چاہتا تھا۔ میں مارگل کا شیدائی تھا۔ انقلابیوں کا ساتھی۔ میں نے اسی جدوجہد کو دین ایمان سمجھ لیا تھا۔ میں نے تحریک آزادی کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی۔ میں پرجوش نعرے لگاتا اور تقریریں کرتا۔ میں یہ خیال کرتا تھا کہ میں غیر فانی ہوں۔ اب جبکہ زندگی کا خاتمہ ہو رہا تھا ان ساری چیزوں کا کیا مطلب تھا؟ مجھے یہ سوچ کر تعجب ہوا کہ میں لڑکیوں کی صحبت میں کتنا مسرور تھا۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ مجھے ایسے موت آئے گی تو میں تمام زندگی اپنے بستر سے اٹھنے کی زحمت بھی نہ کرتا۔ میری پوری زندگی میری نظروں کے سامنے آ گئی۔ اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا ...... مجھے کسی بات کا زیادہ افسوس بھی نہیں تھا۔ ممکن ہے عام حالات میں مجھے کچھ چیزیں چھوڑنے کا دکھ ہوتا۔ اپنے پسندیدہ کھانوں کا ذائقہ یاد آتا یا اس پرسکون جھیل کا تصور مجھے افسردگی میں مبتلا کر دیتا جہاں میں گرما کی دوپہر میں پیرا کی کرتا تھا۔ لیکن موت سب چیزوں کی دلکشی چھین کرلے گئی تھی۔

اچانک ڈاکٹر کے ذہن میں ایک خوشگوار تجویز آئی اور وہ ہم سے مخاطب ہوگا۔ دوستو! ''اگر تم پسند کرو تو میں تمہارا آخری پیغام تمہارے پیاروں تک پہنچا دوں گا، بشرطیکہ فوجی حکام نے اجازت دی۔''

''میرا کوئی نہیں ہے۔'' ٹام ناگواری سے بولا۔

میں چپ رہا۔ ٹام میری خاموشی پر حیران تھا۔

''کانشا کے نام کوئی پیغام نہیں بھجواؤ گے؟'' اس نے مجھ سے استفسار کیا۔

''نہیں ......''

آج میرے لئے کانشا کی اہمیت مختلف رنگ اختیار کر چکی تھی۔ کل تک اس سے محض پانچ منٹ گفتگو کرنے کے لئے میں اپنا ایک بازو قطع کروانے پر رضامند ہو جاتا۔ اس لئے میں نے کل شام سے کانشا کا تذکرہ کیا تھا مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ اب کانشا کی میرے لئے کوئی حیثیت نہیں۔ بات کرنا تو درکنار اب میں کانشا کو دیکھنے کا بھی خواہش مند نہیں تھا۔ جب سے میرا جسم زرد پڑا تھا اور میں پسینے میں نہا گیا تھا، مجھے اپنے بدن سے کراہت آنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کانشا کے بدن کی یاد سے بھی متلاہٹ ہونے لگی تھی۔ مجھے علم تھا کہ میری موت کی خبر سن کر وہ بہت روئے گی۔ زندگی میں اس کی دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ کئی دنوں تک وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلے گی۔ مگر بہر حال وہ زندہ رہے گی ...... جبکہ میں مر رہا تھا۔ مجھے

اس کی خوبصورت آنکھیں یاد آئیں۔ جب وہ میری طرف پیار سے دیکھتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی نہایت لطیف چیز اس کے وجود سے نکل کر مجھ میں داخل ہو رہی ہے لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس لمحے وہ مجھے دیکھے گی تو مجھ پر اس کی نظروں کا قطعی کوئی اثر نہیں ہوگا...... اس مرحلے پر میں تنہا تھا۔

ٹام بھی تنہا تھا اگرچہ اس کی تنہائی کا انداز مختلف تھا۔ وہ بنچ پر پاؤں پسارے بیٹھا تھا اور حیرانی سے اسے تکے جا رہا تھا۔ اچانک اس نے بازو بڑھا کر لکڑی کو چھوا۔ اور پھر فوراً ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے چہرے پر خوف کا ایسا تاثر ابھرا جیسے اس نے نادانستگی میں کوئی چیز توڑ دی ہو۔ اس پر دوبارہ لرزہ طاری ہو گیا۔ مجھے ٹام کی حالت پر حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے خود یہ احساس ہو رہا تھا کہ چیزیں مضحکہ خیز انداز میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ دیواروں کا رنگ بھی پیلا پڑ رہا تھا۔ بنچ کی لکڑی، لالٹین یا کوئلوں کی راکھ پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ ہم مرنے والے ہیں۔ تمام چیزیں ایک فاصلے پر کھڑی سر جوڑے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے بستر مرگ پر پڑے مریض کے تیماردار کمرے کے ایک کونے میں دائرہ بنائے کھڑے ہیں اور دبے لہجے میں اس کی موت کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔

میں اس حالت کو پہنچ چکا تھا کہ اب اگر بتایا جاتا کہ میری جان بخشی ہو گئی تب بھی میں سرد ہی رہتا۔ ایک مرتبہ اپنے فانی ہونے کا احساس ہو جائے تو موت میں چند گھنٹے یا چند برس کی تاخیر ایک ہی بات لگتی ہے۔ بس یہ فریب زائل ہونے کی دیر ہے۔ ایک لحاظ سے میں بالکل مطمئن ہو چکا تھا۔ اب کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن خوفناک بات یہ تھی کہ میرا بدن میری مرضی کے بغیر کانپ رہا تھا اور میرے کپڑے پسینے میں یوں تر بتر تھے جیسے میرا وجود اندر ہی اندر پگھل کر ختم ہو جائے گا۔ میں نے خود کو چھوا، ہاتھ سے محسوس کیا، یوں جیسے میں کسی اور کے بدن کو ہاتھ لگا رہا ہوں۔ بعض دفعہ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بوجھ ہے جس کے نیچے میں دبا ہوا ہوں۔ یہ میرا جسم ہی تھا۔ اس میں ایک دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ چیزیں جسم سے باہر آ رہی تھیں۔ کچھ اپنی جگہ ٹھہری ہوئی تھیں۔ پورا وجود ایک انجانے بھاری پن میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ساتھ چمٹ جانے والا مکروہ جاندار۔ یک لخت مجھے محسوس ہوا جیسے مجھے کسی بڑے سے کپڑے کے اندر لپیٹ کر باندھ دیا گیا ہے۔

ایک دفعہ میں نے اپنا پاجامہ چھوا۔ وہ گیلا تھا۔ یہ پسینہ تھا یا پیشاب؟ میں نے احتیاطاً کوئلے کے ڈھیر پر جا کر پیشاب کیا۔

"ساڑھے تین بج گئے۔" ڈاکٹر نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم چونک گئے۔ ہم بھول گئے تھے کہ وقت گزر رہا ہے۔ رات ایک سیاہ عفریت کی طرح ہمیں اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ شام کب اختتام کو پہنچی؟ رات کب شروع ہوئی؟

جوآن نے رونا شروع کر دیا۔ وہ ہاتھ ملتے ہوئے گڑگڑانے لگا:

"میں مرنا نہیں چاہتا...... میں کیوں مروں؟ میں نہیں مروں گا"

اس نے اپنے بازو ہوا میں بلند کئے اور کوٹھری میں ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ وہ سسکیاں لیتا ہوا ایک کونے میں ڈھیر ہو گیا۔ ٹام نے اسے تاسف بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ اسے دلاسا نہیں دینا چاہتا تھا۔ بس سوگواری سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

جوآن ہم سے زیادہ شور مچا رہا تھا مگر وہ ہماری نسبت کم متاثر تھا۔ اس کی حالت اس بیماری سی تھی جو اپنی بیماری کی مدافعت تیز بخار سے کرتا ہے۔ اس کے برعکس کسی کا جسم اپنی حرارت ہی کھو بیٹھے تو وہ زیادہ خطرناک بات ہوگی۔ میں اور ٹام تو ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔

جوآن رو رہا تھا۔ اسے اپنی حالت پر رحم آ رہا تھا۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی۔ ایک لمحے کے لئے میرا جی چاہا کہ میں بھی اپنی حالت پر دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ مگر اس کے برعکس میں نے چھوٹے کو غور سے دیکھا اور محسوس کیا کہ میں غیر انسانی طور پر لاتعلق ہو چکا ہوں۔

''میں باوقار انداز میں مروں گا۔'' میں نے خود کو کہتے سنا۔

صبح کے آثار دیکھنے کے لئے ٹام چھت کے روزن کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ جب سے ہمیں ڈاکٹر نے وقت بتایا تھا لمحے پھیلتے محسوس ہو رہے تھے۔ ہم اپنی زندگی کو قطرہ قطرہ ختم ہوتے دیکھ رہے تھے۔

''سن رہے ہو؟'' ٹام کی وحشت زدہ آواز آئی۔

''ہاں۔''

''ابھی رات باقی ہے لیکن انہوں نے احاطے میں چلانا شروع کر دیا ہے۔ معلوم نہیں کم بختوں کا کیا ارادہ ہے۔ بہرحال اندھیرے میں تو گولی نہیں ماریں گے۔''

''پو پھٹ رہی ہے۔'' میں نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے ٹام سے کہا۔ مجھے آسمان پر اندھیرے کی گہرائی کم ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

زندان میں مدھم روشنی پھیل گئی تھی۔ دور کہیں گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

میں نے ٹام سے کہا: ''کام شروع ہو گیا ہے معلوم ہوتا ہے پچھلے گراؤنڈ میں......'' ٹام نے ڈاکٹر سے سگریٹ طلب کی۔ مجھے سگریٹ، شراب کسی شے کی حاجت نہیں تھی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' اس نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا۔

مگر دروازے کی آہٹ سن کر خاموش ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور ایک افسر چار سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

''ٹام؟'' افسر نے پوچھا۔

ٹام خاموش رہا۔ مگر محافظ نے اس کی جانب اشارہ کر دیا۔

''جوآن؟''

''وہ......وہ جو فرش پر بیٹھا ہے۔'' محافظ نے کہا۔

''اٹھو۔'' افسر جوآن سے مخاطب ہوا۔

جوآن نے خود کو مزید سمیٹ لیا۔ سپاہیوں نے اس کی بغلوں میں بازو ڈالے، اور گھسیٹ کر کھڑا کر دیا، لیکن جونہی سپاہی ہٹے وہ پھر ڈھیر ہو گیا۔ سپاہیوں نے تذبذب سے افسر کی جانب دیکھا۔

افسر نے کہا۔ "یہ پہلا آدمی نہیں جس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ اسے اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔ وہ اس کا بندوبست کرلیں گے۔" پھر ٹام کی سمت گھومتے ہوئے بولا۔ "چلو۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

ٹام دو سپاہیوں کے حصار میں افسر کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ بقیہ دو سپاہیوں نے چھوٹے کو اٹھا لیا۔ وہ بے ہوش نہیں تھا۔ البتہ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر اُبلی پڑ رہی تھیں اور رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں بن رہی تھیں۔ میں کھڑا ہوا تو افسر نے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا۔

"تمہارا نام پابلو ہے؟"

"ہاں۔"

"تم یہیں ٹھہرو۔ ابھی تھوڑی دیر بعد وہ تمہیں بلوائیں گے۔"

ڈاکٹر اور دونوں محافظ بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ اب میں بالکل اکیلا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وقفے وقفے سے گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہر آواز پر میں کانپ اٹھتا۔ میرا جی چاہا کہ میں اپنے بال کھینچوں اور زور زور سے چیخوں۔ لیکن میں نے اپنے ہاتھ جیبوں میں ڈال لیے اور ہونٹوں کو سختی سے دبا لیا۔ میں باوقار انداز میں مرنا چاہتا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے۔ وہاں سگار کی بو اور سگریٹوں کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ کمرہ اتنا گرم تھا کہ سانس لینے میں بھی دقت ہو رہی تھی۔ دو افسر بازوؤں والی کرسیوں میں براجمان اپنے سامنے کاغذات پھیلائے بیٹھے تھے۔

"تمہارا نام پابلو ہے؟" ایک نے سوال کیا۔

"ہاں۔"

"ریمون کہاں ہے؟"

"مجھے علم نہیں۔"

"ادھر آؤ۔" سوال کرنے والے افسر نے اشارہ کیا۔

وہ پستہ قد تھا۔ میں نزدیک گیا تو اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ عینک میں سے اس کی آنکھیں سخت نظر آتی تھیں۔ اس نے مجھے پوری طاقت سے جھنجوڑا اور بازوؤں میں انگلیاں چبھو دیں۔ وہ مجھے تکلیف میں ڈال کر مرعوب کر رہا تھا۔ چند لمحوں تک ہم دونوں اسی حالت میں خاموش کھڑے رہے۔ اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ اپنا گندہ سانس مجھ پر چھوڑ دے۔ اچانک مجھے ہنسی آنے لگی۔ جو مرنے والا ہو اسے ڈرانا بہت مشکل ہے۔ اس کی ترکیب ناکام ہو رہی تھی۔ اس نے جھٹکے سے مجھے پرے دھکیلا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تم دونوں میں سے کسی ایک کو مرنا ہے۔" اس نے سختی سے کہا۔ "اگر تم نے ریمون کا ٹھکانہ بتا دیا تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔"

"یہ دونوں افسر بھی ایک دن مر جائیں گے۔" مجھے خیال آیا۔

"میرے کچھ عرصے بعد سہی مگر بہرحال یہ دونوں بھی جو اس وقت اتنی شان سے اکڑ کر بیٹھے ہیں ایک دن خاک ہو جائیں گے۔ لیکن یہ

بے خبر ہیں۔ یہ جو فہرستوں میں دوسروں کے نام تلاش کر رہے ہیں، انہیں ڈھونڈ رہے ہیں تا کہ انہیں موت کے گھاٹ اتار سکیں...... ملکی امور پر ان کی اپنی رائے ہے۔ دوسرے معاملات پر بھی ذاتی پسند اور ناپسند ہے۔ مگر انہیں نہیں معلوم کہ ان کی یہ تمام سرگرمی اور جوش وخروش کس قدر بے معنی اور مضحکہ خیز ہے۔ انہیں اپنے پاگل پن کا ابھی قطعاً علم نہیں ہے۔"

موٹا پستہ قد افسر مجھے گھورتا رہا اور اپنے جوتے پر نخوت سے ہنٹر بجاتا رہا۔ وہ اپنی حرکت سے خود کو خطرناک اور خونخوار ثابت کرنا چاہتا تھا۔

"تو؟...... پھر؟...... کچھ سوچا تم نے؟" اس کی آواز میں دھمکی تھی۔

"مجھے نہیں معلوم ریمون کہاں ہے۔" میں نے چڑ کر کہا۔ "اسی شہر میں کہیں ہوگا۔" دوسرے افسر نے تھکن ظاہر کرنے کے لئے اپنا ہاتھ آہستہ سے اٹھا کر پیشانی پر رکھا۔ دراصل وہ مجھے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس سارے معاملے سے عاجز آ چکا ہے۔ وہ محض اداکاری کر رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ بعض لوگ کیونکر بچوں کی سی حرکتیں کرتے ہیں۔

"تمہارے پاس فیصلہ کرنے کے لئے پندرہ منٹ ہیں۔" اس نے کہا اور پھر گھوم کر سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "اسے چھوٹے کمرے میں لے جاؤ۔ پندرہ منٹ بعد واپس لے آنا۔ اگر یہ اپنی ضد پر قائم رہا تو اسے گولی ماردی جائے گی۔"

میں جانتا تھا ان کا مقصد کیا ہے۔ وہ میرے اعصاب توڑ رہے تھے۔ میں نے پوری رات انتظار کیا تھا۔ پھر جب وہ ٹام اور جوآن کو گولیوں سے اڑا رہے تھے۔ مجھے انہوں نے ایک گھنٹے تک کوٹھڑی میں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ مجھے دوبارہ تنہا بند کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آدمی کے اعصاب بالآخر جواب دے جاتے ہیں۔ جب میں اندر سے ٹوٹ گیا تو بول پڑوں گا۔ انہیں سب کچھ بتادوں گا۔

چھوٹے کمرے میں داخل ہوتے ہی میں کمزوری کے باعث نیچے بیٹھ گیا۔ میں نے ازسرنو چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میں جانتا تھا کہ ریمون کہاں ہے۔ شہر سے چار میل دور وہ اپنے چچازاد بھائی کے گھر چھپا ہوا تھا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے اس کا پتا حاصل نہیں کرسکتی تھی۔ جسمانی اذیت کی بات اور ہوتی ہے۔ ممکن ہے میں جسمانی اذیت کے سامنے بے بس ہو جاتا، لیکن لگتا تھا کہ وہ مجھے جسمانی اذیت پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے ہیں...... میں اس صورتحال کا تجزیہ کرنا چاہتا تھا۔ میں مرجاؤں گا لیکن ریمون سے غداری نہیں کروں گا...... لیکن کیوں؟ صبح ہونے سے ذرا پہلے اس کی دوستی میرے لئے بے معنی ہو چکی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے کا نشا سے میری محبت اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ ریمون ٹھیک ہے میں اس کی عزت کرتا تھا مگر یہ ایسی وجہ نہیں تھی کہ میں اس کے لئے مرنے پر تیار ہو جاتا۔ اس کی زندگی میری زندگی سے زیادہ قیمتی کیسے ہوسکتی ہے؟ کسی کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ کسی بھی آدمی کو دیوار کے سامنے کھڑا کر کے اس پر گولیاں چلائی جاسکتی ہیں۔ جسے بھی گولیاں لگیں گی وہ منہ کے بل زمین پر آ گرے گا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہلاک ہونے والا آدمی میں ہوں یا ریمون ہے۔ یا کوئی اور ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اسپین کی آزادی کے لئے ریمون کی زندگی میری زندگی سے زیادہ قیمتی ہے۔ لیکن ملک کا کیا مطلب ہے؟ آزادی سے کیا ہوتا ہے؟ کسی بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں مر رہا ہوں، جب کسی بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے تو ریمون کا پتا بتا کر میں اس مضحکہ خیز صورتحال سے نکل کیوں نہیں جاتا؟ میری ضد اب تک کیوں قائم ہے؟

بلاشبہ میں ریمون کا پتہ بتا کر اپنی جان بچا سکتا تھا۔ مگر دل اس بات پر آمادہ نہیں تھا۔ ممکن ہے میرا فیصلہ مضحکہ خیز ہو۔ محض ایک ضد۔

''میں اپنی انا سلامت لئے جا رہا ہوں۔'' میں نے سوچا اور مجھے عجیب کی طرح کی طمانیت کا احساس ہوا۔

کچھ دیر بعد وہ مجھے لینے آ گئے اور دوبارہ افسروں کے سامنے پیش کرنے کے لئے چل پڑے۔ راہداری سے گزرتے ہوئے اچانک ہمارے قدموں تلے سے ایک چوہا نکل کر دوسری طرف بھاگا۔ مجھے یہ منظر بہت دلچسپ لگا۔ میں ہنس پڑا:

''تم نے چوہا دیکھا؟'' میں نے ایک سپاہی سے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسکے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ جہاں تک میرا تعلق تھا تو میں ہنسنا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے ڈر تھا کہ ایک مرتبہ میں ہنس پڑا تو ہنستا چلا جاؤں گا۔ رُک نہیں سکوں گا۔

بڑی مونچھوں والے محافظ نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا تو میں نے کہا ''احمق، تمہیں اپنی مونچھیں کاٹ دینی چاہئیں۔''

اس نے نیم دلی سے مجھے لات رسید کی تو میں چپ ہو گیا۔

موٹے افسر نے پوچھا ''تم نے اچھی طرح سے سوچ لیا؟''

میں نے افسروں کو غور سے دیکھا۔ وہ ایسے کیڑے لگ رہے تھے جو صرف مخصوص موسموں میں دکھائی دیتے ہیں۔

''میں جانتا ہوں ریمون کہاں ہے۔'' میں نے روانی سے کہا۔ ''وہ مرکزی قبرستان کی کسی قبر میں چھپا ہوا ہوگا۔ یا گورکن کی جھونپڑی میں۔'' میں نے یہ بات ازراہ مذاق کی تھی۔ محض انہیں اُلو بنانے کے لئے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اُچھل اُچھل کر پیٹیاں کسیں، ٹوپیاں سیدھی کریں اور بے معنی احکامات جاری کریں۔ اور وہ واقعی اچھل پڑے تھے۔

''خوب! ٹھیک ہے! اچھا! پندرہ آدمی تیار کرو۔ فوراً۔''

موٹے افسر نے روانگی سے قبل مجھے مخاطب کیا۔ ''اگر تم نے سچ بولا ہے تو میرا ایک لفظ کہہ دینا کافی ہے اور اگر تم نے ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے تو اپنے انجام کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

وہ سب جلدی سے رخصت ہو گئے اور میں اطمینان سے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ محافظ بدستور میری نگرانی کر رہے تھے۔ میں نے تصور کیا کہ اس لمحے وہ قبروں کے پتھر الٹ رہے ہوں گے۔ گورکن کی چار دیواری میں کود رہے ہوں گے۔ اپنی ناکامی پر بُرے بُرے منہ بناتے، قبرستان کی جھاڑیوں میں اچھلتے کودتے وردی پوش۔ میں بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کر رہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد موٹا افسر اکیلا واپس آیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ مجھے گولی سے اڑانے کا حکم صادر کرنے آیا ہے۔ باقی وہیں قبرستان میں منڈلا رہے ہوں گے۔ میں اپنی سزا سننے کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ افسر نے میری طرف دیکھا اور محافظوں سے کہا: ''اسے بیرونی احاطے میں لے جاؤ۔ فوجی کارروائی ختم ہونے کے بعد اس کا فیصلہ شہری انتظامیہ کرے گی۔''

مجھے اپنی سماعت پر شبہ ہونے لگا۔ میں نے پوچھا:

''تو کیا وہ مجھے گولی نہیں مار رہے؟''

''بہر حال ابھی تو نہیں...... '' ایک محافظ نے کہا۔

''لیکن کیوں......کیوں؟''

اس نے لاعلمی کے اظہار کے لئے کندھے اچکائے اور خاموش ہوگیا۔ سپاہی مجھے باہر کی جانب گھسیٹنے لگے۔ بیرونی احاطے میں سینکڑوں کی تعداد میں بچے، عورتیں اور بوڑھے قیدی جمع تھے۔ قیدیوں کے درمیان چلتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میرا دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔ دوپہر کے وقت ہمیں کھانا دیا گیا۔ کئی آدمیوں نے مجھ سے سوال کئے۔ لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ یقیناً میرے شناسا ہوں گے۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔

شام کے وقت چند نئے قیدی احاطے میں دھکیلے گئے۔ میں نے اپنے محلے کے نان بائی گریشیا کو پہچان لیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا ''خدایا! تم زندہ ہو؟''

میں نے کہا ''انہوں نے مجھے موت کی سزا سنائی تھی مگر پھر رائے بدل لی۔ معلوم نہیں کیوں۔''

''مجھے دو بجے گرفتار کیا گیا۔'' گریشیا نے بتایا۔

''کیوں؟ تمہارا تو سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔''

وہ تاسف سے بولا ''جو بھی ان کی طرح نہیں سوچتا، وہ اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گریشیا بولا۔ ''انہوں نے ریمون کو بھی گرفتار کر لیا ہے۔''

مجھ پر لرزہ طاری ہوگیا۔

''کب؟''

''آج صبح۔ ریمون نے عجیب احمقانہ حرکت کی۔ منگل کو وہ چچا کے لڑکے سے کسی بات پر خفا ہو کر گھر سے نکل گیا۔ اس سے کچھ چخ چخ ہوگئی تھی۔ اسے کئی لوگ پناہ دینے کو تیار تھے مگر وہ کسی کا احسان نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ کہنے لگا ''پابلو ہوتا تو میں اس کے گھر رہتا۔ وہ میرا دوست ہے۔ مگر جب وہی گرفتار ہوگیا تو اب میں دوسروں کا احسان کیوں لوں۔ میں قبرستان میں چھپ جاؤں گا۔''

''قبرستان!؟''

''ہاں۔ بھلا اس سے بڑی حماقت کیا ہو سکتی تھی؟ صبح وہ وہاں آ گئے۔ یہ ہونا ہی تھا۔ گورکن کی جھونپڑی سے انہوں نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے ان پر گولی بھی چلائی مگر بالآخر انہوں نے اسے دھر ہی لیا!''

''قبرستان میں؟''

تمام چیزیں میرے دماغ میں گھومنے لگیں۔ میں نے اپنے آپ کو زمین پر بیٹھا پایا۔ یکا یک میں اتنی زور سے ہنسا کہ میری آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔

☆......☆......☆

جنگ اور آدمی

میخائل شولوخوف روس کے صاحب طرز اور شہرہ آفاق ادیب تھے۔ وہ 24 مئی 1905ء کو ویرلنسکا یاروف میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے معمولی تعلیم حاصل کی۔ وہ کسی کالج سے سند یافتہ نہیں تھے۔ جب وہ محض تیرہ برس کے تھے تو انہوں نے روسی فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1922ء میں اس ملازمت کو خیر باد کہہ دیا اور ماسکو میں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالنے لگے۔ اس دوران سیاست اور لکھنے لکھانے کی طرف راغب ہوئے۔ انہیں ادبی خدمات کے اعتراف میں 1941ء میں سٹالن پرائز 1960ء میں آرڈر آف دی فادر لینڈ لینن پرائز اور 1967ء میں ہیرو آف سوشلسٹ لیبر کا ایوارڈ ملا۔ انہیں آرڈر آف لینن سے آٹھ بار نوازا گیا۔ ان کے ناول "اور ڈان بہتا رہا" کو عالمگیر شہرت نصیب ہوئی۔ یہ معرکتہ الآرا ناول انہوں نے چودہ برسوں میں مکمل کیا تھا۔ یہ ایک رزمیہ ناول تھا جس میں انیسویں صدی کے روسی معاشرے کی حقیقی تصویر کشی کی گئی تھی۔ اسی ناول کی بناء پر انہیں 1965ء میں نوبل انعام کا حق دار گردانا گیا۔ ان کے دیگر ناولوں میں "دی سیڈز آف ٹومارو" کو بھی خاصی پزیرائی ملی۔ ان کی کہانیوں اور ناولوں کا دنیا کی سب بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ذیل کی تاثر انگیز طویل کہانی انہوں نے 1957ء میں تحریر کی۔ اس پر فلم بھی بنائی گئی جسے بین الاقوامی فلمی میلے میں اول انعام عطا کیا گیا۔ میخائل شولوخوف نے 21 فروری 1984ء کو انتقال کیا۔

☆......☆......☆

ہمارے لئے برف پر چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ ہمارے قدم جب بھربھری برف کو کچلتے تو چر مر کی آوازیں پیدا ہوتیں۔ سڑک کے دونوں اطراف پگھلتی ہوئی برف کے ریزے چمک رہے تھے۔ جنگ کے اختتام پر دریائے ڈان کے بالائی علاقے میں موسم بہار نے ڈیرے ڈالے تو گرم ہوا نے دو دن کے اندر رتیلے کنارے پر گری برف صاف کر دی۔ البتہ دوسرے علاقوں میں برف اب پگھلنا شروع ہوئی تھی اور جب برف پگھلی تو ندی نالوں میں طغیانی آ گئی۔ دریا پورے زور وشور سے بہنے لگا۔ اس برے وقت میں مجھے قسکا یا قصبے کا سفر کرنا پڑا۔ فاصلہ اتنا زیادہ تو نہیں تھا۔ کوئی ساٹھ کلو میٹر رہا ہو گا مگر اسے طے کرنا دوبھر معلوم ہوتا تھا۔ میں اور میرا ساتھی علی الصبح روانہ ہو گئے وہ مضبوط گھوڑے بمشکل بھاری بھرکم گاڑی کو کھینچ پاتے تھے۔ برف زدہ سخت زمین میں گاڑی کے پہیے دھنسے جاتے تھے۔ ایک گھنٹے میں گھوڑے ہانپنے لگے اور سفید سفید جھاگ ان کے منہ سے نکلنے لگا۔ صبح کی تازہ ہوا میں گھوڑے کے پسینے اور ان کے اوپر سجے ہوئے سازوں پر لگے ہوئے روغن کی ملی جلی بو رچ بس گئی۔ گاڑی نہ چلنے کی صورت میں ہم اتر کر پیدل چلنے لگتے تھے۔ چھ گھنٹوں میں ہم بمشکل آدھا فاصلہ طے کر پائے اور دریائے بلانکا کے کنارے پہنچ گئے جہاں دریا پار کرنے کے لئے کشتی ملتی تھی۔

شومئی قسمت کہ ہمیں ایسی کمزور کشتی ملی جو تین آدمیوں سے زیادہ کا بوجھ نہیں سہار سکتی تھی اور اس کے پیندے سے پانی رسنے لگتا تھا۔ مجبوراً گھوڑوں کو ہمیں وہیں چھوڑنا پڑا۔ دوسرے کنارے پر کھپریل کی کوٹھری تلے ہماری خوب چلی ہوئی پرانی جیپ پہلے سے موجود تھی۔ میں اور ڈرائیور اس بوسیدہ کشتی میں سوار ہو گئے۔ میرا ساتھی سامان سمیت کروہیں کھڑا رہ گیا۔ ہم راستے بھر کشتی کے پیندے سے رستے والا پانی نکالتے رہے۔ ایک گھنٹے میں ہم دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ ڈرائیور جیپ کنارے تک لایا اور پھر کشتی میں بیٹھ کر چپو سنبھالتے ہوئے بولا۔

"کشتی اگر سلامت رہی تو میں دو گھنٹے میں انہیں لے کر آتا ہوں۔ اس سے پہلے آپ ہمارے آنے کی توقع نہ کیجئے گا۔"

کنارے پر درخت کا ایک موٹا سا تنا پڑا تھا۔ میں اسی پر بیٹھ گیا، سوچا سگریٹ ہی پی لوں۔ لیکن جب جیب میں ہاتھ ڈالا تو بڑا افسوس ہوا۔ "چیلز مورڈ" نامی نکی کی سگریٹ کا پیکٹ بھیگ چکا تھا۔ راستے میں پانی کی ایک لہر کشتی پر گری تھی جس سے میں کمر تک شرابور ہو گیا تھا۔ بڑی احتیاط سے میں نے جیب سے بھیگا ہوا پیکٹ نکالا اور بھیگی ہوئی سگریٹ نکال کر تنے پر رکھنے لگا۔ دھوپ تیز تھی اس لئے امید تھی کہ سگریٹ جلد خشک ہو جائیں گے۔ مجھے اس تنے پر بیٹھنا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ تنہائی، سناٹا آس پاس کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ کیوں یہ فوجیوں جیسا موٹا اور بھاری بھرکم کوٹ پہن لیا۔ میں نے اپنے سر سے پرانا فوجی کنٹوپ اتار دیا تاکہ بھیگے ہوئے بال سوکھ جائیں۔

سامنے گاؤں کی طرف سے ایک شخص سڑک پر آیا۔ ایک چھوٹے سے لڑکے نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا جو دیکھنے میں پانچ سال کے لگ بھگ نظر آ رہا تھا۔ دونوں تھکے تھکے قدم اٹھاتے دریا کے کنارے کی طرف جا رہے تھے مگر جیپ دیکھ کر میری طرف مڑ گئے۔ وہ لمبا تڑنگا اور قدرے جھکے ہوئے شانوں والا شخص تھا۔ قریب آ کر اس نے پھٹی پھٹی اور بھاری آواز میں کہا۔ "سلام بھائی۔"

"سلام!"

میں نے اس کے موٹے چوڑے اور کھردرے ہاتھ سے ہاتھ ملایا۔ نو وارد نے بچے کی طرف جھکتے ہوئے کہا "بیٹے! اپنے چچا کو سلام کرو یہ بھی تو میری طرح ڈرائیور ہی دکھائی دیتے ہیں' ہم دونوں ٹرک چلاتے ہیں لیکن ان کے پاس جیپ ہے۔"

لڑکے نے اپنی بڑی بڑی روشن آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور بڑی بیباکی سے مسکراتے ہوئے اپنا چھوٹا سا سرد اور گلابی ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے مذاق میں پوچھا۔ "کیوں بڑے میاں' کیا بات ہے؟ اتنا سرد ہاتھ؟ اتنی گرمی ہے اور تم ہو کہ سردی سے ٹھٹھرے جا رہے ہو۔"

"اجی واہ میں کیوں ہونے لگا بڑے میاں' اور سردی سے کہاں ٹھٹھر رہا ہوں' بس ذرا ہاتھ ہی تو ٹھنڈے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں ہاتھوں سے برف کے گولے بنا رہا تھا۔"

بچے کے باپ نے پشت سے سامان کی چھوٹی سی پوٹلی اتاری اور میرے برابر تنے پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "جناب اس ننھے مسافر نے تو میرا ناک میں دم کر رکھا ہے اس کے ساتھ سفر کرنا کسی مصیبت سے کم نہیں ہے۔ چیونٹی کی چال چل رہا ہوں لیکن جہاں ذرا نظریں چوکیں۔ یہ لگا پانی میں چھپ چھپ کرنے' یا پھر برف کا ٹکڑا منہ میں ڈال کر چوسنے لگتا ہے" چند لمحے توقف کے بعد اس نے پوچھا "کس کا انتظار کر رہے ہو بھائی؟ اپنے افسر اعلیٰ کا؟"

اس کی یہ غلط فہمی کہ میں کسی کا ڈرائیور ہوں' مجھے دور کرتے اچھی نہیں لگی' میں نے معاملے کو یونہی چلنے دیا۔ "ہاں انتظار تو کرنا ہی ہوگا۔"

"دریا کے اس پار سے سواری آنے والی ہے کیا؟"

"ہاں"

"کچھ پتا ہے' کتنی دیر میں کشتی آجائے گی؟"

"دو گھنٹے تو لگیں گے۔"

"بہت خوب' خیر میرا کیا مجھے کونسی جلدی پڑی ہے کچھ دیر آرام کر لیں گے' ادھر سے گزرتے ہوئے جو دیکھا کہ اپنا ایک ڈرائیور بھائی اکیلا بیٹھا انتظار کر رہا ہے تو سوچا چلو مل کر سگریٹ پیتے ہوئے گپ شپ ہی لڑاتیں چلیں گے' اکیلے تو سگریٹ پینا بھی کچھ اچھا نہیں لگتا۔ کسی کا ساتھ ہونا ضروری ہے جو دو باتیں اپنے دل کی کہے اور دو باتیں میری سنے' سچ بات تو یہ ہے کہ مرنا بھی اکیلے نہیں چاہیے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہاری زندگی بڑے مزے میں گزر رہی ہے۔ نکلی والی سگریٹ پیتے ہو؟ بھگو لیا پیکٹ؟ یہ تو بہت برا ہوا' بھیگا ہوا سگریٹ اور بیمار گھوڑا' دونوں کسی کام کے نہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ یہ میری اینٹ مارکہ سگریٹ پھونک لو۔"

اس نے فوجی پتلون کی جیب سے عنابی رنگ کا ریشمی بٹوا نکالا جس کے کونے پر کڑھا ہوا تھا۔ "لیوبا ہائی اسکول کی چھٹی جماعت کے طالبعلم کی طرف سے مادر وطن کے محافظ عزیز فوجی کے لئے۔"

ہم خاموشی سے کچھ دیر تک گھر کے بنے ہوئے کڑوے تمباکو کے کش لگاتے رہے۔ میرے جی میں آئی کہ اس سے پوچھوں ایسے خراب راستے پر بچے کو لے کر کہاں اور کس لئے جا رہے ہو مگر اس سے پیشتر ہی اس نے کہا۔ "تو کیا پوری لڑائی ڈرائیوری کرتے رہے؟"

"ہاں تقریباً ساری لڑائی۔"

"اگلے مورچوں پر؟"

"ہاں زیادہ تر اگلے مورچوں پر ہی رہا۔"

"اپنا حال بھی یہی رہا۔"

میں نے نو وارد کی آنکھوں میں دیکھا تو کانپ اٹھا' اس کی آنکھوں سے جگر کاٹنے والی افسردگی جھانک رہی تھی جو مجھ سے نہ دیکھی گئی اور میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔

درخت کے تنے سے اس نے موٹا سا ریشہ نکالا اور زمین پر آڑی ترچھی لکیروں سے ایک مبہم سی تصویر بنائی اور پھر سر اٹھا کر بولا۔ "بعض اوقات رات رات بھر نیند نہیں آتی' خالی خالی نظروں سے اندھیرے کو تکے جاتا ہوں اور سوچنے لگتا ہوں کہ اے زندگی تو نے میری راہ خارزار کیوں بنائی۔ آخر یہ کس قصور کی سزا ہے؟ مگر اس کا جواب اندھیرے سے ملتا ہے نہ اجالے سے اور جواب ملنے کی امید بھی نہیں۔"

بمشکل اس نے خود کو سنبھالا اور بڑے پیار سے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "جاؤ بیٹا' پانی کے پاس جا کر کھیلو مگر دیکھو پانی میں

پیر نہ بھگولینا' سردی لگ جائے گی۔"

میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ لڑکا بڑے سلیقے سے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ بٹن پورے ٹنکے ہوئے تھے۔ کئی جگہ بڑی خوبصورتی سے پیوند لگائے گئے تھے۔ موزے پر بھی پیوند لگے ہوئے تھے۔ بچے پر کسی عورت کی توجہ لگتی تھی۔ اس کے کپڑوں سے ماں کی سلیقہ شعاری کا پتا چلتا تھا۔ جبکہ اس کے باپ کا حلیہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ اس کا کوٹ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور بعض جگہ بڑے پھوہڑپن سے پیوند لگانے کی کوشش کی گئی تھی۔ موٹے اونی موزے بھی پھٹے ہوئے تھے۔ یقیناً کسی عورت کی نظر کرم اس پر نہیں تھی۔ میں نے سوچا یا تو اس کی بیوی مر چکی ہے یا پھر بیوی سے ان بن رہتی ہے۔

کچھ دیر وہ بیٹے کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ اس نے گلا کھنکار کر صاف کیا' اور کہنے لگا۔ "میں 1900ء کے قحط میں' کیکویذ سے کے ڈویژن میں کیوبان کی طرف چلا گیا اور کھاتے پیتے کاشتکاروں کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ میری ماں باپ اور بھائی بہن سب بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ میرا کوئی اور عزیز رشتے دار بھی نہ تھا۔ کیوبان میں میں ایک سال رہا اس کے بعد واپس آ گیا اور گھر بیچ کر پھر ورونیز چلا گیا۔ وہاں پہلے تو کچھ دن بڑھئی کا کام کرتا رہا۔ پھر کارخانے میں ملازمت کر لی اور تھوڑے ہی عرصے میں مستری بن گیا۔ پھر شادی کر ڈالی۔ یتیم خانے میں پرورش پانے والی بیوی ملی خدمت گزار' صابر' ہنس مکھ اور فرمانبردار۔ بچپن ہی سے اس نے بے پناہ دکھ اٹھائے تھے۔ دنیا کے دکھ درد اور نشیب و فراز سے خوب واقف تھی۔ اس لئے ہر کام میں کفایت شعاری سے کام لیتی تھی۔ میں بہت خوش تھا کہ مجھے اتنی اچھی بیوی ملی۔

کام سے تھکا ماندہ جب میں گھر میں داخل ہوتا تو غصے سے خوب بک بک جھک جھک کرتا مگر وہ چپ چاپ میری کڑوی کسیلی باتیں پی جاتی بڑی نرمی اور پیار سے جوتے اتارتی جلدی جلدی کھانا گرم کر کے لے آتی۔ کھانا کھانے کے بعد اٹھتا تو ہاتھ دھلاتی اور پانی کا گلاس بڑے ادب سے پیش کرتی خوب کڑک چائے بنا کر دیتی اور جب میں بستر پر لیٹ جاتا تو پاؤں دبانے لگتی پھر مجھے بے اختیار اس پر رحم آ جاتا اور اپنے آپ پر لعنت ملامت کرنے کے بعد' اس سے کہتا۔ "پیاری ایریٹا کا مجھے معاف کر دینا۔ میں نے خواہ مخواہ تم سے جلی کٹی باتیں کیں' دراصل کام کا معاملہ ذرا گڑبڑ ہے اس لئے موڈ خراب رہتا ہے میں اپنے آپ میں نہیں رہتا۔"

تنخواہ ملنے پر میں یاردوستوں کے ساتھ شراب خانے میں چلا جاتا۔ خوب جی بھر کے دیسی شراب پیتا اور پھر نشے میں بدمست لڑکھڑاتا ہوا گھر آتا تو وہ مجھ سے بجائے لڑنے جھگڑنے کے بڑی اچھی طرح پیش آتی۔ موٹے موٹے کپڑے اور جوتے اتار کر مجھے بستر پر لٹا دیتی اور اس وقت تک میرا سر دباتی رہتی جب تک کہ میں سو نہ جاتا'۔

صبح کام پر جانے سے کوئی دو گھنٹے پہلے مجھے جگا دیتی تاکہ ٹھیک سے تیار ہو جاؤں۔ کوئی نمکین کراری چیز اور واڈ کا ایک جام میرے آگے رکھ دیتی تاکہ خمار اتر جائے۔ پیار سے کہتی۔ "لو میری جان یہ کھالو اور آئندہ شراب نہ پینا۔ یہ بہت بری بات ہے۔"

میں پیار سے اسے اپنی مضبوط بانہوں میں بھینچ لیتا اور اس کے لب و رخسار کے جی بھر کے بوسے لینے کے بعد اس سے وعدہ کر لیتا کہ آئندہ شراب نہیں پیوں گا۔ لیکن دوسرے دن جب رات گئے گھر آتا تو میرے قدم لڑکھڑا رہے ہوتے۔

خیر کچھ عرصے بعد بال بچے ہونے لگے۔ پہلے تو ایک لڑکا پیدا ہوا اور پھر یکے بعد دیگرے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ اب بچوں کی ذمہ داریاں جو بڑھیں تو میں یار دوستوں سے پیچھا چھڑانے لگا۔ جو تنخواہ ملتی سب گھر لے آتا شراب پینا ترک کر دینا پڑا۔ بڑا کنبہ بڑا جنجال جو ہوتا ہے۔ چھٹی کے دن البتہ ایک آدھ پیالہ چڑھا لیتا تھا۔

۱۹۲۹ء کے بعد مجھے موٹر گاڑیوں سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اور مستری سے ٹرک ڈرائیور ہوگیا۔ یوں ٹرک چلاتے چلاتے دس سال بیت گئے۔ کچھ پتا بھی نہ چلا پلک جھپکتے دس سال گزر گئے۔ اس عرصے میں میں نے خوب محنت سے دل لگا کر کام کیا۔ اس سے اتنا کما لیتا تھا کہ اپنا کھانا پینا اوروں سے اچھا ہوتا تھا۔ پہننے بھی اچھا تھے۔ بچے بھی بہت خوش تھے۔ تینوں اسکول میں ہمیشہ اول آتے تھے۔ میرا بڑا لڑکا اناتولی تو بڑا ہوشیار نکلا۔ ریاضی میں تو اس نے کمال کر دکھایا۔ ضلع بھر میں اول آیا۔ ان دس سالوں میں کچھ پیسے جمع کر کے ہم نے دو کمروں کا مکان لے لیا۔ میری بیوی نے دو بکریاں بھی پالی تھیں۔ اپنے بچوں کے علاوہ اسے حیوانوں کے بچے پالنے کا بھی بہت شوق تھا۔ اچھا کھانا اچھے کپڑے اور مکان سب کچھ میسر تھا۔ مگر ایک خرابی یہ تھی کہ ہمارا مکان ہوائی جہاز فیکٹری کے پاس واقع تھا۔

پھر جنگ چھڑ گئی' جنگی کمیٹی کی طرف سے مجھے بھی بلا لیا گیا۔ تیسرے دن ریلوے اسٹیشن پر کھڑا تھا۔ میرا کنبہ مجھے الوداع کہنے آیا تھا۔ میری بیوی ایرینا کا بڑا لڑکا اناتولی اور دو بیٹیاں ناسٹیکا اور اولیکا سب بچوں نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ مگر پھر بھی میری بیٹیوں سے ضبط نہ ہوسکا۔ انہیں سنبھالنا تو اچھا خاصا مسئلہ بن گیا۔ وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔ سترہ سالہ اناتولی نے اس طرح جھرجھری لی جیسے اسے سردی لگ گئی ہو۔ اٹھارہ سال سے میں اپنی بیوی ایرینا کو دیکھ رہا تھا مگر اس طرح پھوٹ کر وہ کبھی نہیں روئی تھی۔ رات بھر سسکیاں لے لے کر روتی رہی۔ سارا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ گیا اور صبح ہوتے ہی اس نے پھر رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ اسٹیشن پر ایرینا کی حالت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ بہت زیادہ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ شانوں پر بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے ہوش و حواس جاتے رہے ہوں۔ افسروں نے گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا اور ایرینا کی حالت اور خراب ہوگئی۔ اس نے نڈھال ہو کر اپنا سر میرے سینے سے ٹکا دیا۔ پھر بے تابی سے اپنی بانہیں میری گردن میں ڈال دیں۔ اس پر رعشہ طاری تھا۔ بچے اسے سنبھالنے کی بڑی کوششیں کر رہے تھے۔ میں اسے سوجتن کر کے منا رہا تھا مگر وہ سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ دوسری عورتیں اپنے شوہروں اور بیٹوں سے باتیں کر رہی تھیں اور میری بیوی مجھ سے چمٹی رو رہی تھی۔ سر سے پاؤں تک وہ کانپ رہی تھی' جیسے اسے جاڑے کا بخار آ گیا ہو' میں نے اسے بہت سمجھایا "بس کرو میری جان' بہت ہو چکا' اب اپنے آپ کو سنبھالو۔ ارے میری بات تو سنو ایرینا۔ رخصت ہوتے وقت دو الوداعی بول تو کہہ دو۔"

وہ بمشکل بولی "میری جان...... اندرئی...... یہ عمر بھر کی جدائی ہے...... اب کے بچھڑے تو...... شاید ہی کبھی ملیں...... مجھے تو محسوس ہو رہا ہے...... جیسے ہم...... ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے ہوں......"

صدمے سے ایک تو یوں ہی میرا برا حال تھا اور اوپر سے اس کا یہ رونا دھونا۔ وہ اتنا نہیں سمجھتی تھی کہ بھرے پرے گھر کو چھوڑتے ہوئے خود میری کیا حالت ہو رہی تھی۔ اس صدمے سے کیا میرا دل نہیں پھٹا جا رہا تھا؟ میں کوئی بر دکھاوے کے لئے سسرال تو جا نہیں رہا تھا۔ آخر میں بھی تو

انسان ہوں۔ مجھے بے حد غصہ آیا اور میں نے اسے سختی سے پرے دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی تین قدم دور جا گری مگر پھرتی سے اٹھ کر وہ دوبارہ میری طرف بڑھنے لگی۔ کمال ہے مجھے تو جیسے وہ زندہ دفن کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ابھی تو میری موت کا دور دور تک پتا نہیں تھا مگر اس کا مضطربانہ انداز دیکھ کر میں موم کی طرح پگھل گیا۔ آگے بڑھ کر میں نے اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔"

اچانک کہتے کہتے وہ رک گیا جیسے الفاظ اس کے حلق میں اٹک رہے ہوں۔ اس پر ہیجانی کیفیت طاری تھی جس کا مجھ پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سر نہوڑائے بیٹھا ہے۔ اس کے بھاری بھرکم اور موٹے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ موٹے اور بھدے ہونٹ لرز رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "اریٹکا کو اس روز میں نے جو دھکا دیا تھا اس کا مجھے مرتے دم تک افسوس رہے گا۔ خیر اریٹکا سے میں بڑی مشکل سے علیحدہ ہوا۔ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر اسے خوب پیار کیا۔ اس کے ہونٹ برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔ بچوں کو خوب پیار کر کے میں رخصت ہوا۔ ٹرین چلنے لگی تھی۔ میں دوڑتا ہوا ڈبے کے پائیدان پر چڑھ گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو بچے بڑی افسردگی اور حسرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہے تھے۔ وہ مسکرانے کی پوری کوشش کر رہے تھے مگر مسکرایا نہیں جا رہا تھا۔ اریٹکا نے چھاتی کو دونوں ہاتھوں سے بھینچ رکھا تھا۔ اس کے ہونٹ سنگ مرمر کی طرح سفید ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہوئے اس نے ہوائی بوسہ لیا۔ ٹرین پلیٹ فارم کو چھوڑ رہی تھی۔ اریٹکا کی یہ حالت آج تک میرے دل پر نقش ہے۔ اسٹیشن کے اس منظر کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ آج بھی وہ منظر یاد آتا ہے تو دل پھٹنے لگتا ہے۔

اگلے مورچوں پر تیرکوف کے پاس میری ڈیوٹی لگی۔ میرے ذمے ایک بڑا سا ٹرک چلانا تھا۔ اب جنگ کا حال تمہیں کیا سناؤں۔ تم خود ہی دیکھ چکے ہو۔ شروع میں جو کچھ گزری وہ تو تم جانتے ہی ہو۔ گھر سے مسلسل خط آتے تھے جواب دینے کے معاملے میں میں بڑا سست واقع ہوا تھا۔ جی میں آیا تو لکھ دیا نہ آیا تو نہ لکھا اور سچ پوچھو تو لکھنے کے لئے ہوتا بھی کیا تھا۔ بس یہ کہ "یہاں سب خیریت ہے' ہلکی سی جھڑپ ہوئی ہے۔ اس وقت اگرچہ ہم پسپا ہو گئے ہیں تاہم اپنی قوت مجتمع کر کے ہم پھر حملہ کریں گے اور دشمن کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیں گے۔" بس اسی قسم کی احمقانہ باتیں لکھی جاتی ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ٹسوے بہانے اور بیویوں کو خط لکھنے والے لوگ مجھے بالکل پسند نہیں۔ یہ کیا کہ ناک پر کاغذ رکھ کر شیاؤں کئے چلے جا رہے ہیں۔ اپنی دکھ بھری داستان لکھ رہے ہیں مصیبتوں کا دردناک حال بیان کر رہے ہیں پھر جب یہ خط ان کی بیویوں کو ملتے ہیں تو وہ رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیتی ہیں۔ حالانکہ ان کے سروں پر پہلے ہی کافی مصیبتیں ہوتی ہیں۔ میاں سپاہی ہو مرد ذات ہو ہر مصیبت کا ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ اگر صبر نہیں ہوتا تو چوڑیاں پہنو اور گھر میں بیٹھ جاؤ۔ یہ کیا کہ میدان جنگ میں بھی واویلا۔ برستے گولوں اور گولیوں کے اس محاذ پر تم ایسے نکموں کا کیا کام۔

ابھی میدان جنگ میں پہنچے ہوئے مجھے ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ دو بار زخمی ہوا مگر دونوں مرتبہ زخم کاری نہیں آئے۔ بس اچٹتے زخم آئے تھے۔ ایک مرتبہ ہاتھ پر زخم آیا اور دوسری مرتبہ ٹانگ پر۔ پہلی مرتبہ اوپر جہاز سے گولی لگی اور دوسری مرتبہ جرمنوں نے گولیوں سے چھلنی کر ڈالا۔ لیکن بالآخر مئی ۱۹۴۲ء میں لوزوینکی کے قریب قید ہو گیا۔ ہوا یہ کہ جرمن بڑے زور میں آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ایسے نازک مرحلے پر ہماری ۱۲۲ ملی میٹر دہانے کی توپ کی بیٹری سرد ہو گئی۔ گولہ بارود ختم ہو گیا۔ ہم نے اپنے ٹرک میں بم لادے لادتے لادتے میں پسینے میں شرابور ہو گیا۔ کمر پھوڑے کی

طرح دکھنے لگی۔ مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ توپ خانے تک بڑی جلد پہنچنا تھا۔ ہر طرف ٹینکوں کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ گولیاں تڑتڑ برس رہی تھیں۔ حالات بہت خراب ہوگئے تھے۔ کمپنی کمانڈر نے مجھ سے کہا۔ ''کیوں اندری۔ کیا تم اس میں سے ٹرک نکال کر لے جاسکو گے؟''

''کیوں نہیں نکال کر لے جاؤں گا۔ میرے فوجی بھائی وہاں جان سے ہاتھ دھوئے بیٹھے ہیں اور میں بچر بچر کروں گا؟''

''بس تو پھر ٹھیک ہے برق رفتاری سے جانا اور کھوٹے سکے کی طرح واپس آجانا'' کمانڈر نے میری پشت تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے اپنا ٹرک بڑی احتیاط سے چلانا ہے کیونکہ ٹرک میں کوئی آلو تو بھرے نہیں تھے۔

جب میں ٹرک کو نشیب میں اپنے توپ خانے کی طرف لئے جا رہا تھا تو دفعتاً میری نظر دائیں طرف کے کھلے میدان پر پڑی جہاں ہمارے جوان بھاگے جا رہے تھے۔ گولے ان کے سروں پر پھٹ رہے تھے۔ میں نے ایکسلیٹر پر اپنے پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا مگر توپ خانے تک نہ پہنچ سکا۔ ایک گولہ میرے ٹرک کے قریب آ کر پھٹا اور پھر پے در پے دھماکے ہونے لگے۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

جب آنکھ کھلی تو میرے جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا جیسے کسی نے بیلن سے میرے جسم کو دھنک کر رکھ دیا ہو۔ پتا نہیں میں کتنی دیر تک سڑک کے کنارے گڑھے کے پاس پڑا رہا تھا۔ ہوش آنے پر مجھے کوئی بات یاد نہیں آ رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ میرے چاروں طرف اپنے ہی ٹرک والے توپ کے گولے بکھرے پڑے تھے اور مجھ سے کچھ دور پر میرا ٹرک الٹا پڑا تھا۔ اس کے تو تقریباً پرخچے ہی اڑ گئے تھے اور جنگ پوری شدت سے میرے پیچھے ہو رہی تھی۔ میرے پیچھے یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟

میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر تیورا کر کٹے ہوئے درخت کی طرح گر پڑا۔ اس وقت میں دشمن کے نرغے میں تھا۔ فاشسٹ مجھ سے کچھ دور کھڑے تھے۔ ظاہر ہے اب میں ان کا قیدی تھا مگر میں خوفزدہ نہیں تھا۔ جنگ میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ ٹینکوں کی گھڑگھڑاہٹ سے زمین تھرا رہی تھی۔ اوسط درجے کے چار ٹینک میرے قریب سے گزر کر اس طرف بڑھنے لگے جہاں سے میں گولہ بارود سے لدا ہوا ٹرک لے کر چلا تھا۔ پھر کچھ گاڑیاں توپیں کھینچتی ہوئی گزریں۔ اس کے پیچھے پیدل فوج تھی۔ غالباً یہ پوری کمپنی تھی۔ میں نے ان کی نظروں سے بچنے کے لئے اپنا چہرہ مٹی میں دھنسا لیا۔ انہیں دیکھنا مجھے کچھ اچھا بھی نہیں لگ رہا تھا کچھ دیر بعد میں نے سوچا کہ شاید اب کوئی خطرہ نہ ہوگا۔ سب نکل چکے ہوں گے۔ سر اٹھایا تو چھ جرمنوں کو ٹامی گنیں لئے اپنے سر پر مسلط پایا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ لو بیٹے اب آ گئی موت۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لیٹے لیٹے مرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لئے میں کھڑا ہوگیا۔ میں اب بھی ذرہ برابر خوفزدہ نہ تھا۔ ان میں سے ایک سپاہی ٹامی گن کو کندھے سے اتار کر آگے بڑھا۔ میں بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا۔ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر جرمن آگے بڑھا اور اپنی زبان میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے اپنے نوجوان ساتھی کو پیچھے ہٹا دیا۔ اس نے میرا ہاتھ پشت کی طرف موڑ دیا۔ پھر مغرب کی طرف میرا رخ کرا کے اس نے میرے کولھے پر زوردار لات رسید کر دی۔ مجھے اس کتے کی اولاد پر غصہ تو بہت آیا۔ میرا بس چلتا تو کچا ہی چبا جاتا لیکن اس وقت میں مجبور تھا۔ ایک سانولے سپاہی نے میرے جوتے دیکھے اچھے خاصے تھے۔ وہ ہاتھ سے اشارہ کر کے بولا ''اتار دو انہیں۔'' میں نے زمین پر بیٹھ کر جوتے اتارے اور اس کے حوالے کر دیئے۔

اس نے جوتے اس طرح جھپٹ لئے جیسے ابھی میں اپنا ارادہ ہی تبدیل کر دوں گا۔ پھر میں ٹامی گنوں کی زد میں مغرب کی طرف بڑھنے لگا۔ میری

سست رفتاری پر انہوں نے اپنی زبان میں مجھے گالیاں دیں' مجھے بھی جتنی گالیاں یاد تھیں دل ہی دل میں انہیں دیتا رہا۔ اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

اس وقت میرے پیر من من بھر کے ہو رہے تھے۔ قدم بمشکل اٹھ رہے تھے۔ میں بدمست شرابی کی طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد دوسرے بہت سے قیدی بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ یہ میرے ڈویژن کے جوان تھے۔ انہیں دس جرمن سپاہی ٹامی گنوں کی زد میں لے کر آ رہے تھے۔ ان میں سے آگے والے جرمن نے ٹامی گن کا دستہ خواہ مخواہ میرے سر پر دے مارا۔ اس سے پیشتر کہ میں تیورا کر زمین پر گر پڑتا۔ میرے ساتھیوں نے مجھے تھام لیا اور آدھے گھنٹے تک مجھے سہارا دیتے رہے۔ پھر جب میرے اوسان بحال ہوئے تو ایک سپاہی نے میرے کان میں سرگوشی سے کہا۔ "کسی بھی طرح گرنا نہیں' جس طرح بھی بن پڑے چلتے رہو ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

میں نے پوری قوت صرف کر کے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا اور بغیر رکے چلتا گیا۔ غروب آفتاب کے بعد جرمنوں نے پہرہ دینے والے محافظوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ ہاتھوں میں ٹامی گنیں' شاٹ گنیں اور رائفلیں لئے ٹرک پر سوار بیس جرمن سپاہی اور آ گئے اور ہمیں کوئیک مارچ کرانا شروع کر دیا۔ میرے ساتھیوں میں جو زخمی تھے اور تیز نہیں چل سکتے تھے انہیں وہیں گولیوں سے ہلاک کر دیا گیا۔ ہمارے دو سپاہیوں نے بھاگ نکلنے کی کوشش کی۔ مگر چاندنی نے انہیں مروا دیا۔ تڑ تڑ گولیاں چلیں' دو چیخیں بلند ہوئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

رات گئے ہم ایک گاؤں میں پہنچے جو آدھا جل کر تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ رات گزارنے کے لئے ہمیں ایک گرجا گھر میں دھکیل دیا گیا جس کا گنبد ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ کھردرا سرد پتھریلا فرش جس پر ایک تنکا بھی نہیں تھا۔ ہم میں سے اکثر بڑے بڑے بھاری بھرکم فوجی کوٹ اور اسی طرح کی جیکٹیں اور پتلونیں پہنے ہوئے تھے مگر ہمارے پاس بچھانے کے لئے کوئی چیز نہ تھی۔ ہم میں چند ایسے تھے جن کے جسم پر بند گلے کی قمیض تک نہ تھی اور انہوں نے باریک کپڑے کی صرف بنیان پہن رکھی تھیں۔ ان میں زیادہ تر جونیئر افسر تھے اور انہوں نے وردی کے کوٹ اور بند گلے کی قمیصیں اس لئے اتار پھینکی تھیں کہ ان میں اور عام سپاہیوں میں کوئی پہچان باقی نہ رہے۔ ان کے علاوہ توپ خانے کے جوان بھی بند گلے کی قمیصوں کے بغیر رہ گئے تھے کیونکہ جب وہ اپنی قمیصیں اتارے مورچوں پر لگی ہوئی توپیں داغ رہے تھے تو دھر لئے گئے۔

رات کے تیسرے پہر بڑے زور کی بارش ہوئی۔ ہم سب پانی میں شرابور ہو گئے۔ گرجے کے گنبد کی چھت بمباری سے بالکل تباہ ہو چکی تھی اور اب وہاں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں پناہ لی جا سکتی۔ ساری رات گرجا گھر کے اندھیرے میں ہم مویشیوں کی طرح پڑے ٹھٹھرتے رہے۔ رات کے پچھلے پہر میرے کانوں میں ایک آواز آئی۔ کوئی میرے ہاتھ کو پکڑے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ "کیوں کامریڈ تم زخمی تو نہیں ہو؟"

"تمہیں اس سے کیا اپنے کام سے کام رکھو۔" میں نے ناک بھوں چڑھا کر جواب دیا۔

"میں ایک فوجی ڈاکٹر ہوں۔ اگر تم واقعی زخمی ہو تو میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں۔"

"بھائی" میں نے کراہتے ہوئے کہا "یوں لگتا ہے جیسے میرے بائیں شانے کو کوئی کاٹے جا رہا ہے۔ سوج کر کپا ہو رہا ہے' درد کی تکلیف ناقابل برداشت ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر کوٹ اور نیچے کی قمیض اتار دو۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس نے شانے کے پاس اپنی نرم و نازک پتلی پتلی انگلیوں سے میرا بایاں بازو ٹٹولنا اور ملنا شروع کر دیا۔

کم بخت نے کچھ ایسے الٹے سیدھے ہاتھ دکھائے کہ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے درد کی شدت سے اپنے دانت بھینچ لئے اور چلایا۔ ''ارے ظالم مار ڈالا۔ تو مجھے انسانوں کا نہیں مویشیوں کا ڈاکٹر لگتا ہے۔ سوجے ہوئے شانے کو موٹر کے ہارن کی طرح دبائے چلا جا رہا ہے۔ ارے بس کر بھائی میں کہتا ہوں چھوڑ میرا شانہ'' مگر وہ نہ مانا۔ سوجے ہوئے شانے کو دبائے چلا گیا۔ اس نے میرے بازو کو کھینچتے ہوئے بڑھی سے کہا'' بک بک بند کر زیادہ شور مچایا تو خیر نہیں اب ذرا اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا۔ اب کے بڑا سخت درد ہوگا۔''

پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر جو موڑا تو میری جان ہی تو نکل گئی۔ آنکھوں کے آگے چنگاریاں اڑنے لگیں' میں نے چیخ کر کہا'' کم بخت فاشسٹ تو یہ کیا کر رہا ہے' ایک تو میرے ہاتھ میں شدید درد ہے اور اس پر تو جھٹکے دے رہا ہے۔''

وہ کھی کھی کر کے ہنسا اور پھر بولا۔ ''میں تو سمجھا کہ ابھی تم میری مرمت شروع کر دو گے۔ لیکن تم تو بھلے مانس نکلے' تمہارا ہاتھ ٹوٹا نہیں تھا۔ بس ذرا سا اپنی جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے تمہاری ہڈی بٹھا دی ہے۔ کہو اب کیا حال ہے' کیسا محسوس کر رہے ہو؟ کچھ افاقہ ہوا؟''

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے درد رفتہ رفتہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ مجھے چھوڑ کر وہ اندھیرے میں دوسرے سپاہیوں کی طرف بڑھ گیا۔ سرگوشیوں میں اس کی آواز سنائی دی'' کیوں بھائی کیا زخمی ہو؟'' میں نے سوچا، ڈاکٹر دشمن کی قید میں ہے۔ گھور اندھیرا ہے پھر بھی اپنا فرض ادا کئے جا رہا ہے۔''

بڑے اضطراب اور بے بسی کی رات تھی۔ رفع حاجت تک کے لئے بھی باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جس وقت ہمیں گرجا گھر میں دھکیلا جا رہا تھا تو اسی وقت محافظوں کے افسر نے ہمیں خبردار کر دیا تھا کہ کوئی باہر نکلنے کی جرات نہ کرے۔ ہم میں ایک مذہبی شخص بھی تھا جسے رات کے وقت رفع حاجت کی ضرورت پیش آ گئی۔ کچھ دیر تک تو وہ برداشت کئے رہا۔ آخر کب تک' تنگ آ کر چیخ پڑا۔ ''ارے ظالمو اب تو صبر و برداشت کی انتہا ہو گئی۔ اب میں نہیں رک سکتا۔ بتاؤ میں کیا کروں' خداوند کے مقدس اور پاک گھر کو کیسے گندا کر دوں' مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میں پکا عیسائی ہوں۔ میرا ایمان میرے ساتھ ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں میرے بھائیو؟''

اور تم تو لوگوں کو جانتے ہی ہو کہ کیسے ہوتے ہیں' کسی نے قہقہہ لگایا' کسی نے اسے ٹھوکا مارا' کوئی اسے گالیاں دینے لگا۔ ایک تو یوں ہی معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ دوسرے لوگ اس سے چھیڑ خانی کر رہے تھے۔ ہمیں اٹھکیلیاں سوجھی تھیں اور اس کا برا حال تھا مگر اس ہنسی ٹھٹھے کا انجام بہت برا ہوا۔ پہلے تو اس نے خوب دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنے محافظوں کی بڑی منت سماجت کی کہ ذرا دیر کے لئے باہر جانے کی اجازت دے دی جائے مگر اسے اپنی درخواست کا جواب بہت برا ملا۔ کسی فاشسٹ نے سوراخ میں شاٹ گن کی نال گھسیڑ کر فائر کھول دیا۔ اہل ایمان کے ساتھ تین آدمی اور مرے اور ایک شدید زخمی ہوا۔ صبح ہوتے ہوتے اس نے بھی دم توڑ دیا۔

لاشیں اوپر تلے ایک کونے میں ڈال دی گئیں۔ ہم سب سر جھکا کر بیٹھ گئے اور خاموشی سے سوچنے لگے۔ کچھ دیر بعد ہم چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔ سرگوشیوں میں ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔

میرے پاس دو آدمی بیٹھے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ ایک نے دھیرے سے کہا۔ "اگر کل انہوں نے ہمیں آگے لے جانے سے پہلے قطار میں کھڑا کر کے پوچھ گچھ شروع کر دی کہ کون یہودی ہے کون کمیسار ہے کون کمیونسٹ ہے تو لیفٹیننٹ اس صورت میں میرا مشورہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو چھپانا نہیں چاہیے اس سے تو ہم اور پھنس جائیں گے اور تم؟ تمہارے خیال میں کیا تم وردی کا کوٹ اتار دینے سے بچ جاؤ گے اور تم میں اور سپاہیوں میں کوئی پہچان نہیں رہ جائے گی؟ اگر تم نے یہ سوچا ہے تو تم غلطی پر ہو میں تو ہرگز تمہارا ہم خیال نہیں ہو سکتا۔ جب پوچھ گچھ ہو گی تو میں سب سے پہلے تمہاری طرف اشارہ کروں گا۔ مجھے تو پتا ہے کہ تم کمیونسٹ ہو۔ بلکہ تم تو مجھے بھی اپنی پارٹی کا رکن بنانے کے لئے اکساتے رہے ہو۔ اب تم خود ہی بھگتو۔"

یہ بات اس نے کہی جو میرے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس کے بائیں طرف سے ایک آواز سنائی دی۔ "مجھے تو پہلے ہی شبہ تھا پژنیف کہ تم اچھے آدمی نہیں ہو خاص کر جب تم نے پارٹی میں شامل نہ ہونے کے لئے یہ بہانہ کیا تھا کہ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں' مگر اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ تم غداری بھی کر سکتے ہو۔ تم تو کہتے تھے کہ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں لیکن آٹھویں جماعت تو تم نے پاس کی ہے۔"

پژنیف نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ "ہاں آٹھویں جماعت میں نے پاس کی تھی تو کیا ہوا؟"

کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے پھر لیفٹیننٹ نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ "کامریڈ پژنیف جو کچھ تم نے کہا ہے کہیں واقعی ایسا نہ کر بیٹھنا' انہیں میرے بارے میں کچھ بھی نہ بتانا۔"

پژنیف نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔ "کامریڈ تو تمہارے فرنٹ کے اس پار رہ گئے۔ میں تمہارا کامریڈ نہیں ہوں' مجھ سے زیادہ بک بک جھک جھک مت کرو۔ میں تو صاف صاف بتا دوں گا کہ تم کون ہو۔ اپنی جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔"

پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ پژنیف کے کمینہ پن پر غصے سے میرا بدن کانپ رہا تھا۔ "ٹھہر تو سہی کتے کی اولاد۔" میں نے سوچا۔ "میں اپنے افسر کو اس طرح دشمن کے حوالے نہیں ہونے دوں گا' اب تو اس گرجا گھر سے تیری لاش ہی جائے گی۔"

صبح ہوئی تو میں نے دیکھا کہ بھاری بھرکم چہرے والا پژنیف میرے پاس لیٹا ہوا ہے' قریب ہی ایک سوکھا سہا نوجوان گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ مریل سا نوجوان اس مسٹنڈے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مجھے تن تنہا اس کا کام تمام کرنا پڑے گا۔

نوجوان کے قریب پہنچ کر میں نے اس کے کان میں سرگوشی سے پوچھا۔ "کیا تم لیفٹیننٹ ہو؟"

اس نے منہ سے کچھ کہنے کے بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ موٹا تمہیں دشمن کے حوالے کرنے والا ہے؟"

اس نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اچھی بات ہے۔ تم ذرا اس کی ٹانگیں مضبوطی سے پکڑ لو تا کہ یہ جدوجہد نہ کر سکے سختی سے پکڑنا۔"

اس نے میرے کہنے پر عمل کیا اور پھر میں اس پر جھپٹ پڑا۔ دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبائے چلا گیا یہاں تک کہ اس نے دم توڑ دیا۔ اب میرے سامنے غداری کی سرد لاش پڑی تھی' آنکھیں باہر کو ابل پڑی تھیں' زبان باہر کو نکل آئی تھی۔ اسے چیخنے چلانے کی میں نے مہلت ہی نہ دی

تھی۔ مجھے متلی ہونے لگی جی چاہتا تھا کہیں سے ہاتھ دھولوں یوں لگتا تھا جیسے آدمی کا گلا نہیں گھونٹا تھا بلکہ رینگنے والی کوئی لجلجی سی چیز ہاتھ میں آ گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار میں نے کسی آدمی کا خون کیا تھا اور وہ بھی اپنے ڈویژن کے سپاہی کا۔ مگر وہ اپنا ساتھی ہی کب تھا۔ وہ تو غدار تھا اور غداری کی سزا موت ہوتی ہے۔

پرٹیف نے جو کچھ کہا تھا وہی ہوا۔ سورج نکلتے ہی انہوں نے ہم سب کو گرجا کے باہر قطار میں کھڑا کر دیا۔ ہمیں چاروں طرف سے مسلح جرمنوں نے گھیر لیا۔ ان میں سے تین افسروں نے ایسے آدمیوں کو الگ کرنا شروع کر دیا جو ان کے بقول خطرناک تھے۔ قطار میں ایک ایک سے پوچھنے لگے کمیونسٹ کون ہے کیسار کون ہے کمانڈر کون ہے مگر قطار میں سے کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ ہم سب چپ رہے۔ اب ہم میں کوئی پرٹیف جیسا کمین نہیں تھا جو غداری کا مرتکب ہوتا۔ کیمونسٹ تو اس قطار میں آدھے تھے۔ ان میں افسر بھی تھے اور ظاہر ہے کیسار بھی تھے۔ قطار کے دو سو سے زائد آدمیوں میں سے چار آدمی چھانٹے گئے۔ تین روسی اور ایک یہودی۔ عام سپاہیوں میں روسی اس لئے پہچان لئے گئے کہ ان کا رنگ سانولا اور بال چھلے دار تھے۔

ان بدنصیبوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا اور پھر ہمیں بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہانکا جانے لگا۔ غدار کا گلا گھونٹنے کے بعد پوزنان تک لیفٹیننٹ میری دم سے لگا رہا۔ پوزنان پہنچ کر ہم دونوں بچھڑ گئے۔ پوزنان تک راستے بھر میں فرار ہونے کا موقع تلاش کرتا رہا۔ مگر کوئی موقع ہاتھ نہیں آیا۔ پوزنان میں قیدیوں کے کیمپ میں میری یہ مراد بر آئی۔ مئی کا مہینہ قریب الختم تھا۔ ہم لوگوں کو ایک چھوٹے سے جنگل میں اپنے ان مردہ ساتھیوں کی قبریں کھودنے بھیجا گیا جو پیچش کی وجہ سے ہلاک ہو گئے تھے۔

ایک قبر کھودتے ہوئے میں اپنے گردوپیش کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ دو محافظ تو بیٹھے ہوئے کچھ کھا رہے تھے اور تیسرا اونگھ رہا تھا۔ کدال میں نے ایک طرف رکھ دی اور چپکے سے جھاڑیوں کے پیچھے دبک گیا اور پھر وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں پوری قوت سے دوڑتا رہا۔ کچھ پتا نہیں میں نے کتنا فاصلہ طے کیا ہوگا۔ پھر دوڑنا ترک کر کے میں نے چلنا شروع کر دیا۔ تین دن تک میں بھوکا پیاسا مسلسل چلتا رہا۔ چوتھے دن میں اس منحوس کیمپ سے بہت دور نکل چکا تھا۔ میں مکی کے ایک کھیت میں گھس گیا اور دودھیا بھٹے توڑ توڑ کر کھانے لگا اور جیبوں میں بھی ٹھونسنے لگا لیکن اچانک میرے تیزی سے چلتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ قریب ہی کہیں کتے بھونک رہے تھے اور موٹر سائیکلوں کی پھٹ پھٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ میں فوراً پیٹ کے بل لیٹ گیا اور چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا کہ کم از کم منہ تو کتوں کے جھنجھوڑنے سے بچ جائے۔ چند لمحوں بعد خونخوار کتے کھیت میں گھس آئے اور منٹوں میں انہوں نے میرے کپڑے چیر پھاڑ کر برابر کر دیئے۔ میں مادرزاد برہنہ ہو گیا۔ مکی کے کھیت میں انہوں نے مجھے خوب گھسیٹا۔ شیر جیسا ایک کتا میرے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کرے موٹر سائیکلوں پر سوار جرمن آ پہنچے۔ انہوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر کتے کو مجھ سے علیحدہ کیا اور پھر لاتوں اور گھونسوں سے میری تواضع شروع کر دی۔ کم بختوں نے مار مار کر ادھ موا کرنے کے بعد مجھ پر پھر کتے چھوڑ دیے۔ انہوں نے اپنے نوکیلے اور تیز پنجوں سے بدن کا گوشت جگہ جگہ سے ادھیڑ ڈالا۔ زخموں سے چور برہنہ حالت میں کیمپ پہنچا دیا گیا۔ فرار ہونے کی پاداش میں ایک ماہ قید تنہائی کی سزا ملی۔ بہر حال زندگی تھی جو بچ گیا۔

دشمن کی قید میں' میں نے ایسے ایسے دکھ اور تکلیفیں اٹھائی ہیں کہ آج بھی یاد کرکے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیمپ میں ہم سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ ان اذیتوں کو ہمارے بہت سے ساتھی نہیں برداشت کر سکے اور چل بسے۔ ان کی بے گور و کفن لاشیں تین تین دن پڑی سڑتی رہتی تھیں۔ ان مردوں کے جسموں سے ایسی سڑاند اور تعفن اٹھتا تھا کہ دماغ چکرانے لگتا۔ دن میں کئی کئی بار ہم قے کر دیتے۔ ہم سب نے اپنے کپڑے پھاڑ کر چھوٹے چھوٹے رومال بنا لئے تھے جنھیں ہم چوبیں گھنٹے ناک سے باندھے رکھتے۔ ذرا سا بھی کپڑا ہٹ جاتا تو سڑے ہوئے گوشت کی بدبو ہمارے نتھنوں میں گھس آتی اور طبیعت مالش کرنے لگتی تھی۔

میں دو سال جنگی قیدی رہا مگر یوں لگتا تھا جیسے جہنم میں دو صدیاں گزار دی ہوں۔ آج یہاں تو کل وہاں اس طرح میں نے آدھا جرمنی دیکھ ڈالا۔ سیمنٹ کے کارخانوں میں اینٹیں ڈھوئیں' زہریلی گیس والی کوئلے کی کانوں میں کام کیا۔ جرمن کتوں کے لئے مختلف شہروں میں پناہ گاہیں کھودیں' غرض آدھے جرمنی کی خاک چھان چکا ہوں۔ بڑے ظلم و ستم توڑے ہیں بھائی ان جرمن کتوں نے مارنا' پیٹنا' گولیوں سے بھون دینا' زندہ جلا دینا۔ ذرا ذرا سی بات پر گھونسوں' لاتوں' ہنٹروں' لکڑیوں اور رائفل کے دستوں سے مارنا شروع کر دیتے تھے۔ یوں لگتا جیسے مارتے مارتے ایک دن یونہی جان لے لیں گے۔ جسم میں لہو کی ایک بوند بھی باقی نہیں رہے گی۔ سارا خون نچوڑ لیں گے۔ لاشیں اتنی تھیں کہ جرمنوں کی بھٹیاں کم پڑ گئیں۔ کھانا ہر جگہ ایک ہی سا ملتا تھا۔ لکڑی کا برادہ ملے ہوئے موٹے بدبودار چاول' چقندر کا پتلا شوربہ۔ تین تین مہینے تک نہانے کے لئے گرم پانی بھی نہیں ملتا تھا۔ جنگ سے پہلے میرا وزن چھیاسی کلوگرام تھا۔ دو سال بعد پچاس کلوگرام سے بھی کم رہ گیا' یوں سمجھو ایک استخوانی ڈھانچا تھا جس پر کھال منڈھ دی گئی ہو۔

ستمبر کا مہینہ شروع ہوا ہی تھا کہ سوویت جنگی قیدیوں میں سے ہم ایک سو بیالیس آدمیوں کو کیوسترین نامی کیمپ سے نکال کر کیمپ نمبر چودہ بی میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ جگہ ڈریسڈن کے قریب واقع ہے۔ اس کیمپ میں ہمارے دو ہزار سپاہی قید تھے۔ ہم سب کو پتھر توڑنے پر لگا دیا گیا۔ ہر قیدی کو چار کیوبک میٹر پتھر ہاتھوں سے کوٹنا توڑنا اور ڈھونا ہوتا تھا۔ اس سے کم پر سخت سزا دی جاتی تھی۔ جنھیں محنت مشقت کے بغیر ہی جینا دوبھر ہو رہا تھا ان سوکھے سہمے مریل لوگوں پر یہ کیسی جان لیوا مشقت ڈال دی گئی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ نکلا کہ مرنے والوں کی قطار لگ گئی۔ ہمارے ایک سو بیالیس کے گروپ میں صرف ستاون افراد زندہ بچے۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو بھائی کہ ہم پر کیسی گزرتی ہوگی۔ اپنے مردہ بھائیوں کو گاڑنے سے فرصت نہ ملتی تھی۔ پھر کیمپ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ جرمنوں نے اسٹالن گراڈ اور دریا پر قبضہ کر لیا ہے اور اب آگے سائبیریا کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ سارے قیدی مایوسی کا شکار ہو گئے۔ ہمارے سپاہیوں کے ذہنوں میں یہ بات جم گئی کہ اب تو ساری عمر جرمنوں کی غلامی میں گزارنی ہوگی۔ کیمپ کے محافظ اور افسر خوب عیش کر رہے تھے۔ گانا' بجانا' کھانا' پینا' رقص و سرود ان کا روز کا معمول بن گیا۔ روزانہ رات کو جشن فتح منعقد ہوتا۔ خوشی و شادمانی کے گیت گائے جاتے۔ خوب شراب پی جاتی' سور کا بھنا ہوا گوشت اڑایا جاتا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ہم کام سے تھکے ماندے جب شام کو اپنی بیرک میں آئے تو دن بھر لگاتار بارش میں بھیگتے رہنے کی وجہ سے ہمارے جسموں سے لٹکتے اور جھولتے ہوئے چیتھڑے نما کپڑے پانی میں بالکل شرابور ہو گئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ہم پر کپکپی طاری کر دی تھی اور ہم

سب کسی خارش زدہ کتے کی طرح ہانپ رہے تھے جیسے میلوں سے دوڑتے ہوئے آئے ہوں۔ کٹ کٹ کٹ کٹ دانت بج رہے تھے۔ کپڑے کس طرح سکھائیں' برف کی طرح سرد جسم کو حرارت کیسے پہنچائیں یہ بڑا اہم مسئلہ تھا۔ پھر بھوک بھی بڑی شدت کی لگ رہی تھی۔ پیٹ کی آگ کے لئے ایندھن کی ضرورت تھی مگر ایندھن کی فراہمی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ کیمپ کے قاعدے کے مطابق شام کو کھانے کے لئے کچھ نہیں دیا جاتا تھا۔ جو روٹی مانگتا تھا اسے رائفل کی گولی ملتی تھی۔ اس دنیا کا تو یہی دستور ہے کہ اپنی توندیں بڑی کرو' تجوریوں کو بھرتے رہو اور جب کوئی غریب' مجبور' بے بس روٹی مانگے تو اسے بہلاؤ۔ اسے سبز باغ دکھا کر اپنا الو سیدھا کرو۔ اور اگر غریب خودسری اختیار کرے اور بغاوت پر آمادہ ہو' تجوریاں توڑ دینا چاہتا ہو' توندیں پھاڑ دینا چاہتا ہو تو اسے گولی سے اڑا دو' جو کوئی روٹی کپڑا اور مکان مانگے اسے موت کی نیند سلا دو مگر ایسا بہت دنوں تک نہیں ہو سکے گا۔

خیر تو بیرک میں آ کر میں نے اپنے گیلے چیتھڑے اتار دیے اور انہیں چبوترے پر پھینکتے ہوئے بڑی نخوت سے کہا۔ "لعنت ہے ان جرمن کتوں پر' کتنی سخت محنت و مشقت کرواتے ہیں ہم سے' چار کیوبک میٹر ہر آدمی سے مانگتے ہیں اور ہم میں سے ہر ایک کی قبر پر کتنا پتھر لگے گا؟ میرا خیال ہے کہ ایک کیوبک میٹر بھی کافی سے زیادہ ہوگا۔"

کہنے کو تو میں نے یہ کہہ دیا تھا لیکن ہمارے ایک آستین کے سانپ نے یہ بات کیمپ کے افسر اعلیٰ تک پہنچا دی۔ ہمارے کیمپ کمانڈر کا نام میلر تھا۔ اوسط درجے کا قد' گٹھا ہوا جسم' گورا رنگ' سفید بال اور بھنویں بھی اس کے اڑے ہوئے رنگ جیسی تھیں۔ یہ بڑی بڑی تو اس کی آنکھیں تھیں اور یہ ذلیل انسان روسی بھی غلط سلط بول لیتا تھا۔ چھوٹتے ہی ماں' بہن کی گالیاں دینے لگتا تھا۔

وہ ہمیں روزانہ بیرک کے سامنے قطار میں کھڑا کر دیتا اور سیدھا پشت کی طرف کر کے ہمارا معائنہ کرنے لگتا۔ اس کے سیدھے ہاتھ کے نیچے چمڑے کا دستانہ چڑھا رہتا تھا۔ اس نے دستانے کے اندر سیسے کا استر لگا رکھا تھا تاکہ مارنے پر اس کے ہاتھ میں کوئی چوٹ نہ آئے۔ قطار کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ ہر تیسرے قیدی کے منہ پر زوردار گھونسا جڑ دیتا تھا۔ گھما کر ایسا ہاتھ مارتا کہ قیدی خون تھوکنے لگتا تھا۔ اپنی اس حرکت کا نام اس منحوس نے نزلہ اتارنے کا انجکشن رکھا تھا اور نزلے کا یہ انجکشن بلا ناغہ روزانہ باری باری ہر بیرک کے قیدیوں کو لگتا تھا۔

جب اس کمینے انسان کا بلاوا آیا تو مجھے اپنے مرنے کا یقین ہو گیا۔ سب دوستوں سے ہمیشہ کے لئے رخصت لی۔ سبھی جانتے تھے کہ اب میرا بچ کر آنا ناممکن ہے۔ کیمپ کے احاطے میں' میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ میں نے انہیں بھی الوداع کہا۔ "بہت دکھ جھیل لئے اندرئی!" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "اب موت قریب آ چکی ہے۔ اب ان دکھوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا مل جائے گا۔"

پھر جب ارینا کا اور بچوں کی یاد آئی تو دل کڑھنے لگا مگر میں نے اپنے جی کو کڑا کیا تاکہ پستول کا سامنا ہو تو بے جگری سے اس کی نال سے آنکھیں چار کر سکوں۔ سپاہی کو ہمیشہ ایسا ہی کرنا چاہیے۔ وہ سپاہی کیا جو پستول کی نال کا سامنا ہوتے ہی گھبرا جائے۔ میں نہیں چاہتا تھا دشمن کو یہ احساس ہو کہ میں موت سے خوفزدہ ہوں۔

کمانڈر کا کمرہ بہت صاف ستھرا اور دیدہ زیب فرنیچر سے آراستہ و پیراستہ تھا۔ میز پر کیمپ کے پانچ افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ سب کے

ہاتھوں میں شراب کے چھلکتے ہوئے جام تھے۔ میز پر قابوں میں بہت سا بھنا ہوا گوشت رکھا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں اسی میز پر عمدہ قسم کی جن کی بوتلیں، روٹیاں، طرح طرح کے اچار چٹنیاں، مربے اور پھل بھی رکھے ہوئے تھے۔ سوندھی سوندھی بھوک کی اشتہا بڑھا دینے والی خوشبودار غذاؤں کے ڈبے بھی کھلے ہوئے تھے۔

اتنا عمدہ کھانا دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ بڑے زوروں کی بھوک محسوس ہونے لگی۔ آدمیوں کے کھانے کا ذائقہ میں بھول چکا تھا۔ میں نے بمشکل اپنی بھوک کو برداشت کیا لیکن اس کے باوجود میری نظریں میز پر سے ہٹتی ہی نہ تھیں۔

میرے سامنے میولر بیٹھا پستول سے کھیل رہا تھا۔ جب میں اس کے سامنے پہنچا تو اس نے سانپ کی طرح مجھے دیکھا۔ میں نے اٹنشن کھڑے ہو کر ایڑی بجائی اور اونچی آواز میں کہا۔ "جناب کمانڈر! جنگی قیدی اندری آپ کے حکم سے حاضر ہے۔"

"کیوں روسی کتے! ابول چار کیوبک میٹر پتھر کاٹنا بہت زیادہ مشکل کام ہے؟" کمانڈر نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں جناب! یہ بہت زیادہ اور بڑا مشکل کام ہے۔" میں نے بے خوفی سے جواب دیا۔

"اور کیا یہ تیرے اکیلے کی قبر کے لئے کافی ہے؟"

"جی ہاں جناب' کافی ہے بلکہ اس میں بھی بہت سا بچ جائے گا۔"

ایک جھٹکے سے اس نے کھڑے ہو کر کہا۔ "ٹھہر جا کتے! ابھی میں تجھے اس عزت سے سرفراز کرتا ہوں۔ تو نے جو بکواس کی ہے اس پر میں تجھے اپنے ہاتھ سے شوٹ کروں گا۔ لیکن یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ باہر احاطے میں چل تجھے وہاں گولی مارنا بہتر ہوگا۔"

"جیسا حکم جناب کا۔" میں نے سینہ پھلاتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے بڑی حیرت سے میری طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے پستول کو میز پر رکھ دیا۔ ایک گلاس میں جن انڈیلی روٹی کے ٹکڑے پر بھنے ہوئے گوشت کا چھوٹا سا قتلا رکھا اور مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ لے روسی سپاہی' موت سے پہلے کچھ کھا پی لے' جرمن فوج کی فتح کے نام پر۔"

میں اس کے ہاتھ سے شراب کا گلاس اور روٹی لے چکا تھا مگر جب اس کا آخری جملہ میرے کان میں پڑا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ میرے کان میں انڈیل دیا ہے "یہ نہیں ہو سکتا۔" میں نے سوچا۔ میں ایک وفادار اور غیرت مند روسی سپاہی ہوں جو جرمن فوج کی فتح کے نام پر نہیں کھا پی سکتا۔ جب مرنا ہی ہے تو پھر ڈرنا کیا جہنم میں جائے یہ شراب۔

بڑے تحمل سے میں نے گلاس میز پر رکھ دیا اور اسی کے اوپر روٹی کا ٹکڑا بھی رکھ دیا۔ "آپ کی تواضع کا بہت بہت شکریہ جناب لیکن میں شراب نہیں پیتا۔"

وہ مسکرا دیا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ہماری فتح کے نام پر پینا نہیں چاہتے۔ اچھی بات ہے تو پھر اپنی موت کے نام پر پی جاؤ۔"

میں نے گلاس بلند کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں اپنی موت اور تمام مصیبتوں سے نجات کے نام پر پینے کو تیار ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے

گلاس کو اپنے ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں اسے خالی کر دیا۔ پھر میں نے ہتھیلی سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی اس عنایت کا بہت بہت شکریہ کمانڈر! اب میں بالکل تیار ہوں' چلئے مجھے گولی سے اُڑا دیجئے۔"

وہ حیران ہو کر میری صورت تکنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کہا "موت سے پہلے کچھ کھا لیتے تو اچھا تھا۔"

"پہلا گلاس پینے کے بعد میں کچھ کھایا نہیں کرتا۔"

اس نے دوسرا گلاس بھر کے میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے وہ بھی ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ اور اس بار بھی میں نے روٹی اور بھنے ہوئے گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا۔ حالانکہ شراب کے دو گلاس پینے کے بعد پیٹ میں آگ سی لگ رہی تھی۔

کمانڈر نے سفید بھنویں اچکاتے ہوئے کہا "کیوں اے روسی کیا بات ہے کچھ کھاؤ گے نہیں' تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"معاف کیجئے گا جناب" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "دوسرے گلاس کے بعد بھی میں کچھ نہیں کھایا کرتا۔"

اس نے اپنے گال پھلا لئے اور پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور جرمن میں کچھ بڑبڑانے لگا' اس نے میری بات اپنے دوستوں کو سنائی تو وہ بھی قہقہے لگانے لگے۔

"آخر کچھ کھاتے کیوں نہیں؟" کمانڈر نے شراب کا تیسرا گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"جناب کمانڈر صاحب! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایک روسی سپاہی ہوں اور میں یہ نہیں گوارا کر سکتا کہ میرے بھائی بیرکوں میں بھوکے پڑے رہیں اور میں یہاں روٹی اور بھنا ہوا گوشت اڑاؤں۔ شراب میں نے اس لئے پی لی کہ نشے میں مرتے وقت زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔ مساوات کا قائل ہوں کمانڈر! اگر میرے ساتھی کھائیں گے تو میں بھی کھاؤں گا۔ اگر وہ بھوکے رہیں گے تو میں بھی بھوکا رہوں گا' اگرچہ بھوک سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔ مگر روٹی کے اس ٹکڑے پر جو تم نے میری طرف پھینکا ہے میں بھوکے کتے کی طرح جھپٹوں گا۔ نہیں مجھے جو سبق پڑھایا گیا ہے ابھی میں بھولا نہیں ہوں۔ آپ لوگوں نے سارے جتن کر ڈالے مگر مجھے جانور نہیں بنا سکے۔ میں اب بھی انسان ہوں' انسان جو دوسرے انسان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مسکرانا بھول جائے اور خود بھی رو پڑے۔ انسان جو دوسرے انسان کا تن ڈھانپنے کے لئے خود ننگا ہو جائے جو دوسرے بھوکے انسان کو کھانا کھلانے کے لئے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لے۔"

کمانڈر کی ہنسی کو فوراً بریک لگ گیا اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ اس نے اپنے سینے پر لٹکتی ہوئی صلیب ٹھیک کی اور میز سے قدرے ہٹ کر کہا۔ "اندرئی! تو واقعی روسی سپاہی ہے۔ ایک بہادر سپاہی۔ میں بھی ایک سپاہی ہوں اور تجھ جیسے دشمنوں کا احترام کرتا ہوں۔ تیرے پھولے ہوئے چوڑے چکلے سینے پر مجھ سے گولی نہیں چلائی جا سکے گی۔ اور پھر آج تو فتح و نصرت کا دن ہے۔ ہماری شیر دل افواج والگا تک پہنچ چکی ہیں۔ اسٹالن گراڈ پر ہمارا قبضہ ہے۔ ہمارے لئے یہ بڑا خوشی کا دن ہے۔ اندروئی! تمہارے ساتھ عالی ظرفی کا برتاؤ کیا جائے گا۔ ہم نے تمہیں زندگی بخش دی۔ جاؤ اپنی بیرک میں واپس جاؤ اور یہ لو تمہاری بہادری کا انعام۔"

میز پر سے ایک ڈبل روٹی اور بھنے ہوئے گوشت کے تین ٹکڑے اٹھا کر اس نے میرے حوالے کر دیے۔

دوسرے دن صبح جب میری آنکھ کھلی تو بیرک کے سارے سپاہی ایک قطار میں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ سب کی نظریں ڈبل روٹی اور بھنے ہوئے گوشت کے تین قتلوں پر جمع ہوئی تھیں۔ ایک مدت بعد انہوں نے نرم ڈبل روٹی اور بھنے ہوئے گوشت کی شکل دیکھی تھی۔

میرے برابر بیٹھے ہوئے قیدی نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "اندرئی تم جو یہ لائے ہو اس کا بٹوارا کیسے ہو؟"

میں نے ڈبل روٹی کی طرف دیکھا اور پھر سر گھما کر قیدیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ باون افراد ایک ڈبل روٹی اور بھنے ہوئے گوشت کے تین قتلے بے اختیار میری آنکھیں بھر آئیں۔ سب سے نظر بچا کر میں نے آنسو پونچھ ڈالے۔ ڈبل روٹی کو ایک تانت کے برابر کاٹا تو ہر ایک کے حصے میں ماچس کی ڈبیا کے برابر ٹکڑا آیا۔ گوشت کے قتلوں میں سے ہر ایک کے حصے میں چار چار ریزے آئے۔ مگر کسی نے شکایت نہیں کی اور شام تک وہ ریزے چوستے رہے۔

کچھ دنوں کے بعد ہم میں سے تین سو قیدیوں کو دلدل بھرنے پر لگا دیا گیا۔ جب دلدل پاٹی جا چکی تو اس میں مٹی کے ساتھ ہمارے سو بھائیوں کی لاشیں بھی شامل تھیں۔ پھر ہمیں روہر کے علاقے میں کوئلے کی کانوں میں دھکیل دیا گیا۔ چار دن بعد ہم کانوں سے نکلے تو دو سو میں سے ایک سو اڑتالیس قیدی زندہ تھے باقی باون لاشیں ان قیدیوں کی تھیں جو زہریلی گیس سے ہلاک ہو گئے تھے۔ ۱۹۴۴ء تک میں وہیں کام کرتا رہا۔ اب ہماری فوجوں نے پے در پے شکستوں سے جرمنی کی کمر توڑ دی تھی۔

کچھ عرصے بعد جرمنوں نے مجھے بطور ڈرائیور ٹوڈٹ میں بھیج دیا۔ یہ جرمنوں کا ایک محکمہ تھا۔ جو سڑکیں بناتا تھا اور دفاعی لائنیں کھڑی کرتا تھا۔

میں نے ایک جرمن انجینئر کی اوپل گاڑی چلانا شروع کر دی جو ایک موٹا تازہ فاشسٹ تھا۔ پستہ قد موٹی سی توند جھکے ہوئے شانے۔ اس کے جسم پر خوب چربی چڑھی ہوئی تھی۔ جب دیکھو کھاتا ہی رہتا تھا۔ دن رات میں جب بھی دیکھو منہ چل رہا ہے۔ کم بخت بکرے کی طرح جگالی کرتا رہتا تھا۔ شراب کی بوتل تو ہر وقت اس کی بغل میں دبی رہتی تھی۔ کبھی کبھار کچھ میرے ہاتھ بھی لگ جاتا تھا۔ راستے میں بھی وہ رک کر سوکھا گوشت پنیر کے ساتھ کھاتا اور پھر اوپر سے شراب کے گھونٹ حلق میں انڈیلتے ہوئے مجھے آگے چلنے کا حکم دیتا تھا۔ اگر موڈ خوشگوار ہوتا تو ایک آدھ ٹکڑا میرے آگے اس طرح پھینک دیتا جیسے کتے کو راتب دیا جاتا ہے۔ کبھی کوئی چیز ہاتھ میں نہیں دیتا تھا۔ اس کے خیال میں قیدی کو اپنے ہاتھ سے کوئی چیز دینا مرتبے سے گری ہوئی بات تھی۔ بہرحال کیمپ کی جانوروں سے بدتر زندگی کے مقابلے میں یہ زندگی بہتر تھی یہاں میری صحت بھی کسی حد تک ٹھیک ہو گئی تھی۔

دو ہفتے تک میں اپنے انجینئر صاحب کو پوٹسڈم سے برلن اور برلن سے پوٹسڈم لاتا لے جاتا رہا۔ پھر اس کی ڈیوٹی اگلے مورچوں پر لگ گئی۔ اس کا کام ہماری فوج کے مقابلے میں دفاعی لائن تیار کرنا تھا۔ وطن کو اتنے قریب دیکھ کر میری راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ میں رات رات بھر یہ سوچتا رہتا کہ فرار ہو کر کس طرح اپنے وطن پہنچوں۔

آخر ہم پولوتسک شہر پہنچ گئے۔ ایک دن علی الصبح مجھے اپنے توپ خانے کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ میں نے دو سال میں پہلی بار اپنی توپوں کی گھن گرج سنی تھی۔ بس بھائی یوں سمجھو میرے دل میں عجیب سی ہلچل مچ گئی۔ شادی سے پہلے جب میں اریٹیکا سے ملنے جاتا تو اس وقت بھی میرا دل خوشی سے یوں سرشار ہوتا تھا۔ اس وقت جنگ پولوتسک شہر سے اٹھارہ کلومیٹر مشرق میں ہو رہی تھی۔

شہر میں جرمن غصے سے پاگل ہو رہے تھے بات بات پر گالیاں بکنا اور مرمت کرنا شروع کر دیتے تھے۔ میرے موٹے صاحب نے اب بے تحاشا پینا شروع کر دیا تھا۔

اب میں ہر وقت فرار ہونے کے منصوبے بناتا رہتا اور یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اکیلے فرار نہیں ہوؤں گا۔ جب جاؤں گا موٹا اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔ ایک دن نشے میں دُھت جرمن سپاہی کو میں نے بے ہوش کر دیا اور اس کی وردی اور ٹوپی اتار کر موٹر کی اگلی سیٹ کے نیچے ٹھونس دی۔

۲۹ جون کی صبح انجینئر صاحب نے شہر سے باہر ترو شینا کی طرف چلنے کا حکم دیا جہاں وہ مورچہ بنوا رہا تھا۔ موٹر ہچکولے کھاتی ہوئی مورچے کی طرف رواں دواں تھی۔ انجینئر صاحب پچھلی سیٹ پر لیٹتے ہوئے اونگھ رہے تھے۔ ایکسیلیٹر پر میں نے اپنے پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ میرا دل اس تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینہ توڑ کر نکل آئے گا۔ شہر سے باہر نکلتے ہی میں نے کار کی رفتار دھیمی کر دی۔ کچھ دور جا کر میں نے کار سڑک کے دائیں طرف کنارے پر روک لی۔ پچھلا دروازہ کھول کر دیکھا تو موٹا لیٹا ہوا اطمینان سے اس طرح خراٹے لے رہا تھا جیسے اپنی بیوی کے پہلو میں لیٹا ہو۔ کچھ دن پہلے میں نے گودام سے لوہے کا ایک بڑا سا ٹکڑا نکال کر اگلی سیٹ کے نیچے چھپا دیا تھا۔ اب میں نے اسے نکال کر خوب اچھی طرح تھام لیا اور تاک کر انجینئر کی کنپٹی پر دے مارا جس سے وہ بغیر آواز نکالے ایک طرف کو لڑھک گیا۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا بلکہ زندہ اپنے سپاہیوں تک لے جانا چاہتا تھا تاکہ ہوش میں آنے پر اس سے کچھ کام کی باتیں معلوم کی جا سکیں۔ میں نے اس بے ہوش انجینئر کو سیٹ پر اس طرح بٹھا دیا جیسے اسے جھپکی آ گئی ہو پھر بڑی تیزی سے میں نے جرمن سپاہی کی وردی اگلی سیٹ کے نیچے سے نکال کر پہن لی اور اپنی کار کا رخ مورچوں کی طرف کر دیا۔

ستر اسی کی درمیانی رفتار سے میں اس طرف بڑھنے لگا جہاں بڑے زوروں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ ہر طرف دُھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا۔

جرمنوں کی اگلی لائن سے میں بڑی صفائی سے نکل گیا۔ ایک مورچے میں سے مشین گن والوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ میں نے جان بوجھ کر کار کی رفتار ہلکی کر دی تاکہ وہ انجینئر صاحب کو موٹر میں دیکھ لیں۔ لیکن وہ شور مچاتے ہوئے ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے آگے جانے سے منع کرنے لگے۔ میں نے اپنے آپ کو اس طرح ظاہر کیا جیسے میں نے ان کی بات سنی ہی نہ ہو۔ کار کو میں نے اسی میل کی رفتار سے چھوڑ دیا۔ چند لمحوں میں سارا معاملہ ان کی سمجھ میں آ گیا اور وہ تڑ تڑ کار کے پیچھے گولیاں برسانے لگے لیکن میں ان کی گولیوں کی زد سے نکل چکا تھا۔ پیچھے سے جرمن گولیاں چلا رہے تھے اور آگے سے میرے سپاہیوں نے مشین گنوں سے میرا استقبال کیا۔ ونڈ اسکرین میں چار جگہ سوراخ ہو گئے اور گولیوں کی بارش سے ریڈی ایٹر کا خانہ خراب ہو گیا۔ جھیل کے پاس ایک جنگل تھا۔ میں نے کار اسی طرف موڑ دی۔ ہمارے آدمی بھی رائفلیں تانے ہوئے میرے پیچھے دوڑے۔ کچھ دور جا کر میں نے گاڑی روک دی۔ دروازہ کھول کر میں باہر نکلا اور اپنے وطن کی زمین پر گر گیا اسے بے تحاشا چومنے لگا۔ میرا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔

ایک نوجوان سپاہی میرے قریب آ کر بولا۔ "او جرمن کتے! یہاں کہاں راستہ بھول گیا"۔

میں نے آخ تھو کر کے زمین پر تھوک دیا۔ اس نے مجھے جرمن جو کہا تھا' پھر پھرتی سے میں نے جرمن وردی اتار دی۔ اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پندرہ حصوں میں تقسیم کر دیا۔

"میاں صاحبزادے! میں جرمن نہیں روسی ہوں۔ وردنیز کا رہنے والا اندری۔ میں اتنے دنوں تک دشمنوں کی قید میں تھا۔ اب فرار

ہونے میں بمشکل کامیاب ہوا ہوں۔ تم اس موٹے کو سنبھالو جو پچھلی سیٹ پر بے ہوش بیٹھا ہے۔ اس کا بیگ بھی اٹھا لو اور مجھے اپنے افسر اعلیٰ کے پاس لے چلو۔"

مجھے جھٹ پٹ افسر اعلیٰ کے پاس لے جایا گیا مگر وہ اپنے دفتر میں موجود نہیں تھا اگلے مورچوں پر سپاہیوں کو کچھ ہدایتیں دینے گیا ہوا تھا۔ شام کو مجھے کرنل کے سامنے پیش کیا گیا جو اس ڈویژن کا کمانڈر تھا۔ اس وقت تک مجھے خوب کھلایا پلایا گیا تھا۔ غسل کے بعد نئی وردی پہنا دی گئی تھی۔ ابتدائی پوچھ گچھ بھی ہو چکی تھی۔ تہہ خانے میں جب میں کرنل کے سامنے کھڑا ہوا تو پوری طرح صاف ستھرا تھا۔ کرنل اٹھ کر میرے قریب آیا اور سارے افسروں کے سامنے مجھے گلے لگاتے ہوئے بولا۔ "شاباش نوجوان! تو نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے' جرمن انجینئر اور اس کا بیگ ہمارے بہت کام آیا۔ تیرے اس کارنامے کی رپورٹ میں اعلیٰ حکام کو بھیجوں گا تو کچھ انعام و اکرام بھی ملے گا۔"

کرنل جس مہربانی سے مجھ سے پیش آیا تھا اس سے میں مضطرب ہو گیا۔ میرے ہونٹ لرزنے لگے' میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے بمشکل میں نے کہا۔ "کامریڈ کرنل! میری گزارش ہے کہ مجھے پیدل دستے میں لگا دیا جائے۔"

کرنل نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر میری پشت تھپکتے ہوئے کہا۔ "تم ابھی لڑنے کس طرح جا سکو گے؟ ابھی تو تم سے اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جاتا۔ تمہیں آج میں ہسپتال بھیجے دیتا ہوں جہاں تمہارا مکمل علاج ہو گا۔ تمہیں بہترین غذا دی جائے گی تاکہ تمہارے سوکھے جسم میں پھر سے توانائی آ جائے۔ اس کے بعد تمہیں ایک مہینے کی چھٹی دی جائے گی تاکہ تم اپنے گھر والوں سے مل سکو۔ جب تم گھر سے واپس آ ؤ گے تو دیکھا جائے گا۔"

سارے افسروں نے مجھے بڑی گرمجوشی سے رخصت کیا۔ جب میں وہاں سے نکلا تو میرے دل میں کچھ عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ حیوانوں سے بدتر دو سال گزارنے کے بعد میں انسانیت کا برتاؤ بھی بھول گیا تھا۔

ہسپتال ہی سے میں نے اپنی پیاری ایرینا کو ایک تفصیلی خط لکھا اور اب تک جو کچھ مجھ پر بیتی تھی' من و عن تفصیل سے لکھ دی۔ پتا نہیں میرے قلم میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔

دو ہفتے تک میں ہسپتال میں کھاتا اور سوتا رہا۔ جب ہسپتال سے نکلا تو میری صحت بن چکی تھی اور جسم پر فربہی آ گئی تھی۔ مجھے ایرینا کے جواب کا انتظار تھا لیکن جب وہ نہیں آیا تو میں بے چین ہو گیا۔ طرح طرح کے برے خیالات ذہن میں آنے لگے۔ بھوک پیاس اڑ گئی۔ ہر چیز سے جی اچاٹ ہو گیا۔ راتوں کی نیندیں تک حرام ہو گئیں۔

تیسرے ہفتے وردنیز سے میرے نام ایک خط آیا۔ یہ خط ایرینا نے نہیں بلکہ میرے پڑوسی تیموفے نے لکھا تھا۔ خدا کرے دشمن کو بھی ایسا خط نہ ملے۔ پڑوسی نے خط میں لکھا تھا:

"جون ۱۹۴۲ء میں جرمنوں نے ہوائی جہاز فیکٹری پر بمباری کی۔ ایک بڑا سا بم عین تمہارے مکان پر گرا۔ ایرینا اور بچے اس وقت گھر ہی میں تھے۔ پانچ سو پونڈ کا بم گرنے کے بعد ان کا کچھ پتا نہیں چلا۔ لاشیں بھی نہ ملیں۔ پہلے جس جگہ بھرا پرا گھر تھا اب وہاں گہرا گڑھا ہے۔۔۔۔۔"

اس سے آگے مجھ سے نہیں پڑھا گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ دل شدت غم سے پھٹنے لگا۔ خط پورا پڑھے بغیر میں چت لیٹ گیا اور

خالی خالی نظروں سے چھت کی طرف تکنے لگا۔ کچھ دیر بعد جی کچھ سنبھلا تو آگے پڑھنے لگا۔

"میرے بدنصیب غمزدہ بھائی اندرئی! جب ہم تمہارے مکان پر پڑا تو اناتولی شہر کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ شام کو واپس آ کر جو اس نے گھر کی جگہ گڑھا دیکھا تو تڑپ کر رہ گیا۔ امی امی...... بھیا بھیا...... باجی باجی...... روتے ہوئے پکارنے لگا۔ کافی دیر تک وہ گڑھے کے کنارے سسکیاں لیتا رہا۔ بستی کے لوگوں نے اسے تسلی تشفی دی مگر اس کے آنسو خشک ہی نہ ہوتے تھے۔ بالآخر رات کو وہ شہر واپس چلا گیا۔ میں نے اسے روکا تو بولا "اب میں یہاں رک کر کیا کروں گا چچا۔ اس مہیب گڑھے میں اپنی امی اور بھائی بہن کو کیسے تلاش کروں گا۔ بس شہر جاتے ہی فوج میں بھرتی ہو جاؤں گا۔"

خط پڑھ کر میرا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ اسٹیشن پر میری ایرینکا مجھے رخصت کرتے وقت کیسی تڑپی تھی۔ مجھے اس کے اٹک اٹک کر ادا ہونے والے الفاظ یاد آئے جو اس نے میرے سینے سے لگ کر روتے ہوئے کہے تھے "میری جان...... اندرئی...... عمر بھر کی جدائی ہے...... اب کے بچھڑے تو شاید ہی کبھی ملیں...... مجھے تو محسوس ہو رہا ہے...... جیسے ہم...... ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے ہوں......" وہ عورت تھی نا اس کے دل نے خبردار کر دیا تھا کہ اب کبھی ملاقات نہ ہوگی اور میں نے اسے دھکا دے دیا تھا...... ہائے کیسا بھرا پرا گھر تھا۔ کتنے سال لگ گئے تھے اسے بسانے میں، کتنا پیارا کنبہ تھا۔ کتنی محنت کی تھی میں نے اسے جوڑنے میں اور ایک منٹ میں سب ملیامیٹ ہو گیا۔ میں دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ قید میں تھا تو دل ہی دل میں رات کو ایرینکا اور بچوں سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ ان سے چھیڑ خانی کیا کرتا تھا۔ انہیں دلاسا دیتا تھا کہ اے میرے پیارے بچو! میں بہت جلد تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ میرے بارے میں فکرمند نہ ہونا۔ میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں زندہ سلامت ہوں۔ ہم بہت جلد ملیں گے اور پھر ہنسی خوشی ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ دو سال تک میں زندوں سے نہیں بلکہ مردوں سے باتیں کرتا رہا ہوں۔

اندرئی ایک منٹ کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "لاؤ بھائی سگریٹ کے دو چار کش ہی لگا لیں...... حلق گھٹا جا رہا ہے۔"

ہم دونوں نے سگریٹیں سلگا لیں اور خاموشی سے کش پر کش لگانے لگے۔ چند منٹ یونہی گزر گئے۔ تکلیف دہ خاموشی مجھے گراں گزر رہی تھی۔ میں نے بے تابی سے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا اندرئی؟"

"پھر کیا ہوا؟" بے اختیار اندرئی نے کہا۔ "پھر مجھے مہینے بھر کی چھٹی مل گئی۔ ایک ہفتے میں میں ورونیژ پہنچ گیا۔ اس جگہ تک میں پیدل گیا جہاں کبھی میں اپنے بھرے پرے کنبے کے ساتھ رہتا تھا۔ وہاں اب گہرا گڑھا میرا منتظر تھا۔ گڑھا پانی سے لبریز تھا اور پانی پر کائی کی ایک موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ کمر کمر تک خودرو پودے اور سوکھی جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ ویرانہ...... سناٹا...... ہر سو قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ درخت بھی سر جھکائے سوگوار سے کھڑے تھے۔ کیا بتاؤں بھائی دل پر کیا گزر گئی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کھڑے ہو کر گڑھے کے پانی کو تکنے لگا۔ "ایرینکا" میں نے چیخ کر کہا۔ "میری جان! میں آ گیا ہوں۔۔۔ میری روح کچھ تو بولو...... ایرینکا مجھ سے روٹھ گئیں کیا...... پھر میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتیں...... بچے کہاں ہیں ایرینکا...... ان سے کہو تمہارے ابو آ گئے ہیں وہ مجھ سے لپٹ کیوں نہیں جاتے...... وہ مجھ سے بولتے کیوں نہیں...... ایرینکا ان سے کہو مجھ سے باتیں کریں...... مجھ سے کچھ گلے شکوے کریں...... جواب دو میری جان

ورنہ اس خاموشی میں میرا دماغ پھٹ جائے گا...... کچھ تو بولو ایک آدھ لفظ ہی کہہ دو۔"

مگر اس گڑھے سے کوئی جواب نہ آیا۔ گرم گرم نمکین پانی کے دو قطرے میرے رخساروں سے ڈھلک کر گڑھے کے پانی میں شامل ہو گئے۔ پھر میں پلٹ پڑا اور دل مسوستا ہوا اسٹیشن چلا آیا۔ مجھ سے وہاں ایک گھنٹہ بھی نہ ٹھہرا گیا۔ اسی دن میں واپس آ کر اپنے ڈویژن میں شامل ہو گیا۔

تین ماہ بعد جیسے دم توڑتی اُمیدوں میں جان پڑ گئی۔ میری اندھیری زندگی میں روشنی کی ایک کرن چمکی۔ اس دن پہلی بار میں مسکرایا۔ اناتولی نے محاذ سے مجھے خط لکھا تھا۔ میرے پڑوسی تیمونے کے ذریعے اسے میرا پتا ملا تھا۔ خط سے معلوم ہوا کہ شروع میں تو وہ توپ خانے کے ٹریننگ کالج میں داخل ہوا۔ قابلیت تو اس میں بہت زیادہ تھی' سال بھر میں اول نمبر پاس ہو کر وہاں سے نکلا اور سیدھا محاذ پر کپتان بنا کر بھیج دیا گیا۔ پینتالیس ملی میٹر دھانے کی توپ اس کی ماتحتی میں تھی۔ اب تک شجاعت کے چھ تمغے بھی حاصل کر چکا تھا۔ مجھ سے تو وہ ہر بات میں آگے نکل گیا تھا۔ مجھے اس پر بڑا فخر ہونے لگا۔ میرا اپنا بیٹا کپتان جو ہو گیا تھا اور پھر ایک دو نہیں اس نے شجاعت کے پورے چھ تمغے حاصل کئے تھے۔

راتوں کو مجھے بوڑھوں کے سے ارمان ہونے لگے۔ جنگ کے خاتمے پر بیٹے کی شادی کروں گا۔ اسے اپنے ہاتھ سے دولہا بناؤں گا اور پھر پوتے پوتیاں ہوں گی تو انہیں گود میں کھلاؤں گا۔ کام سے فرصت ملنے پر بچوں کی خدمت کیا کروں گا۔

سردیوں میں ہماری فوج بڑھ بڑھ کر حملے کر رہی تھی اور اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم باپ بیٹے جلدی جلدی ایک دوسرے کو خط لکھ سکیں۔ جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی تھی۔ فتح ہماری تھی' ہم مارتے دھاڑتے برلن تک پہنچ گئے تھے۔ ایک دن صبح میں نے اناتولی کو خط لکھا۔ جس کا جواب مجھے دوسرے ہی دن مل گیا۔ اس سے پتا چلا کہ میں اور میرا بیٹا جرمنوں کے دارالحکومت کے قریب آ گئے ہیں اور الگ الگ سمتوں سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ میرا ایک ایک لمحہ بے چین گزرنے لگا۔ دیکھو باپ بیٹے کا ملن کب ہوتا ہے؟ اس کا میں بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ آخر وہ لمحہ آ ہی گیا۔

نومئی کی صبح جو فتح و کامرانی کا دن تھا میرے جانباز بیٹے اناتولی کو ایک جرمن سپاہی نے گولی کا نشانہ بنا دیا۔ دوپہر کو کمپنی کمانڈر کے بلاوے پر اس کے پاس گیا تو ایک اجنبی اس کے برابر بیٹھا ہوا تھا جو مجھے دیکھتے ہی احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔ توپ خانے کا لیفٹیننٹ کرنل تھا۔ کمپنی کمانڈر نے مجھ سے کہا۔

"اندری! یہ تم سے ملنے آئے ہیں" یہ کہہ کر اس نے کھڑکی کی طرف منہ پھیر لیا۔ میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا پہنچا' لیفٹیننٹ کرنل نے میرے قریب آ کر دھیرے سے کہا۔ "بات بڑے دکھ کی ہے۔ تم باپ ہو اس لئے مجھے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑ رہی مگر پھر بھی مجھے اپنا فرض تو انجام دینا ہی پڑے گا۔ تمہارا بیٹا کپتان اناتولی توپ خانے کے اپنے دستے میں مارا گیا۔ چلو میرے ساتھ اپنے بیٹے کا آخری دیدار کر لو۔"

میرا سارا وجود ہل گیا مگر میں اپنے قدموں پر کھڑا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی ہولناک طوفان میں بے سہارا کھڑا ہوں' مجھے کچھ یاد نہیں کہ لیفٹیننٹ کرنل کے ساتھ میں بڑی سی گاڑی میں کیسے گیا۔ کچھ ہوش آیا تو دیکھا کہ جوان ایک قطار میں چاق و چوبند خاموش کھڑے ہیں اور ایک تابوت سرخ مخمل میں لپٹا ہوا رکھا ہے' اناتولی اس وقت بھی میری آنکھوں میں پھر رہا ہے۔

میں تابوت کی طرف بڑھا۔ میرا بیٹا اس میں لیٹا ہوا تھا۔ ایک ملکوتی تبسم اس کے ہونٹوں پر رقصاں تھا۔ مگر یہ تو میرا اپنا نہیں تھا میرا اپنا تو ہمیشہ قہقہے لگاتا رہتا تھا اس کے شانے تو اتنے چوڑے نہیں تھے۔ اس کی گردن پر تو ہڈی نکلی ہوئی تھی۔ تابوت میں تو ایک خوبصورت وجیہہ اور کڑیل جو

ان کی لاش پڑی تھی۔ آنکھیں قدرے بند تھیں جیسے میرے بجائے وہ کہیں نامعلوم جگہ کی طرف دیکھ رہا ہو۔ مگر میں اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔ وہ واقعی میرا بیٹا تھا۔ میرا لال اناتولی۔ میں نے جھک کر اس کی روشن پیشانی کو چوما اور ایک طرف کو ہٹ گیا۔ لیفٹیننٹ کرنل نے ماتمی تقریر کی' میرے اناتولی کے ساتھیوں اور دوستوں نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے۔ مگر میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ وہ تو دل ہی میں خشک ہو گئے تھے۔ مجھ سے رویا بالکل نہیں گیا۔ یہی وجہ ہے کہ دل آج تک خون کے آنسو روتا ہے۔

جرمن زمین میں میں نے اپنی امید کو دفنا دیا۔ طویل سفر پر رخصت کرتے وقت توپ خانے والوں نے میرے لال کو سلامی دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اندر دونوں ہاتھوں سے میرے دل کو مسل رہا ہو۔ چپ چاپ تھکے قدموں' ہارے ہوئے جواری کی طرح میں وہاں سے چلا آیا لیکن میں اپنے اوسان کھو بیٹھا تھا۔ چند دن بعد میں نے فوج کی نوکری چھوڑ دی۔ وورونیژ اب میں کسی صورت میں بھی واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ یوتسک میں میرا ایک دوست رہتا تھا۔ زخمی ہونے کی وجہ سے وہ پچھلی سردیوں میں فوج سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ مجھے اس نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رکھی تھی۔ چنانچہ میں اسی کے پاس چل دیا۔

میرے دوست کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ دونوں میاں بیوی شہر کے باہر اپنے ذاتی مکان میں رہتے تھے۔ اپاہج ہونے کے باعث گورنمنٹ سے اسے پنشن ملتی تھی لیکن پھر بھی وہ ایک لاری ڈپو میں ڈرائیوری کا کام کرتا تھا۔ میں نے بھی وہیں نوکری کر لی۔ دوست نے رہنے کے لئے جگہ دے دی۔ ہر قسم کا سامان ہم اپنے ٹرکوں میں ڈھو کر شہر سے باہر بستیوں میں پہنچایا کرتے تھے۔ سردیوں کے زمانے میں غلہ ڈھوتے تھے۔ وہیں اپنے اس ننھے بیٹے سے میری ملاقات ہوئی۔ یہی شریر جو ریت سے کھیل رہا ہے۔

طویل سفر کے بعد تم تو جانتے ہی ہو کہ ڈرائیور چائے خانے کا رخ کرتے ہیں۔ تھکن دور کرنے کے لئے گرم گرم قہوے کی دو پیالیاں وہ ضرور پیتے ہیں ورنہ شراب کے ایک دو کڑوے کسیلے جام۔ میں بھی بعض اوقات پیا کرتا تھا۔ ٹھیک ہے کہ یہ بری بات ہے مگر لت ایسی لگی ہے کہ چھوٹتی ہی نہیں۔ خیر تو ایک دن میں چائے خانے میں بیٹھا تھا کہ یہ لڑکا باہر گھومتا ہوا دکھائی دیا۔ دوسرے دن یہ مجھے پھر وہیں نظر آیا۔ شڑپ شڑپ کر کے تربوز کھا رہا تھا۔ کپڑے کیچڑ اور مٹی میں لت پت' بکھرے ہوئے گرد آلود بال جیسے عرصے سے کسی نے ان میں کنگھی نہ کی ہو۔ اس کی چھوٹی چھوٹی روشن آنکھیں مجھے بہت بھائیں۔ اب تو میں آتے جاتے اسے دیکھ لوں۔ سارا دن وہ چائے خانے کے پاس گھومتا رہتا تھا۔ کسی نے کچھ دے دیا تو کھا لیا ورنہ وہیں بھوکا بیٹھا حسرت بھری نظروں سے نانبائی کو تندور سے گرم گرم نان نکالتے دیکھا کرتا۔ ایک دن سرکاری فارم سے میں نے ٹرک میں اناج لادا اور پھر ٹرک کا رخ چائے خانے کی طرف کر دیا۔ یہ چھوکرا وہیں ایک جگہ بیٹھا پاؤں ہلا رہا تھا۔ صورت ہی سے کئی وقت کا بھوکا نظر آتا تھا۔ میں نے ٹرک سے گردن نکال کر اسے آواز دی۔ "سنو اے وانیو! شوکا جلدی سے ٹرک میں آ جاؤ۔ میں تمہیں سیر کراؤں گا۔ ایک جگہ اناج پہنچانے جاتا ہے' ساتھ میں روٹی کھائیں گے اور پھر میں تمہیں یہیں پہنچا دوں گا۔" یہ سنتے ہی وہ چونک پڑا اور پھر بڑی پھرتی سے دوڑ کر ٹرک کے پاس آیا اور کھٹا کھٹ دروازہ کھول کر میرے برابر بیٹھ گیا۔ "کیوں چاچا تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرا نام وانیوشکا ہے؟" اس نے اپنی آنکھیں مٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"ارے میں نے بھی بڑی دنیا دیکھی ہے۔ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتا ہوں' چائے خانے پر تجھے سب اسی نام سے پکارتے ہیں نا۔"

بڑا شوخ اور چنچل چھوکرا لگ رہا تھا مگر ٹرک میں میرے برابر بیٹھتے ہی اسے چپ سی لگ گئی۔ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اپنی لانبی اوپر کو اٹھی ہوئی پلکوں سے میری طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھری' ہاتھ بھر کا لڑکا اور اسے ٹھنڈی سانس بھرنا بھی آ گیا۔ بھلا غم و آلام سے اسے کیا سروکار؟

"وانیوشکا' تمہارا باپ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جنگ میں مارا گیا" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"اور ماں؟"

"وہ بھی مر گئی۔ وہ بھی مجھے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چل دی۔ لوگ مرتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ کون ان کے پیچھے بے سہارا ہو جائے گا۔ میں اور میری ماں ٹرین میں جا رہے تھے کہ جرمنوں نے بمباری کر دی۔"

"یہاں تمہارا کوئی عزیز رشتے دار بھی نہیں ہے؟"

"نہیں۔ میں اس دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔"

"رات کو کہاں سوتے ہو؟"

"جہاں بھی جگہ مل گئی۔"

میرا سینہ پھر سے پھٹنے لگا' کچھ یادیں اس قسم کی آئیں کہ میرے رکے ہوئے آنسو پھر سے ابل پڑے۔ فوراً میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ ہمیں الگ الگ مصیبتیں اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کو میں اپنے ساتھ رکھوں گا۔ دونوں مل کر زمانے کے حوادث کا مقابلہ کریں گے۔ یہ فیصلہ کرتے ہی میرا جی ہلکا ہو گیا۔ ابر آلود مطلع جیسے یکبارگی صاف ہو گیا۔ میں نے اس کی طرف جھک کر آہستہ سے پوچھا۔ "وانیوشکا تمہیں پتا ہے میں کون ہوں؟"

"کون ہو؟" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

میں نے دھیمے سے جواب دیا۔ "میں؟ میں تمہارا باپ ہوں وانیوشکا"

ایک دم جیسے طوفان پھٹ پڑا۔ اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور مجھ سے لپٹ گیا۔ میرے رخساروں پر پیار کیا۔ ہونٹ چومے' پیشانی پر پیار کیا' بے تحاشا میرے بوسے لیتے ہوئے وہ سسکتا ہوا کہہ رہا تھا۔ "میرے ابو میرے ابو' مجھے معلوم تھا ایک دن آپ میرا پتا ضرور چلا لیں گے۔ ایک دن آپ ضرور ملیں گے۔ میں تو تھک گیا تھا انتظار کرتے کرتے۔"

مجھ سے بری طرح چمٹا ہوا وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے دائیں ہاتھ سے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ بمشکل میں نے اسٹیرنگ سنبھالا اور ٹرک کا رخ گھر کی طرف کر دیا۔ یہ بھی ہوش نہ رہا کہ اناج گودام میں اتارنے جانا ہے۔

ٹرک میں نے گیٹ پر چھوڑ دیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے ننھے بیٹے کو اٹھائے ہوئے اندر لے گیا۔ اب تک وہ میری گردن سے لپٹا ہوا

تھا۔ میرے رخساروں پر پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں مگر وہ میرے گال سے اپنا گال ملائے رہا جیسے چپک گیا ہو۔

میرے ہاتھ میں ایک لڑکے کو دیکھ کر مکان کے مالک اور مالکن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خوشی سے کہا۔ "یہ دانیوشکا ہے۔ میرا بیٹا میرا لال۔ دیکھئے نہیں کتنا اچھا ہے۔"

وہ دونوں میاں بیوی بھی بے اولاد تھے فوراً سارا معاملہ سمجھ گئے۔ جلدی جلدی بستر ٹھیک ٹھاک کرنے لگے۔ سارے گھر میں جیسے کھلبلی سی مچ گئی۔ دونوں میاں بیوی اسے بستر پر بٹھانے لگے۔ مگر وہ کسی طرح گود سے اترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے راضی کیا۔ اس کے ہاتھ صابن سے دھلائے کھانے کی میز پر بٹھایا۔ میرے دوست ولموف کی بیوی نے اس کے سامنے کھانا رکھا۔ کھانے کو دیکھتے ہی وہ اس پر ٹوٹ پڑا اور دونوں ہاتھوں سے کھانے لگا۔ بڑے نوالے پر نوالے۔ تو چل میں آیا کی طرح وہ کھانے پر جٹ گیا۔ میرے دوست کی بیوی جولیا بے اختیار رو پڑی۔ چولہے کی طرف منہ کر کے وہ کھڑی ہوگئی اور آنسو ٹپ ٹپ اس کے ایپرن پر گرنے لگے۔ دانیوشکا نے اسے روتے ہوئے دیکھ لیا' دوڑ کر اس کے پاس جا پہنچا اور اس کا دامن پکڑ کر بولا۔ "آپ روتی کیوں ہیں چاچی؟ ابو کو میں چائے خانے کے پاس ملا ہوں۔ یہ موقع تو بہت خوشی کا ہے اور کمال ہے آپ رو رہی ہیں۔" یہ سنتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے اس نے اپنا برا حال کر لیا۔

جب وہ پیٹ بھر کر کھانا کھا چکا تو میں اس کے بال کٹوا لایا اور ٹب میں' میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے نہلایا۔ اس کا بدن خشک کر کے میں نے اسے صاف ستھری سفید براق چادر میں لپیٹ دیا۔ اس نے پھر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور میری گودی میں سو گیا۔ میں نے اسے احتیاط سے بستر پر لٹا دیا اور خود ٹرک لے کر اناج گودام تک پہنچا آیا۔ پھر ٹرک اڈے پر پہنچا کر میں بازار کی طرف دوڑا گیا۔ ایک خوبصورت سی پتلون خریدی' ایک قمیض' سیاہ جوتے اور تنکوں کا ایک ہیٹ بھی لے لیا۔ جب سب چیزیں لے کر پہنچا تو معلوم ہوا کہ کپڑے اس کے جسم کے سائز کے نہیں ہیں اور کپڑا بھی تیسرے درجے کا ہے۔ کوئی چیز کسی کام کی نہیں۔ جولیا نے کپڑے دیکھے تو بگڑ کر بولی۔ "تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا' ایسی گرمی میں بھلا پشمینے کا موٹا کپڑا کون پہنتا ہے؟"

ایک گھنٹے میں اس نے ریشمی نیکر سی دی اور قمیض بھی ٹھیک ٹھاک کر دی۔ ایک عرصے بعد مجھے ایسی چین کی نیند نصیب ہوئی تھی لیکن رات میں کوئی چار مرتبہ مجھے اٹھنا پڑا۔ آنکھ کھلتی تو وہ میرے پہلو میں دبکا ہوا ہوتا۔ اس کے اس طرح سونے سے مجھے بڑا سکون ملتا۔ میں ساکت وصامت لیٹا رہتا کہ کہیں اس کی نیند میں خلل نہ پڑے اور وہ کم خوابی کا شکار نہ ہو جائے۔ پھر بھی بڑی احتیاط اور آہستگی سے سرک کر اٹھتا اور ماچس جلا کر اسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگتا۔

صبح اچانک دم گھٹنے سے میری آنکھ کھل گئی دیکھا۔ تو صاحبزادے میرے سینے پر سو رہے ہیں۔ اس طرح ٹانگیں پھیلائے پڑے تھے کہ میرا گلا دب گیا۔

اس کے ساتھ سونے میں بے آرامی تو ہوئی تھی مگر کیا کیا جائے اس کی عادت ہوگئی تھی میرے ساتھ سونے کی اور مجھے بھی اس کے بغیر چین نہ آتا تھا۔ رات کو جب وہ سو رہا ہوتا تو میں اس کو تھپکیاں دیتا۔ آہستہ آہستہ اس کی پشت سہلاتا۔ اس کی پیشانی پر بوسہ دیتا۔ اس کے بالوں میں

انگلیاں پھیرتا۔ دل سے بوجھ اتر جاتا اور مجھے اتنا سکون اور قرار ملتا کہ کیا بتاؤں۔ جی بالکل ہلکا پھلکا ہو جاتا۔ دل تو میرا حوادث زمانہ سے پتھر ہو گیا تھا مگر اس نے اس پتھر میں بھی جونک لگا دی۔

ابتدا میں تو وہ میرے ساتھ ٹرک میں جایا کرتا تھا مگر میں نے اسے مناسب نہیں سمجھا۔ گھر پر میں نے جولیا کی نگرانی میں چھوڑ دیا۔ شام تک وہ روتا رہا اور پھر غروب آفتاب کے بعد مجھ سے ملنے ایلیویٹر کی طرف بھاگ گیا۔ رات گئے تک وہ میرے انتظار میں وہیں بیٹھا رہا۔

شروع میں تو مجھے اس کے ساتھ بڑی مشکل پیش آئی۔ ایک دفعہ ہم باپ بیٹے سونے کے لئے لیٹے۔ اندھیرا ابھی نہیں ہوا تھا۔ دن بھر محنت کے بعد میں تھک کر چور ہو گیا تھا۔ وانیوشکا جب دیکھو باتیں کئے جاتا تھا مگر آج خلاف معمول وہ خاموش تھا۔

''کیا بات ہے بیٹے؟ خاموش کیوں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ابو وہ آپ کے چمڑے کے کوٹ کا کیا ہوا؟'' اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

زندگی بھر میرے پاس چمڑے کا کوٹ نہیں رہا تھا مگر بات تو بنانی ہی پڑی۔ ''وہ تو وردونیز میں رہ گیا۔''

''ابو اتنے دنوں تک میں آپ کو کیوں نہیں ملا؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ ''بیٹے میں نے تمہیں جرمنی میں تلاش کیا' پولینڈ میں ڈھونڈا' تمہارے لئے میں نے شمالی روس کی خاک چھانی اور بالآخر تم مجھے اتنی دور یوپسک میں ملے۔''

تم یہ سوچ رہے ہو گے میرے بھائی کہ چمڑے کے کوٹ والا سوال اس نے خواہ مخواہ کیا تھا۔ نہیں بھائی تمہارا خیال غلط ہے۔ بات یہ ہے کہ کبھی اس نے اپنے حقیقی باپ کو چمڑے کے کوٹ میں دیکھا ہوگا۔ وہی اسے یاد آ گیا۔ بچے کا حافظہ تو تم جانتے ہی ہو برق کی طرح ہوتا ہے۔ گرمیوں کے موسم کی بجلی کی طرح' جو ایک لمحے کے لئے چمکتی ہے تو ہر طرف اجالا ہو جاتا ہے اور پھر وہی گھپ اندھیرا۔ اس بچے کی یادداشت بھی ایسی ہی تھی جو کسی وقت ایک لمحے کے لئے چمکتی تھی۔

غالباً یوپسک میں ہم دو سال اور رہتے لیکن مجھ سے ایک چھوٹا سا حادثہ سرزد ہو گیا جس کے باعث میرا لائسنس چھین لیا گیا۔ سردی بھر اپنا وہی بڑھئی کا کام کرتا رہا۔ میرا فوج کا ایک ساتھی تمہارے کشاری میں رہتا ہے۔ جس سے میری خط کتابت ہوتی رہتی ہے اس نے لکھا کہ اس علاقے میں مجھے ڈرائیوری کا لائسنس مل جائے گا۔ اب وہیں کشاری جا رہا ہوں اس کے پاس۔ پیدل کا سفر ہے۔

حادثہ نہ ہوتا تو میں یوپسک سے کہیں اور چل دیتا۔ دل اتنا افسردہ ہو جاتا ہے کہ اب ایک جگہ نہیں رہا جاتا کسی ایک جگہ ٹکنے سے وحشت ہوتی ہے۔ اب اپنے بیٹے کو اسکول میں داخل کر دوں گا۔ ایک جگہ ٹک کر رہوں گا تو مجھ میں کچھ انسانیت آ جائے گی۔ ابھی تو وانیوشکا کو ساتھ لئے روس کی سرزمین ناپتا پھر رہا ہوں۔''

''اس کے ساتھ تو تمہیں بڑی مشکل پیش آتی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''پیدل تو یہ بہت کم چلتا ہے۔ زیادہ تر مجھے ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ کندھے پر اسے اٹھا کر چلتا ہوں۔ ذرا آرام کرنے لگتا ہوں تو سڑک کے

کنارے ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرنے لگتا ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ اب دل جھٹکے کھانے لگا ہے۔ بعض دن دل میں اتنا درد اٹھتا ہے کہ دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔ ڈر ہے کہ کسی دن ملک عدم کو نہ سدھار جاؤں۔ پھر میرے بچے کا کیا ہوگا؟ اب تو ہر رات خواب میں اپنے مرحوم بچے نظر آتے ہیں۔ کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ میں خاردار تاروں کے پیچھے ہوں اور وہ باہر کھلے میں کھڑے ہیں۔ میں ان سے باتیں کرتا رہتا ہوں لیکن جیسے ہی میں تاروں کو ہٹانے لگتا ہوں وہ پیچھے ہٹنے لگتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں' حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دن بھر تو اپنے آپ پر قابو رکھتا ہوں لیکن رات کو بعض اوقات آنکھ کھلتی ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ سارا تکیہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔"

اتنے میں پانی میں چپوؤں کے چلنے کی آواز آنے لگی۔ میرا ساتھی دریا کے دوسرے کنارے سے آ چکا تھا۔ اجنبی جو اتنی دیر میں میرے لئے اپنا ہو چکا تھا اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا بھاری بھرکم ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

"اچھا بھائی اب چلتے ہیں۔ خدا حافظ۔ خدا کرے تم بخیریت اپنی منزل مقصود کو پہنچو۔"

"تمہارا سفر بھی خیریت سے گزرے بھائی اور کشادی تک بغیر کسی مصیبت کے پہنچ جاؤ۔"

"شکریہ بھائی تمہارا بہت شکریہ چلو بیٹے کشتی پر چلیں۔"

لڑکا دوڑتا ہوا اپنے باپ کے پاس آیا اور اس کے پہلو سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ بچے نے اپنے باپ کے کوٹ کا دامن پکڑ لیا۔ پھر دونوں کشتی کی طرف چل دیے۔ باپ لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا اور بیٹا اس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔

دو لاوارث انسان' ایک دوسرے کا سہارا جنہیں جنگ کے ہولناک طوفان نے کہیں کا کہیں لا کر پھینک دیا تھا۔ آگے جو گزرنی ہے اسے کون جانتا ہے۔ مگر میں سوچ رہا تھا اٹل ارادے کا جانباز زندگی کی گاڑی کو کھینچ لے جائے گا' باپ کے سائے میں بیٹا پل کر جوان ہوگا تو اس میں سب کچھ برداشت کرنے کا مادہ پیدا ہو چکا ہوگا اور جب بھی وطن کو اس کی ضرورت ہوگی یہ سب سے آگے ہوگا۔

کچھ دور جا کر بچے نے اپنے ننھے ننھے گلابی ہاتھ ہلا کر مجھے خدا حافظ کہا۔ میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ عمر رسیدہ لوگ صرف سوتے میں ہی نہیں رویا کرتے۔ یہ لوگ جاگتے میں بھی آنسو بہاتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ عین وقت پر منہ پھیر لینے کی چستی ضروری ہے تاکہ بچہ آپ کے رخساروں پر پھسلتے ہوئے آنسوؤں کو نہ دیکھ پائے اور اس کا معصوم دل کسی صدمے سے دوچار نہ ہو۔

☆......☆......☆

معمول

آئزک بی سنگر 1904ء میں پولینڈ میں پیدا ہوئے۔ بعدازاں پولینڈ سے ہجرت کی اور امریکہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ وہ مذہباً یہودی تھے۔ انہوں نے روایتی تعلیم حاصل نہیں کی۔ کسی کالج سے سند یافتہ نہیں تھے۔ ساری عمر تخلیق و تصنیف میں گزاری۔ یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ وہ ایک زبردست تخلیق کار تھے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں قابل داد مہارت سے یہودی روایات کی عکاسی کی اور عالمی سطح پر انسانیت کو درپیش مشکلات کو اپنا موضوع بنایا۔ مشرقی یورپ میں بسنے والے یہودیوں کے مسائل کو اجاگر کرنے میں بھی انہوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ان کی تحریروں میں ان کی قوت مشاہدہ، ذاتی تجربات اور تخیل کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ قدیم اور جدید روایات کے مابین تصادم کو انہوں نے بہت مہارت اور حسن و معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں آزادی فکر، تصوف، مذہب اور اعلیٰ معاشرتی اقدار کا فروغ بھی ان کی تحریروں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ آئزک بی سنگر کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں 1978ء میں نوبل انعام عطا کیا گیا۔

☆......☆......☆

دوسری عالمی جنگ کے دوران بے شمار یہودی اہل قلم نے پولینڈ سے راہ فرار اختیار کی اور کیوبا، مراکش اور دوسرے ممالک کے راستے امریکہ پہنچ گئے۔ ایوان بھی ان میں سے ایک تھا۔ وہ نیویارک کے اخبارات کا مطالعہ باقاعدگی سے نہیں کرتا تھا اس لئے وہ اس بات سے لاعلم تھا کہ اس کے ساتھیوں میں سے کتنے امریکہ پہنچنے میں کامیاب رہے اور کتنے راستے میں مارڈالے گئے۔

ایک دن وہ پانچویں ایونیو کی عوامی لائبریری میں بیٹھا ٹیلی پیتھی اور غائب دانی کے بارے میں ایک کتاب کا مطالعہ کررہا تھا کہ اسے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے نظریں اوپر اٹھائیں تو کرسی کے پاس ایک پستہ قد مرد کھڑا نظر آیا۔ اس کی پیشانی کشادہ تھی، بال سفیدی مائل اور آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی، خم کھائی ہوئی ناک اور بالائی ہونٹ ضرورت سے زیادہ اوپر کو اٹھا ہوا۔ اس کی قمیص پر بے شمار سلوٹیں تھیں اور ٹائی گلے میں جھول رہی تھی۔ مسکرانے کی کوشش میں اس کے دانت باہر نکلے پڑ رہے تھے۔ اس کا انداز بتا رہا تھا جیسے وہ ایوان کو بہت قریب سے جانتا ہو لیکن ایوان اسے پہچان نہیں سکا۔ اس کا چہرہ اگرچہ کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا لیکن ایوان کو یاد نہیں آرہا تھا کہ اسے کب اور کہاں دیکھا ہے۔ دراصل اس کا ذہن اس وقت ٹیلی پیتھی اور غیب دانی میں الجھا ہوا تھا جس پر زیر مطالعہ کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔

''تم شاید مجھے بھول چکے ہو!'' اس نے پہلی مرتبہ لب کشائی کی۔ ''تمہیں شرم آنی چاہیے! شکین ایسی چیز تو نہیں جسے اس قدر آسانی سے بھلایا جا سکے۔''

ایوان کے ذہن میں ایک جھماکہ سا ہوا اور اس کے بارے میں ہر چیز واضح ہوتی چلی گئی۔ شکین وارسا کے ایک اخبار میں کالم نویس تھا۔ دونوں طویل عرصے تک ایک ساتھ رہے تھے۔ وہ عمر میں اگرچہ ایون سے تقریباً بیس سال چھوٹا تھا لیکن بے تکلفی ہم عمر دوستوں کی طرح تھی۔ آپس کا مذاق بھی چلتا رہتا تھا۔ یہ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ وہ پہلی نظر میں اسے پہچان نہیں سکا تھا۔

''اوہ!'' وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ''تو تم زندہ ہو۔ میں تو سمجھا تھا کہ مر کھپ گئے ہو گے۔ میں واقعی تمہیں نہیں پہچان سکا تھا۔''

''شاید اس لئے کہ میں وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا ہوں اور میرے چہرے پر کچھ تبدیلیاں آ گئی ہیں۔''

''نہیں بالکل نہیں! تم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ لیکن تم یہاں کیسے پہنچے؟''

''لمبی کہانی ہے! میرے بیشتر دوست تمہاری طرح مجھے مردہ تصور کر چکے تھے۔ میرے مرنے میں کوئی کسر رہ بھی نہیں گئی تھی۔ پولینڈ سے فرار ہوتے ہوئے قدم قدم پر موت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ میرا خیال ہے باتوں کا مزہ کافی کے ساتھ آئے گا۔ اس کتاب کا مطالعہ اگر ضروری نہیں تو چلو کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہیں۔ ویسے یہ کونسی کتاب ہے جس میں تم اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ آس پاس کا ہوش بھی نہیں تھا۔'' شکین نے کتاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور جب ایون نے اسے کتاب کے موضوع کے بارے میں بتایا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کمال ہے! یہ فضول سی چیزیں ابھی تک تمہارے ذہن پر مسلط ہیں۔''

ایوان کوئی جواب دیے بغیر اٹھ گیا۔ کتاب کو ریک میں اس کی جگہ پر رکھا اور شکین کے ساتھ لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ چند منٹ بعد وہ دونوں لائبریری کی عمارت سے نکل کر سڑک پر پہنچ گئے۔ تقریباً نصف فرلانگ آگے ایک کیفے ٹیریا میں داخل ہوتے ہوئے ایون نے شکین کی طرف دیکھا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ ایک میز پر قبضہ جمانے کے بعد اس نے شکین کے لئے کھانے کا آرڈر دینا چاہا لیکن اس نے منع کر دیا اور صرف کافی کی فرمائش کی۔ ''میں کھانا کھا چکا ہوں۔ صرف کافی پیوں گا۔ بلیک کافی' لیکن خوب گرم ہونی چاہیے' نجانے امریکہ والے کافی کو ٹھنڈا کر کے کیوں پیتے ہیں۔ اور سنو! ویٹر کو بتا دینا کہ شکر الگ لے کر آئے۔ کافی میں نہ ملائے۔''

''جنگ کے دوران وارسا سے رخصت ہوتے ہوئے میں نے سنا تھا کہ تم بھی کسی طرف فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔ اتنا عرصہ کہاں رہے!'' ایوان نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

شکین نے ختم ہوتے ہوئے سگریٹ سے ایک نیا سگریٹ سلگایا اور گہرا کش لگاتے ہوئے بولا۔ ''میں پولینڈ سے نکل کر کسی نہ کسی طرح ریوڈی جنیرو پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے فوراً ہی ایک اخبار میں کام مل گیا۔ اس دوران میں ''فارورڈ'' میں تمہارے مضامین بھی باقاعدگی سے پڑھتا رہا۔ مافوق الفطرت قصوں اور توہم پرستی سے تمہاری دلچسپی کو میں محض ادبیت کی ایک صنف سمجھتا رہا تھا لیکن جب خود میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا تو اس کی توجیہ میری سمجھ میں نہ آ سکی۔''

''اوہو! کہیں تم نے کوئی بھوت تو نہیں دیکھ لیا؟'' ایوان نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ ایسی ہی بات ہے!''

''تو پھر انتظار کس بات کا کر رہے ہو۔ میں تمہاری کہانی سننے کو بے چین ہو رہا ہوں۔ تم ہمیشہ میری باتوں کا مذاق اڑاتے رہے ہو۔ لیکن اب تو تمہارے ساتھ پیش آنے والا واقعہ یقیناً میرے لئے لچسپ مواد فراہم کرے گا۔ چلو اب شروع ہو جاؤ۔''

''حقیقت تو یہ ہے کہ ایسی باتوں کو میں ہمیشہ لغو سمجھتا رہا اور میرا خیال تھا کہ ان چیزوں میں الجھ کر تم اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہو۔ میں نے تمہیں کئی مرتبہ ٹوکا بھی تھا لیکن تم نے کبھی میری بات پر کان نہیں دھرا۔ بہرحال میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا میں ابھی تک اس کی کوئی توجیہ تلاش نہیں کر سکا۔ ہوسکتا ہے وہ میرا ذہنی فتور رہا ہو لیکن مجھے اپنی ذہنی کیفیت پر کبھی شبہ نہیں رہا۔ نہ کبھی مجھے کسی قسم کا دماغی دورہ پڑا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جب جنگ چھڑی تو میں فرانس میں تھا۔ جس کے فوراً ہی بعد میں وارسا چلا آیا۔ میرا خیال تھا کہ پولینڈ میں جنگ کی وہ شدت نہیں ہوگی جو میں فرانس میں دیکھ چکا تھا لیکن وہاں پہنچتے ہی پتا چلا کہ یہودی وہاں سے بھی فرار کی راہیں تلاش کر رہے ہیں چنانچہ میں نے بھی وارسا چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور چند افراد کے ایک گروہ کے ساتھ' جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے' بھاگ کھڑا ہوا۔ ہم کسی اور سمت میں جانا چاہتے تھے لیکن بدقسمتی سے راستہ بھٹک کر ایک بار پھر فرانس پہنچ گئے۔ فرانس میں جنگ کچھ اور شدت اختیار کر چکی تھی۔ جرمنوں کا تسلط بڑھ رہا تھا۔ نازی درندے خون کی ہولی کھیل رہے تھے۔ یہودیوں کو تو وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ غرض یہ کہ میں فرانس سے بھی بھاگ نکلا اور کسی طرح کاسابلانکا پہنچنے میں کامیاب ہو گیا' اور پھر نجانے کہاں کہاں بھٹکتا ہوا' برازیل جا نکلا جہاں یہودیوں کی ایک قابل ذکر تعداد پہلے ہی سے آباد تھی۔ ان کا کچھ اثر و رسوخ بھی تھا اور ریوڈی جنیرو سے ان کا ایک چھوٹا سا اخبار بھی نکلتا تھا۔''

''اس اخبار کی انتظامیہ کے لئے میرا نام اجنبی نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے اخبار کی ادارت سنبھالنے کی پیش کش کی جسے میں نے بخوشی قبول کر لیا۔ ریو اگرچہ خوبصورت شہر ہے لیکن صحافت کے نقطۂ نگاہ سے بالکل مردہ۔ وہاں کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوتا جسے خبر کا رنگ دیا جا سکے' نہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نظر آتی ہے جسے نمایاں طور پر چھاپا جا سکے۔ بس سست زندگی اور روزمرہ کے معمولات۔ میں نے اخبار کی شکم پری کے لئے تمہارے پرانے مضامین چھاپنے شروع کر دیئے۔ میرا زیادہ تر وقت شہر کی آوارہ گردی میں گزرتا۔ میں نے ریوڈی جنیرو کو مردہ شہر کہا ہے لیکن وہاں کی حسین عورتوں کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ ان سے زیادہ زندہ دل تو شاید ہی کہیں پائی جاتی ہوں۔ اخبار کے سلسلے میں مجھے کبھی کبھار نیویارک آنے کا بھی موقع ملتا۔ ویزے کا حصول میرے لئے کبھی بھی مشکل ثابت نہیں ہوا۔ میں ہمیشہ ارجنٹائن کے بحری جہاز پر سفر کرتا جو بارہ دن میں مجھے نیویارک پہنچا دیتا۔''

''اس مرتبہ میں نے جہاز کی ٹورسٹ کلاس میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے جو کیبن دیا گیا اس میں ایک یونانی اور دو اطالوی بھی سفر کر رہے تھے۔ یونانی بہت ہی بدتمیز قسم کا آدمی تھا۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ بڑبڑاتا رہتا اور زیر لب نہ جانے کس کس کو گالیاں دیتا رہتا۔ میرے خیال میں وہ اپنی جوان بیوی کو چھوڑ کر کہیں جا رہا تھا اور اسے اپنی بیوی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ رات کو جب کیبن کی بتی بجھا دی جاتی تو دیر تک اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دیتی رہتی۔ تاریکی میں اس کی آنکھیں بھیڑیے کی طرح چمکتی نظر آتیں جن سے مجھے عجیب سا خوف محسوس ہونے لگتا۔''

"دونوں اطالوی غالباً جڑواں بھائی تھے۔ ان دونوں کی شکلیں ایک دوسرے سے اس قدر مشابہ تھیں کہ کوئی امتیاز کرنا مشکل تھا۔ دونوں کے قد چھوٹے اور جسم غبارے کی طرح پھولے ہوئے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ دونوں ہمیشہ لباس بھی ایک ہی قسم کا پہنتے۔ جہاز کے اکثر مسافر اور ملازم ان دونوں کے بارے میں اور ان کی شناخت کے سلسلے میں دھوکے میں رہے۔ وہ دونوں دن بھر آپس میں باتیں کرتے رہتے۔ ان کی زبان اس وقت بند ہوتی جب آدھی رات کے بعد نیند کی آغوش میں پہنچ جاتے لیکن صبح ہوتے ہی ان کے ٹیپ ریکارڈ پھر چل پڑتے۔ بارہ دن کے سفر کے دوران میں نے نیند کے علاوہ انہیں ایک لمحے کو بھی خاموش ہوتے نہیں دیکھا۔ ستم ظریفی یہ کہ ہر دو چار منٹ بعد وہ وحشیوں کی طرح قہقہے لگانے لگتے۔ یونانی کی طرح اطالوی زبان کا کوئی لفظ بھی کبھی میری سمجھ نہیں آ سکا۔ میں ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں اپنا مافی الضمیر بیان کر لیتا ہوں اور کسی حد تک سمجھ بھی لیتا ہوں لیکن وہاں کس سے باتیں کرتا۔ ان تینوں نے مجھے پوری طرح نظر انداز کر رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں دیواروں سے تو باتیں کرنے سے رہا۔ میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ خاموش بیٹھا ان کی بکواس سنتا رہوں۔ بحری سفر میں ایک اور بات میرے لئے بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ رات میں کم از کم دس مرتبہ مجھے باتھ روم جانے کے لئے اٹھنا پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے اس مرتبہ مجھے اوپر والا برتھ ملا تھا۔ بار بار اترنا اور چڑھنا بھی ایک مسئلہ تھا۔

سفر کے پہلے روز جب کھانے کا وقت ہوا تو میں یہ سوچ کر پریشان ہونے لگا کہ مجھے کسی ایسی میز پر جگہ نہ دے دی جائے جہاں میں اپنے ہم نشینوں کی زبان نہ سمجھ سکوں۔ آدمی اکیلا ہو تو خاموشی نہیں کھلتی لیکن اگر کوئی قریب بیٹھا ہو اور اس کی زبان سمجھ میں نہ آ سکے تو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے دروازے کے قریب ایک ایسی میز دی گئی جہاں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ میں اپنی میز دیکھتے ہی خوش ہو گیا کہ اطمینان و سکون سے کھانا تو کھا سکوں گا۔ لیکن چند سیکنڈ بعد ہی میری یہ خوش فہمی رفع ہو گئی۔ اپنی میز پر سرو کرنے والے ویٹر کو ایک نظر دیکھتے ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہری دوڑ گئی۔ بعض اوقات کسی سے نفرت کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ میں پہلی ہی نظر میں اس ویٹر کو نجانے کیوں اپنا بدترین دشمن سمجھنے لگا تھا اور عجیب سی بات یہ ہے کہ میرے لئے اس کی آنکھوں میں بھی نفرت کی چنگاریاں سی سلگتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

ارجنٹائن کے باشندے عام طور پر متوسط قد و قامت کے ہوتے ہیں لیکن یہ ویٹر ان سے قطعی مختلف تھا۔ دیو قامت' پھیلے ہوئے کندھے اور آنکھوں میں ایسی چمک جو عام طور پر کسی قاتل ہی کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ جب وہ میری میز کے قریب پہنچا تو پہلی مرتبہ اس کی طرف دیکھتے ہی مجھے پھریری سی آ گئی۔ اس کے چہرے پر درندگی کے تاثرات تھے اور آنکھیں تو گویا نفرت کی شدت سے اپنے حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ میں نے پہلے تو اس سے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی پھر جرمن زبان میں بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ خاموشی سے نفی میں سر ہلا کر رہ گیا جیسے میری بات نہ سمجھ سکا ہو۔ پھر میں نے اشارے سے اس سے مینو طلب کیا تو وہ بے ڈھنگے انداز میں سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مینو لینے گیا ہے لیکن اس کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔ میں نے اسے کھانے میں اپنی مطلوبہ چیزوں کا آرڈر دیا۔ وہ پہلے تو میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکراتا رہا پھر ایسی چیزیں لا کر میرے سامنے رکھ دیں جنہیں میں چکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس کا انداز بھی ایسا تھا جیسے جہاز کے کسی معزز مسافر کو نہیں کسی بھکاری کو کھانا دے رہا ہو۔ میرا دماغ سلگ اٹھا۔ میری کیفیت دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر آنے والی مکروہ سی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ اس نے شوربے کی پلیٹ اس طرح میز پر رکھی کہ شوربے کے چھینٹے اڑ کر میرے لباس پر پڑے۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ

گئی کہ وہ میرے خلاف اعلان جنگ کر چکا ہے۔

"دن میں تین مرتبہ ناشتے اور کھانے کے دوران میں اپنے آپ کو اس کے رحم و کرم پر پاتا۔ مجھے ذہنی اذیت پہنچانے کے لئے وہ ہر مرتبہ نت نئے ہتھکنڈے آزما رہا تھا۔ میں کھانے میں فرائی گوشت طلب کرتا تو وہ میرے سامنے نمکین پانی میں ابلی ہوئی مچھلی لا کر پٹخ دیتا جس سے مجھے شدید نفرت تھی۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ وہ کوئی نازی ہے اور یہودی ہونے کی وجہ سے مجھ سے کسی قسم کا انتقام لے رہا ہے۔ لیکن مجھے خود ہی اپنے اس خیال کی نفی کرنی پڑی۔ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر دوسری میز پر ایک یہودی فیملی بیٹھا کرتی تھی۔ عورت نے تو بلاؤز پر اسٹار آف ڈیوڈ کا بروچ بھی لگا رکھا تھا جو اس کے یہودی ہونے کا واضح اعلان تھا۔ ان کی میز پر بھی وہی دیو قامت ویٹر تھا۔ انہیں وہ بڑے سلیقے سے سرو کرتا' بعض اوقات مسکراتے ہوئے بڑے شائستہ لہجے میں ان سے باتیں بھی کرتا۔ اس کا یہ نفرت آمیز رویہ تو صرف میرے لئے مخصوص تھا۔ میں اپنی میز چھوڑ کر ہیڈ اسٹیوارڈ کے پاس پہنچ گیا اور اس سے درخواست کی کہ میری میز تبدیل کر دی جائے لیکن یا تو وہ میری بات سمجھا نہیں یا جان بوجھ کر اس نے ایسا تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ میری زبان نہیں سمجھتا۔ جہاز میں اور بھی لاتعداد یہودی موجود تھے۔ اگر میں چاہتا تو کسی کے ساتھ بھی ہم نشینی اختیار کر سکتا تھا مگر اس دیو قامت ویٹر کے رویے سے میرا موڈ اس قدر خراب ہو چکا تھا کہ کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا لیکن آخر کار جب میں نے ایک اور آدمی سے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ میری بات کا جواب دینے کی بجائے عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ مجھے اس کی بد اخلاقی پر بڑا تاؤ آیا۔ لیکن مجھے جلد ہی احساس ہونے لگا کہ بعض نامعلوم طاقتیں میرے گرد کسی قسم کا جال بن رہی ہیں۔"

"اس صورت حال نے میری راتوں کی نیند بھی اڑا دی۔ جب بھی آنکھ لگتی بھیانک خواب دکھائی دینے لگتے اور میں چیختا ہوا اٹھ جاتا اور باقی رات آنکھوں میں بیت جاتی۔ دن کا بیشتر حصہ بھی اسی بے چینی میں گزرتا۔ میرے ذہن میں ایک یہ خیال بھی آیا کہ ممکن ہے یہ سب کچھ میرا وہم ہو یا میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن وہ خواب نہیں' حقیقت تھی۔ ایک بھیانک حقیقت جس کا میں سامنا کر رہا تھا اور اس سے فرار کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔"

شیکن ایک لمحے کو خاموش ہو گیا۔ اس نے پیکٹ کا آخری سگریٹ نکال کر سلگایا اور بھرپور کش لگا کر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "بارہ دن کا یہ بحری سفر میرے لئے جہنم کا سفر بن کر رہ گیا تھا۔ ہر نیا دن گزرے ہوئے دن سے زیادہ بدتر ثابت ہوتا۔ وہ دیو قامت ویٹر میرے لئے ایک عذاب بن گیا تھا۔ میرا کھانا پینا ختم ہو رہا تھا۔ پہلے میں نے صبح کے ناشتے کو الوداع کہا۔ پھر ایک وقت کا کھانا بھی چھوڑ دیا۔ میں اس ویٹر کا سامنا کرنے سے بچنا چاہتا تھا اور میرے خیال میں زندہ رہنے کے لئے ایک وقت کا کھانا کافی تھا۔ اب میں صرف رات کا کھانا کھانے کے لئے ڈائننگ ہال کا رخ کرتا۔ لیکن وہ چند منٹ بھی میرے لئے کسی عذاب سے کم نہ ہوتے۔ میں انڈے کے آملیٹ کا آرڈر دیتا' اور ویٹر میرے سامنے ابلے ہوئے آلو اس طرح لا کر رکھ دیتا جیسے کتے کے سامنے ہڈی ڈالی جاتی ہے۔"

"مجھے کہیں بھی چین نہیں تھا۔ عرشے پر اطالوی عورتوں کا قبضہ تھا جو دن بھر بے ہنگم انداز میں ناچتی اور گانے گاتی رہتیں۔ راہداریوں میں آدمی بیٹھے تاش اور شطرنج وغیرہ کھیلتے رہتے۔ میں کسی ایسے گوشے کی تلاش میں رہتا جہاں دو گھڑی سکون مل سکے لیکن جہاز پر ایسی کوئی جگہ نہیں تھی۔

جب ہمارا جہاز استوائی علاقے میں پہنچا تو یوں محسوس ہوا جیسے ہم جہنم کے کسی خطے میں سفر کر رہے ہوں۔

''اپنے کیبن میں بددماغ یونانی اور ہمشکل اطالوی بھائیوں کی لایعنی بکواس سے بچنے کے لئے میں اکثر عرشے پر نکل آتا۔ ویٹر کے نفرت آمیز رویے سے بچنے کے لئے میں نے ایک طریقہ نکال لیا تھا۔ رات کے کھانے کے وقت میں ڈائننگ ہال میں جاتا اور پنیر کا ٹکڑا' ڈبل روٹی یا کوئی پھل وغیرہ جو بھی چیز ہاتھ لگتی جیبوں میں ڈال کر کیبن میں لے آتا۔ لیکن میرے مہربان دشمن کو بھی جلد ہی اس چوری کا پتہ چل گیا' اور وہ بری طرح برس پڑا۔ اس روز میں ایک مالٹا لے کر ڈائننگ روم سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دیوقامت ویٹر نے دیکھ لیا۔ ویٹر نے مالٹا میرے ہاتھ سے اس طرح چھینا جیسے چیل گوشت پر جھپٹتی ہے۔ اس کے تیور دیکھ کر میں تو یہی سمجھا تھا کہ وہ میری پٹائی شروع کر دے گا۔ لیکن خیریت گزری۔ اس روز کے بعد میں نے ہر وہ چیز کھانی چھوڑ دی جس میں کچھ ملایا جا سکتا ہو۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ مجھے زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کرے گا۔ اب میرا گزارا صرف پھلوں پر تھا۔ کبھی تو میں ڈائننگ روم سے کوئی پھل چرا لانے میں کامیاب ہو جاتا اور کبھی فاقہ کرنا پڑتا۔''

''جہاز کے نیویارک پہنچنے سے پہلے کپتان کی طرف سے مسافروں کو فیئر ویل ڈنر دیا گیا۔ اس روز ڈائننگ روم کو رنگ برنگی جھنڈیوں اور روشنیوں سے سجایا گیا تھا۔ ڈائننگ ہال کا بدلا ہوا نقشہ دیکھ کر ایک لمحے کو تو میں پہچان ہی نہ سکا۔ مسافروں نے اپنے بہترین لباس زیب تن کئے تھے۔ کچھ لوگوں نے ایسا لباس پہنا تھا جیسے کسی فینسی ڈریس شو میں شرکت کے لئے آئے ہوں۔ ہر میز پر خاص طور پر اس موقع کے لئے بنائی گئی خوبصورت ٹوپیاں رکھی ہوئی تھیں۔ مینو کارڈ بھی وہ نہیں تھے جو روزانہ استعمال ہوتے تھے۔ ان نئے مینو کارڈوں پر سرخ ڈوریوں کے ساتھ سنہری ربن بندھے ہوئے تھے۔ اس ڈنر کو بہت بڑی تقریب کا رنگ دیا گیا تھا۔ ہر شخص خوش نظر آ رہا تھا مگر میرے ازلی دشمن اس دیوقامت ویٹر نے مجھے ذہنی اذیت پہنچانے کے لئے اس موقع سے بھی خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ دوسری میزوں پر نظر آنے والی کاغذی ٹوپیاں واقعی خوبصورت تھیں۔ انہیں کوئی بھی شخص بخوشی پہن سکتا تھا۔ لیکن اس کم بخت ویٹر نے میری میز پر جوکروں والی لمبی سی ٹوپی رکھ دی تھی جس کی نوک پر پھندنا لگا ہوا تھا۔''

''کرسی سنبھالتے ہی میں نے وہ ٹوپی اٹھا کر نیچے پھینک دی۔ میرا خیال تھا کہ اس الوداعی ڈنر میں وہ ویٹر اپنی پچھلی حرکتوں کا اعادہ نہیں کرے گا' اور میں پہلی مرتبہ پیٹ بھر کر اپنی پسند کا کھانا کھا سکوں گا' لیکن صورتحال اس کے برعکس نظر آ رہی تھی۔ وہ ویٹر دوسری میزوں پر تو سرو کرتا رہا لیکن مجھے مستقل طور پر نظرانداز کئے رکھا۔ چکن سوپ' فرائی فش' بھنے ہوئے گوشت' تلے ہوئے آلو اور کیک وغیرہ کی خوشبو سے میری بھوک میں اضافہ ہوتا رہا لیکن وہ بدبخت ویٹر میری میز کی طرف پھٹکا بھی نہیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس نے میز کے قریب رک کر مینو کارڈ اس طرح میری طرف پھینکا کہ وہ میرے نرخرے پر لگا۔ موٹے چکنے کارڈ کا کنارہ چھری کی طرح دھاردار تھا۔ میں کراہ کر اپنا گلا سہلانے لگا۔ ویٹر نے ٹوپی فرش پر پڑی ہوئی دیکھی تو اس کی آنکھوں میں گویا خون اتر آیا۔ اس نے ٹوپی اٹھا کر اس طرح زبردستی میرے سر پر منڈھ دی کہ میری عینک گرتے گرتے بچی۔ میں نے ٹوپی اتار کر ایک بار پھر فرش پر پھینک دی۔ میری یہ حرکت دیکھ کر وہ ہسپانوی میں گالیاں بکنے لگا۔ میں ہسپانوی زبان سے بھی نابلد تھا اس طرح گالیوں کا مفہوم سمجھنے سے بچا رہا۔ وہ کچھ دیر تک گھونسا تانے کسی قسم کی دھمکیاں دیتا رہا اور میرا آرڈر لئے بغیر پھنکارتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس مرتبہ اس کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی۔ میں نے ابھی تک اگرچہ اسے کوئی آرڈر نہیں دیا تھا لیکن اس نے سوکھی ہوئی ڈبل روٹی اور انتہائی گھٹیا شراب

کا پیالہ میری میز پر پٹخ دیا۔"

"میں اس امید پر چاروں طرف دیکھنے لگا کہ شاید جہاز کا کوئی ملازم یا مسافر میرے ساتھ ویٹر کا یہ نازیبا رویہ دیکھ کر مداخلت کرے لیکن ہر شخص اپنے حال میں مست تھا۔ کسی کو دوسرے کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی۔ اگر کوئی میری طرف دیکھ بھی رہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بھی میری بے بسی کا مذاق اڑا رہا ہو۔ یہاں تک کہ اپنے قریب والی میز پر بیٹھے ہوئے یہودی جوڑے کے بارے میں بھی میں نے کچھ ایسا ہی محسوس کیا۔ میں عجب اذیت کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ یہ کس عذاب میں مبتلا ہو گیا ہوں۔"

"اب وہاں مزید رکنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ ظاہر ہے کچھ کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اٹھ کر اپنے کیبن میں آ گیا۔ یونانی یا دونوں ہمشکل اطالوی بھائیوں میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا' میں لباس تبدیل کیے بغیر اپنی برتھ پر چڑھ کر لیٹ گیا۔ جہاز سمندر کی لہروں کو چیرتا آگے بڑھتا رہا اور اوپر ہال سے موسیقی' قہقہوں اور شوروغل کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ میں اس قدر تھکا ہوا تھا کہ لیٹتے ہی سو گیا۔ اگر اس وقت کوئی آ کر میرا گلا بھی کاٹ دیتا تو مجھے پتہ نہ چلتا۔ میں نجانے کتنی دیر سویا تھا کہ یکایک میری آنکھ کھل گئی۔ دوسرے ہی لمحے میں چھلانگ لگا کر اپنے برتھ سے اترا اور میں نے باتھ روم کی طرف دوڑ لگا دی' دروازے سے باہر آتے ہی میرا پیر پھسلا اور میں گرتے گرتے بچا۔ کسی نے راہداری میں قے کر دی تھی۔ میں سنبھلتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔ چند منٹ بعد باہر نکلا تو میرا رخ کیبن کی بجائے بالائی عرشے کی طرف تھا۔ میرے کیبن کے تینوں ساتھی ابھی تک ڈائننگ ہال میں ہونے والی تقریب سے نہیں لوٹے تھے۔ اگر وہ کیبن میں ہوتے بھی تو میرے لئے ان کی موجودگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں کچھ وقت تازہ ہوا میں گزارنا چاہتا تھا۔

"عرشہ خالی تھا اور جہاز کے تمام مسافر ہال میں بیٹھے تھے۔ آسمان ابر آلود تھا۔ ہوا کے تیور بھی کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ تند موجیں جہاز کو اچھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس وقت اچھی خاصی خنکی ہو گئی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ فوراً واپس لوٹ جاؤں لیکن کیبن کی گھٹن سے یہ کھلی فضا بدرجہا بہتر تھی۔ میں چند لمحے ایک جگہ کھڑا رہا پھر ٹہلنے کے انداز میں ایک طرف کو چلنے لگا۔ اور پھر وہ واقعہ پیش آیا جس پر مجھے ابھی تک یقین نہیں آ سکا۔"

"میں ریلنگ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا جہاز کے پچھلے حصے میں پہنچ گیا اور واپس مڑنا ہی چاہتا تھا کہ یکایک ٹھٹک گیا۔ مجھے بڑی شدت سے احساس ہونے لگا کہ میں وہاں اکیلا نہیں ہوں۔ ہلکی سی آہٹ سن کر میں تیزی سے آواز کی سمت گھوم گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس دیوقامت ویٹر کو اپنے سامنے دیکھ کر مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ پورے جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ تاریک عرشے پر ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میری چھٹی حس کسی انجانے خطرے کا اعلان کرنے لگی اگر کوئی اور شخص ہوتا تو ممکن ہے میں اس سے بھڑ جاتا لیکن اس دیوقامت کا مقابلہ کرنے کی میرے اندر سکت نہیں تھی۔ گزشتہ دس روز کے سفر کے دوران وہ اپنے نفسیاتی حربوں سے مجھے اس قدر کمزور کر چکا تھا کہ اب میرے اندر اس سے نظریں ملانے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔"

"وہ مجھ سے تقریباً دس قدم کے فاصلے پر تھا۔ تاریکی ہونے کے باوجود اس کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے جیسے ہی میری طرف قدم بڑھایا' میں نے دوڑ لگا دی۔ لیکن اسی لمحے کسی طاقتور لہر نے جہاز کو اچھال دیا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور چکنے فرش پر لڑھکتا ہوا

ٹھیک اس کے قدموں میں جارکا۔ میری اس وقت کی حالت کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ بچپن میں ایک مرتبہ میں نے ایک بلی کو چوہا پکڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس واقعے کو اگرچہ چالیس سال گزر چکے ہیں لیکن بلی کے پنجے میں آنے کے بعد چوہے کے منہ سے جو آواز نکلی تھی وہ اب بھی میرے ذہن میں گونج رہی ہے۔ بہرحال اس وقت میری حالت اس چوہے سے مختلف نہیں تھی جو بلی کے پنجے میں پھنس چکا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو کبھی ہیرو ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بچپن اور لڑکپن میں بھی میں ہنگاموں سے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ دنگا فساد میری فطرت میں کبھی شامل نہیں رہا۔"

"میرا خیال تھا کہ وہ مجھے اٹھا کر بپھرے ہوئے سمندر میں پھینک دے گا۔ لیکن اس نے جیسے ہی مجھے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا میرے اندر نجانے اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ میں نے اچانک ہی اس کے جبڑے پر گھونسا جڑ دیا۔ اس نے بھی مجھے جوابی گھونسا رسید کر دیا اور میں لڑکھڑاتا ہوا کئی قدم دور جا گرا۔ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی اس نے مجھے چھاپ لیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت تھی کہ میں اس دیو کا مقابلہ کس طرح کر رہا ہوں۔ اس کے منہ سے ہلکی ہلکی غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ لیکن میرے منہ سے کوئی آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں مدد کے لئے چیختا بھی تو کسی تک میری آواز نہ پہنچ پاتی۔ پہلی بات تو یہ کہ ان لوگوں نے خود ہی ایک ہنگامہ مچا رکھا تھا پھر سمندر کی بپھری ہوئی لہریں تھیں جن سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔"

"لہروں نے اب طوفانی صورت اختیار کر لی تھی۔ جہاز کبھی دائیں طرف جھکتا کبھی بائیں طرف۔ ایک موقع پر میرا پیر پھسلا اور میں تیزی سے کنارے کی طرف لڑھکنے لگا۔ قریب تھا کہ میں سمندر میں جا گرتا کہ اچانک ہی عرشے میں گڑا ہوا ایک ہک میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میرے سنبھلتے سنبھلتے دیو قامت ویٹر نے دوبارہ مجھے دبوچ لیا۔ مجھے یاد نہیں کہ ہماری یہ دھینگا مشتی کتنی دیر تک جاری رہی۔ پانچ منٹ' دس منٹ یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں نے مایوس ہو کر ہمت نہیں ہاری تھی۔ میں موت سے پنجہ آزما تھا اور مجھے لڑنا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ میری ہمت بڑھتی جا رہی تھی میں اب اس پر حاوی ہو رہا تھا' لیکن دفعتاً اس کے فولادی گھونسے کی ضرب میری کنپٹی پر لگی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آنکھوں کے سامنے سیکڑوں سورج بیک وقت طلوع ہو رہے ہوں۔ میں لڑکھڑاتا ہوا ریلنگ سے جا ٹکرایا۔ اس لمحے اس دیوزاد نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی لیکن اسے گرفت جمانے کا موقع دیئے بغیر میں نے اپنی تمام تر قوت مجتمع کر کے اسے پوری قوت سے اچھال دیا۔ وہ دھپ کی آواز سے کہیں گرا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہو گا لیکن کئی سیکنڈ گزر گئے۔ اس کی طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہیں ہوئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اسی لمحے وہ شخص مجھے لڑھکتا ہوا سمندر میں گرتا ہوا دکھائی دیا۔"

"میری ٹانگوں میں اب جسم کا بوجھ سہارنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ میں عرشے پر گر گیا اور صبح تک وہیں پڑا رہا۔ یہ بھی ایک معجزہ ہی تھا کہ مجھے نمونیہ نہیں ہوا۔ میں نہ تو نیند میں تھا نہ پوری طرح جاگ رہا تھا۔ بس عالم رویا کی سی کیفیت تھی۔ صبح صادق کے وقت بارش شروع ہو گئی۔ یہ بارش ہی مجھے حقیقت کی دنیا میں لے آئی اور میں اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا اپنے کیبن میں پہنچ گیا۔ یونانی اور دونوں ہمشکل اطالوی اپنے اپنے بستروں پر گہری نیند سو رہے تھے۔ میں بڑی مشکل سے اپنے برتھ پر چڑھ کر گر سا گیا۔ میرا جسم شل ہو رہا تھا۔ ریشہ ریشہ دکھ رہا تھا۔ بستر پر گرتے ہی گہری نیند سو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو کیبن خالی تھا اور اس وقت دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔"

''بہت خوب! شکین کے خاموش ہونے پر ایوان نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔''تو گویا تمہارا مقابلہ کسی مافوق الفطرت قوت سے تھا۔''

''کیا؟''شکین نے مجھے گھورا۔''مجھے یقین تھا کہ تم اس قسم کی بات ضرور کرو گے۔ لیکن میری کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی!''

''تو ابھی کچھ اور بھی باقی ہے؟''ایوان نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں!''شکین کہنے لگا۔''جب میں سو کر اٹھا تو اپنے آپ میں بے حد کمزوری محسوس کر رہا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح ڈائننگ روم میں پہنچ گیا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ گزشتہ رات والے واقعے کی کوئی حقیقت بھی تھی یا یہ سب کچھ محض ایک بھیانک خواب تھا۔ کیونکہ مجھ جیسا کمزور و ناتواں شخص اس جیسے دیو قامت شخص کو اٹھا کر پھینکنا تو درکنار اسے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس وقت دوپہر کا کھانا ہو رہا تھا۔ میں اپنی مخصوص میز پر بیٹھ گیا۔ ابھی میں ٹھیک طرح سے کرسی سنبھال بھی نہیں سکا تھا کہ ویٹر پہنچ گیا۔ یہ وہ ویٹر نہیں تھا۔ جہاز کے ریستوران کی مخصوص یونیفارم میں ملبوس یہ ویٹر میری طرح پستہ قامت اور ناتواں سے جسم کا مالک تھا اور ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ بھی تھی۔ اس نے مینو کارڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے نہایت شائستہ لہجے میں دریافت کیا کہ میں اس وقت کیا کھانا پسند کروں گا۔''

''میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی اور جرمن زبان میں دیو قامت ویٹر کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ لیکن وہ ہسپانوی کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے اشاروں میں اپنا مطلب واضح کرنے کی کوشش کی مگر اس طرح بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ بالآخر میں نے ان چیزوں کا آرڈر دے دیا جو میں اس وقت کھانا چاہتا تھا۔ میرے آرڈر کی تعمیل میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ اس طویل سفر کے دوران میں نے پہلی مرتبہ پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد وہی ویٹر مجھے سرو کرتا رہا۔ اس دوران موقع پا کر۔۔۔۔۔۔ میں نے ایک اور ویٹر سے اس دیو قامت ویٹر کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ چند لمحے تو حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس نے بتایا کہ اس قد و قامت اور حلیے کا کوئی ویٹر اس جہاز پر کام نہیں کرتا۔ اس ویٹر نے ایک اور دلچسپ انکشاف یہ کیا کہ سفر کے دوران دس دن تک تو میں اپنے کیبن سے باہر ہی نہیں نکلا تھا۔ میری فرمائش پر کھانا وغیرہ کیبن ہی میں پہنچایا جاتا رہا تھا۔''

''کمال ہو گیا!''شکین کے خاموش ہونے پر ایوان چونک گیا۔''کیا تم نے کسی اور سے بھی ویٹر کے اس بیان کی تصدیق کی تھی؟''

''ہاں! میں نے پھر اپنے بارے میں باقاعدہ تفتیش شروع کر دی۔ میں نے بہت سے لوگوں سے دریافت کیا۔ ہر شخص کا ایک ہی بیان تھا کہ سفر کے پہلے دس دن تک تو میں نے اپنے کیبن سے قدم تک باہر نہیں نکالا تھا۔ میرے کیبن میں میرے یونانی ساتھی اور دونوں ہمشکل اطالویوں نے بھی اس کی تصدیق کر دی کہ میں ہر وقت اپنے کیبن میں پورٹ ہول کے سامنے بیٹھا سمندر کی لہروں کو گھورتا رہتا تھا۔''

''یہ واقعی بڑی عجیب بات ہے!''ایوان نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔''کیا جہاز کے مسافروں میں اس حلیے کا کوئی شخص نظر نہیں آیا؟''

''میں نے بندرگاہ پر اسی قد و قامت کے ایک آدمی کو جہاز سے اترتے ہوئے دیکھا تو تھا مگر اس کا چہرہ نظر نہیں آ سکا تھا۔'' شکین نے

جواب دیا۔

"جہاز بندرگاہ پر کب لنگر انداز ہوا تھا؟"

"آج سہ پہر! ہوٹل میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں تمہاری تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا!"

"قیام کہاں ہے! میرا مطلب ہے کس ہوٹل میں ٹھہرے ہو؟" ایوان نے دریافت کیا۔

"گرینڈ ہوٹل کمرہ نمبر اڑتیس! یہ ہوٹل تھرڈ ایوینیو کی ایک بغلی گلی میں واقع ہے مگر میرے قیام کا اس واقعے سے کیا تعلق؟" شکین بولا۔

"کچھ نہیں بولا!" ایوان نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔"اس وقت رات کے دس بجے ہیں۔ میں فی الحال اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے یہ سب کچھ تمہارا ذہنی فتور ہو بہرحال صبح پہلی فرصت میں تم سے ملوں گا۔ اس وقت ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا ہے۔"

شکین الجھی ہوئی نگاہوں سے ایوان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے ویٹرس کو بلا کر کافی کا بل ادا کیا اور ہوٹل سے باہر آ کر اسے خدا حافظ کہتا ہوا تیز تیز قدموں سے ایک طرف کو چل دیا۔

شکین کی اس کہانی نے ایوان کے ذہن کو بری طرح الجھا رکھا تھا۔ وہ بحری سفر کے دوران دس دن تک ایک ایسے شخص کا سامنا کرتا رہا جو اسے نت نئے طریقوں سے ذہنی اذیت پہنچاتا رہا اور آخری روز وہ دونوں ایک دوسرے سے دست و گریباں بھی ہوئے جبکہ جہاز کے مسافروں کا بیان تھا کہ شکین دس روز تک اپنے کیبن سے باہر ہی نہیں نکلا تھا۔ ظاہر ہے جہاز کے تمام مسافروں کو شکین سے کوئی دشمنی نہیں ہو سکتی تھی جو اس کا بیان جھٹلانے کی کوشش کرتے۔ دوسری طرف شکین بھی ایسا شخص نہیں تھا جس کے بارے میں یہ سمجھ لیا جاتا کہ اس نے محض مذاق کے طور پر یہ کہانی گھڑی ہو گی۔ صرف یہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ یہ سب کچھ شکین کے ذہنی فتور کا نتیجہ تھا۔ ممکن ہے وہ سفر کے دوران طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے اپنے کیبن سے باہر نہ نکلا ہو اور اس دوران اس کا ذہن اسے وہ تماشے دکھاتا رہا جسے وہ حقیقت سمجھ بیٹھا۔

ایون نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اس نے شیلف میں سے ایک کتاب نکالی اور تقریباً نصف گھنٹے تک اس کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کتاب سے اسے شکین کی صورتحال کو سمجھنے میں کچھ مدد ملے گی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ ہاتھ نہ آ سکا۔

اچانک اس کے ذہن میں ہنٹ کا خیال ابھرا۔ وہ پراسرار علوم کا ماہر تھا۔ ممکن ہے وہ اس کی کوئی توجیہ کر سکے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور ہنٹ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ غالباً جاگ رہا تھا اور فون سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ کیونکہ دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔" ہیلو ہنٹ! تم زیادہ مصروف تو نہیں۔ ایک مسئلے پر بات کرنی ہے!"

"یقیناً کوئی بہت اہم مسئلہ ہو گا ایون! ورنہ تم اس وقت فون نہ کرتے۔ کہو کیا معاملہ ہے؟" ہنٹ کی آواز سنائی دی۔

ایوان نے تفصیل سے اسے شکین کی کہانی سنائی۔ اس کے خاموش ہونے پر ہنٹ بھی چند لمحے خاموش رہا۔ پھر ریسیور پر اس کی آواز ابھری۔"بہتر ہو گا کہ تم فوراً یہاں چلے آؤ۔ میرے خیال میں تمہارا دوست نادانستہ طور پر کسی معاملے میں الجھ چکا ہے جو اس کے لئے جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

مزید کچھ سنے بغیر ایوان نے ریسیور پٹخا اور باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس وقت ایک بجکر بیس منٹ ہو چکے تھے۔

شکین کا چہرہ خوف کی شدت سے اس طرح سفید ہو رہا تھا جیسے جسم کا سارا خون نچڑ چکا ہو۔ اس کے ہاتھ اور پیر پلنگ کی پٹیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا جس کی وجہ سے اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا وہ خوفزدہ نگاہوں سے اس دیو قامت شخص کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس کے چرمی سفری بیگ کے ٹانکے ادھیڑ رہا تھا۔ بیگ میں بھری ہوئی چیزیں اس نے فرش پر پھینک دی تھیں۔

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ شکین اپنے کمرے میں آتے ہی سو گیا تھا۔ یہ کمرہ گراؤنڈ فلور پر تھا جس کا ایک دروازہ عقبی گلی میں بھی کھلتا تھا۔ سونے سے پہلے اس نے دونوں دروازے سے مقفل کئے تھے لیکن تین بجے کے قریب ہلکی سی آہٹ سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ نائٹ بلب کی روشنی میں اسے وہی دیو قامت ویٹر دکھائی دیا جو بحری جہاز میں اس کا سفر شریک رہا تھا۔ اس نے چیخنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ویٹر نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے شکنجے میں جکڑ لیا اور پھر اسے مکمل طور پر بے بس کر دیا۔

ویٹر کو اس کے کمرے میں آئے ہوئے تقریباً پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ دفعتاً راہداری کی طرف والا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا۔ ویٹر نے بھی اس شخص کو دیکھ لیا اور عقبی گلی میں کھلنے والے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی لیکن وہ ابھی دو قدم دور ہی تھا کہ وہ دروازہ بھی کھلا اور اس طرف سے ایک اور شخص اندر داخل ہوا جس نے بلا تکلف ہاتھ میں پکڑی ہوئی آہنی سلاخ ویٹر کے سر پر دے ماری۔ وہ کراہتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دونوں نوواردوں نے ویٹر کے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ ان میں سے ایک نے بتی جلا دی۔ تیز روشنی ہوتے ہی شکین چونک گیا۔ ان میں ایک تو ایوان تھا اور دوسرا اس کے لیے اجنبی۔ ایوان نے جلدی سے آگے بڑھ کر شکین کے منہ سے کپڑا نکال کر اس کے ہاتھ پیر کھول دیے۔

"بہت اچھے وقت پر پہنچے ورنہ یہ کم بخت تو شاید مجھے قتل ہی کر دیتا۔" شکین نے کہا پھر یکدم بدحواس سا ہو گیا۔ "یہ...... یہ ویٹر......"

"جہاز پر اس کا وجود سو فیصد تمہارے ذہن کی پیداوار تھا لیکن اس وقت یہ مجسم ہے یعنی حقیقی انسان۔" ایوان اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"کیا مطلب؟" شکین نے اسے گھورا۔ "یعنی تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ واقعی میرا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ اور یہ صاحب کون ہیں؟" وہ دوسرے آدمی کی طرف دیکھنے لگا جو ادھڑے ہوئے سفری بیگ میں جھانک رہا تھا۔

"یہ مسٹر ہنٹ ہیں، میرے دوست!" ایوان نے تعارف کرایا۔ "انہی کی بدولت تم اس وقت اس دیوزاد کے شکنجے سے نجات حاصل کر سکے ہو۔ ورنہ دماغ خراب ہونے والی بات تو کیا وہ ویٹر شاید تمہیں قتل ہی کر ڈالتا۔"

"اب میرا دماغ شاید واقعی خراب ہو جائے۔" شکین نے بے بسی کا مظاہرہ کیا۔ "یہ شخص دس دن تک جہاز میں مجھ پر کسی عذاب کی طرح مسلط رہا۔ لوگوں نے میرا مذاق اڑایا اور کہا کہ میں دس دن تک اپنے کیبن میں بند رہا۔ اسے میرا ذہنی فتور قرار دیا گیا اور اب حقیقی انسان کے روپ میں یہاں موجود ہے اور بقول تمہارے مجھے قتل بھی کر سکتا تھا۔ یہ سب کیا ہے؟ میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکا۔"

"دیکھو شکین!" ایوان اسے سمجھانے والے لہجے میں بولا۔ "بعض پراسرار علوم ایسے ہوتے ہیں جنہیں عام آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ ٹیلی پیتھی اور غیب دانی بھی ایسے ہی علوم ہیں اس موضوع پر میں جب بھی بات کرتا تم میرا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ لیکن بحری سفر کے دوران دس دن تک تم جس

ذہنی اذیت کا شکار رہے وہ ٹیلی پیتھی کا کمال تھا۔ یہ ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے عامل کسی بھی شخص کے دماغ پر قابض ہو سکتا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات اور اس کے خیالات پھر اس عامل کے تابع ہوتے ہیں' معمول وہی سوچے گا جو عامل چاہے گا۔ جہاز کے مسافروں کا یہ بیان درست ہے کہ سفر کے دوران پہلے دس دن تم اپنے کیبن میں بند رہے تھے۔ اور اس دوران تمہیں جو واقعات پیش آتے رہے' وہ بھی اپنی جگہ درست ہیں۔"

"یا تو تمہارا دماغ چل گیا ہے یا مجھے بیوقوف ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔" شیکن نے اسے گھورا۔

"میں تمہیں سمجھاتا ہوں!" ایوان مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ شخص بہت بڑا اسمگلر اور ٹیلی پیتھی کا ماہر ہے۔" اس نے بے ہوش ویٹر کی طرف اشارہ کیا۔ "اس سے پہلے اس نے اپنے علم کی بہت چھوٹی چھوٹی آزمائشیں کی تھیں جن میں بلاشبہ یہ کامیاب رہا پھر ایک بڑے مقصد کے لیے اس نے تم پر اپنا علم آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے کسی طرح علم ہو گیا تھا کہ تم نیویارک جانے والے ہو۔ اس نے کسی کے توسط سے یہ چرمی سفری بیگ کسی نہ کسی طرح سستے داموں تمہارے ہاتھ فروخت کرا دیا۔ ایک اچھی چیز برائے نام قیمت پر ہاتھ آتے دیکھ کر تم لالچ میں آ گئے۔ بہرحال' تم جیسے ہی جہاز پر سوار ہوئے اس نے ٹیلی پیتھی کے ذریعے تمہارے دماغ پر قبضہ کر لیا۔ یہ حقیقت ہے کہ جہاز پر سوار ہوتے ہی تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تھی اور تم مستقل طور پر اپنے کیبن میں بند رہے جبکہ یہ اپنی ذہنی طاقت کے ذریعے تمہیں ذہنی طور پر وہ تماشے دکھاتا رہا جنہیں تم سچ سمجھتے رہے۔ جہاز پر سوار ہونے کے بعد تمہاری طبیعت خراب کرنے میں بھی اسی کا ہاتھ تھا۔ اس نے تمہارے دماغ میں یہ بات بٹھائی تھی کہ تم بیمار ہو۔ اور تمہیں کیبن سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ تم جہاز کے دیگر مسافروں سے الگ تھلگ رہو تا کہ کسی سے برائے نام قیمت پر ملنے والے اس بیگ کا تذکرہ نہ کر سکو۔ ظاہر ہے لوگ اس بیگ کو دیکھنے کی خواہش کرتے اور اس طرح بات آگے بڑھ جاتی بہرحال' سفر کے دسویں دن تم سے اس کا دماغی رابطہ ٹوٹ گیا اور کوشش کے باوجود یہ تم سے دوبارہ رابطہ قائم نہ کر سکا۔ یہ تم سے ایک دن پہلے ہوائی جہاز کے ذریعے یہاں پہنچ گیا تھا تا کہ وہ بیگ وصول کر سکے!"

"لیکن! جب اسے خود یہاں آنا تھا تو بیگ اس پیچیدہ طریقے سے میرے ذریعے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟" شیکن نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم ڈپلومیٹک پاسپورٹ پر سفر کرتے ہو اور کسٹم والے تمہارے سامان کی تلاشی نہیں لیتے۔ جبکہ یہ ایک بدنام اسمگلر ہے اور اس کے جسم کے اندر تک جھانکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"

"تو کیا بیگ میں کوئی غیر قانونی چیز موجود ہے؟"

"ہیروئن! جس کے پکڑے جانے پر تمہیں عمر قید تک کی سزا ہو سکتی ہے۔" ایوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شیکن کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ "تت..... تمہیں...... یہ سب کچھ کیسے پتہ چلا؟" وہ ہکلایا۔

"مسٹر ہنٹ ٹیلی پیتھی کے علم میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔" ایون نے ہنٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہیں رخصت کرنے کے بعد میں نے ان سے رابطہ قائم کر کے تمہاری کہانی سنائی تو یہ خیال انہی کے ذہن میں آیا کہ تمہیں ٹیلی پیتھی کے ذریعے آلۂ کار بنایا گیا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ شخص تم سے دوبارہ دماغی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ اس تاک میں رہے اور پھر اس نے جیسے ہی تم سے ذہنی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی یہ



اس کے دماغ میں پہنچ گئے اور ساری باتیں اس سے معلوم کر لیں۔ مسٹر ہنٹ نے اس سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ یہ ٹھیک تین بجے بیگ لینے کے لئے یہاں پہنچے گا۔ چنانچہ اس طرح ہم بھی یہاں پہنچ گئے۔ اب مسٹر ہنٹ نے اس کے ذہن کو اس طرح الجھا دیا ہے کہ یہ آئندہ اس علم سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

"کک...... کیا یہ سچ ہے مسٹر ہنٹ!" شکین نے سوالیہ نگاہوں سے ہنٹ کی طرف دیکھا۔

ہنٹ نے کہا:

"ہاں مگر تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ پولیس کچھ دیر میں پہنچ جائے گی۔ مجھے افسوس ہے کہ تم اپنے بیگ سے محروم ہو جاؤ گے۔"

"علاوہ ازیں یقین واثق ہے کہ آئندہ تم کوئی اچھی شے سستے داموں خریدنے کی غلطی نہیں کرو گے۔" ایوان نے شکین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"سچ کہتے ہو! مگر تم جانتے ہو ہم یہودی جہاں دو سینٹ کا بھی فائدہ دیکھیں ہماری رال ٹپکنے لگتی ہے!" شکین نے بے بسی سے کندھے اچکائے۔

شکین کی صاف گوئی پر دونوں مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ اسی لمحے راہداری میں بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی تو دونوں کی توجہ اس جانب مبذول ہو گئی۔

☆......☆......☆

چارہ گر

نجیب محفوظ (۱۹۱۱ء۔۲۰۰۶ء) سرزمین مصر کے شہرہ آفاق نوبل انعام یافتہ ادیب۔ آپ ۱۹۱۱ء میں قاہرہ کے مضافاتی علاقے میں تولد ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں قاہرہ یونیورسٹی سے فلسفے میں گریجوایشن کی۔ زمانہ طالب علمی ہی میں قلم سے رشتہ اُستوار کر لیا تھا' تاہم ان کی مختصر کہانیوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا جس سے ادبی اور عوامی حلقوں میں بطور افسانہ نگار انہیں پذیرائی ملی۔ بعد ازاں ان کی طویل و مختصر کہانیوں کے کئی مجموعے منظر عام پر آئے اور ہر نئی رونمائی کے ساتھ ان کی شہرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ نجیب محفوظ نے افسانے کے میدان ہی میں طبع آزمائی نہیں کی بلکہ نصف درجن سے زائد ناول بھی تصنیف کیے۔ عالمی سطح پر ان کی شہرت کا سبب ان کے ناولوں ہی کو گردانا جاتا ہے۔ ان ناولوں پر اسٹیج' ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ڈراموں کے علاوہ فلمیں بھی بنائی گئیں۔ قابل ذکر فلموں میں ہالی وڈ کی فلم "اے بگنگ اینڈ این انڈ" بھی شامل ہے جس میں عمر شریف نے لازوال اداکاری کی تھی۔ یہ فلم ان کے ناول "بدایہ ونہایہ" پر مبنی ہے۔ نجیب نے بہت لکھا اور ہر موضوع پر لکھا' تاہم معاشرے میں بسنے والے مختلف طبقوں کی نفسیات اور ان کے رویے ان کا پسندیدہ موضوع ہیں۔ زیر نظر کہانی ان کے اسی مرغوب موضوع کی عکاس ہے۔ اسے ان کی طویل و مختصر کہانیوں کے مجموعے "دنیاء اللہ" (خدا کی دنیا) سے منتخب کیا گیا ہے جو ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ ان کی عظیم ادبی تخلیقات نے انہیں ۱۹۸۸ء میں نوبل انعام یافتہ مصنفین کی صف میں جگہ دلوائی اور سب سے بڑھ کر شائقین ادب کے دلوں میں انہیں دنیا بھر کے مرغوب و مطلوب ادیب ہونے کا اعزاز ہمیشہ حاصل رہے گا۔

☆......☆......☆

وہ اپنے بستر میں بے سدھ پڑی تھی۔ ایک ہاتھ اور آنکھوں کے سوا اس کا سارا جسم مفلوج تھا۔ ہاتھ کو بھی وہ محض سینے تک حرکت دے سکتی تھی۔ بیماری نے اس کی ساری طاقت گویا سلب کر لی تھی۔

اس کا گوشت سوکھ گیا تھا۔ نیلاہٹ کی طرف مائل زرد کھال ہڈیوں پر منڈھی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بستر پر آنکھیں موندے لیٹی رہتی یا کسی نامعلوم نقطے کو گھورتی رہتی۔ اس کی بینائی کمرے کی دیواروں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ "عدلیہ!" عیون نے بچوں جیسی کمزور اور باریک آواز میں اسے پکارا مگر اس نے نہیں سنا۔ کم از کم وہ ظاہر یہی کرے گی کہ اسے سنائی نہیں دیا۔ بہانہ یہ ہوگا کہ عیون کی آواز بہت آہستہ تھی' یا باورچی خانہ بہت دور ہے' یا وہاں چولہے کا شور تھا۔ عیون اپنی آواز کو نہ تو اس سے زیادہ بلند کر سکتی تھی' نہ ہی پکارے بنا رہ سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے پھر آواز دی۔ "عدلیہ!"

عدلیہ کو برا بھلا کہتے ہوئے خانم عیون کو خوف آتا تھا۔ وہ مکمل طور پر عدلیہ کے رحم و کرم پر تھی' اور اسے راضی رکھنے کے لئے کسی بھی حد تک جاسکتی تھی۔ وہ اسے معقول تنخواہ دیتی تھی' عمدہ کپڑے اور کھانا دیتی تھی۔ اس کا گھر عدلیہ ہی سنبھالتی تھی' اب تو وہ گھر کی حقیقی مالک بن بیٹھی تھی۔ عیون اس بارے میں کر ہی کیا سکتی تھی! اگر کسی روز عدلیہ اس کی ملازمت چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتی تو عیون ناقابل برداشت تنہائی کا شکار ہو کر موت کے منہ میں پہنچ جاتی۔ وہ پوری کوشش کرتی کہ انتہائی ضرورت کے علاوہ عدلیہ کو تکلیف نہ دے' لیکن اس کے بس میں کیا تھا! زندگی کی ضرورتیں تو سانس کی ڈوری کے ساتھ بندھی ہیں۔

اس نے اپنی دم توڑتی طاقت جمع کر کے ایک بار پھر پکارا "عدلیہ!"

غصہ اس کے ہڈیوں بھرے سینے میں ابلنے لگا' مگر اس نے اپنا ہیجان قابو میں رکھا۔ آخر عدلیہ کو کام بھی تو بہت کرنا پڑتا ہے۔ صفائی کرنا' کھانا پکانا' سودا سلف لانا' عیون کے لئے سبھی کچھ عدلیہ تھی۔ وہ اسے کھانے پینے میں مدد دیتی' اس کا منہ دھلاتی' اسے نہلاتی' دوبارہ بستر پر لٹاتی اور اسے کروٹ بدلواتی۔ اس نے اپنی شکایت آمیز مگر حسرت ناک آواز ذرا سی بلند کی "عدلیہ!"

عدلیہ دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کے بے حس چہرے پر ناگواری کی ایک مستقل چھاپ تھی۔ اس نے ذرا تیکھے لہجے میں پوچھا "مجھے بلایا خانم؟"

"آوازیں دے دے کر میرا گلا بیٹھ گیا عدلیہ!"

عدلیہ بستر کی طرف بڑھی تو عیون نے کہا "مجھے ایک سگریٹ دے دو۔"

عدلیہ نے بستر کے سرہانے رکھی میز پر سے سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی' ایک سگریٹ نکال کے سلگایا' اور خانم کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولی "آپ جانتی ہیں کہ سگریٹ پینا آپ کے لئے اچھا نہیں ہے۔" یہ کہہ کے وہ کمرے سے نکل گئی۔

عدلیہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونا عیون کے لئے سزائے موت کے مترادف ہوتا۔ اس کے بھانجے بھانجیوں کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ کسی کی توجہ یا خبر گیری سے محروم عیون خوف اور مایوسی کے عالم میں زندگی کی گاڑی کھینچ رہی تھی اور موت کی آرزومند تھی۔ اس کا اکلوتا بیٹا ایک خوں ریز مظاہرے میں مارا گیا تھا۔ اس صدمے نے اسے جیتے جی مار ڈالا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس کی اکلوتی اولاد سیاست کی بھینٹ چڑھ گئی تھی' مگر اسے سیاست سے کوئی دلچسپی تھی نہ اس کی سمجھ۔ بیٹے کی ہلاکت کے ایک سال بعد اس کا شوہر بھی چل بسا تھا۔ یہ دکھ بھری یادیں اس کی بیماری کی اذیت اور تنہائی کے ہولناک سایوں میں گھل مل گئی تھیں۔

اس کی مرحومہ بہن کی بیٹی بشینہ' پچھلی عید پر اس سے ملنے آئی تھی۔ وہ ایک پرائمری اسکول کی پرنسپل تھی' اور صرف وہی تھی جسے تہواروں کے موقع پر عیون کی یاد آ جاتی۔ وہ اپنے ساتھ ایک گلدستہ اور مٹھائی کا ڈبا لے کر آئی تھی اور یہیں اس کے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھی تھی۔ عیون کی آنکھیں بھر آئیں۔ "شکریہ بشینہ! تم کیسی ہو؟ سب لوگ کیسے ہیں؟ تم سب کو دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے' مگر مجھے پوچھتا ہی کون ہے!"

بشینہ معذرت خواہانہ انداز میں مسکرائی۔ "زندگی آج کل بہت مصروف ہو گئی ہے خالہ!"

"تم لوگوں کے سوا میرا کون ہے؟ آخر مردوں کو بھی کوئی نہ کوئی یاد رکھتا ہے!"

"خالہ! مجھے اکثر تمہارا خیال آتا ہے' مگر کیا کروں' فرصت ہی نہیں ملتی۔"

"سب لوگ مجھے بھول گئے ہیں بشینہ!"

بشینہ نے بالآخر خاموشی میں پناہ لی۔ عیون نے کہا" میں آخر تم لوگوں کی خالہ ہوں۔ تمہاری ماں کی واحد بہن' جو زندہ رہ گئی ہوں۔ اگر عدلیہ مجھے چھوڑ جائے تو میں یہیں پڑی پڑی بھوک مر جاؤں!"

اس نے آہ بھری اور بولتی رہی" ہم تینوں بہنیں' تمہاری ماں' بڑی خالہ اور میں کتنی مسرور رہا کرتی تھیں۔ خدا ان دونوں پر اپنی رحمت کرے۔ میں ان دونوں سے چھوٹی تھی۔ میری خوشیوں کی تو کوئی حد ہی نہیں تھی۔"

"خدا کرے' تم جلد صحت یاب ہو جاؤ خالہ!"

"تمہاری دعا قبول نہیں ہوگی بشینہ! میں اکیلی رہ گئی ہوں' مجھے سب نے چھوڑ دیا ہے۔ میری پنشن بھی پڑوسی لا کے دیتا ہے۔" اس نے اپنے نیلے پڑتے نحیف ہاتھ سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔" میں بہت خوف زدہ ہوں بشینہ! مجھے اس دن سے خوف آتا ہے' جب عدلیہ مجھے چھوڑ کے چلی جائے گی۔"

"ایسا نہیں ہوگا خالہ۔ اسے اس جیسا گھر اور کہاں ملے گا؟"

"اسے میرا بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ مجھے اس کی طرف سے فکر لگی رہتی ہے۔"

"تمہارا پورا گھر اور جمع پونجی اس کے قبضے میں ہیں۔ بھلا وہ تمہیں چھوڑ کے کیوں جائے گی؟"

"پھر بھی مجھے ڈر لگتا ہے۔ ہر وقت شک گھیرے رہتا ہے۔ میں اس کی موجودگی سے بھی اتنی ہی خوف زدہ ہوں' جتنی اس کے چلے جانے سے۔"

بشینہ چپ ہوگئی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا' یا وہ گھسے پٹے جملے دہراتے رہنے سے اکتا گئی تھی۔ عیون نے کہا" مجھے معاف کرو بشینہ! میرے پاس باتیں ختم ہوگئی ہیں۔ پھر یہ بھی تو اچھی بات نہیں کہ میں تمہیں پریشان کیے جاؤں۔ آخر تمہی تو ہو' جسے میرا خیال رہتا ہے۔"

اس نے اپنا شکایت آمیز انداز ترک کر دیا' اور اپنائیت سے پوچھنے لگی" اب تم سناؤ' تمہاری اپنے شوہر سے کیسی نبھ رہی ہے؟"

بشینہ نے گہری سانس لے کے مختصر سا جواب دیا۔" بس' ٹھیک ہی ہے۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ تم تو اتنی بے مثال لڑکی ہو۔"

عیون کے خشک اور غم ناک ہونٹوں پر تھکی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔" تم اتنی خوبصورت ہو بشینہ! لوگ کہتے ہیں' تم ایسی ہو جیسی میں اپنی جوانی میں تھی۔ تم پورے خاندان میں سب سے زیادہ میری ہم شکل ہو۔"

بشینہ نے اثبات میں سر ہلایا اور مسکرا دی۔

"میں جب گلی میں نکلتی' یا دریچے میں کھڑی ہوتی تھی تو ساری آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو جاتی تھیں۔"

بشینہ ہنسی اور عیون کی طرف دردمندی سے دیکھنے لگی۔

"تم کہتی ہو کہ شوہر سے تمہارے تعلقات بس ٹھیک ہی ہیں۔ کیا اسے احساس نہیں کہ خدا نے اسے کتنی بڑی نعمت سے نوازا ہے؟"

"دنیا کا یہی دستور ہے خالہ!"

"لعنت ہو ایسی دنیا پر!"

"دنیا کا کیا بھروسا ہے خالہ!"

عدلیہ کھانے کے برتن اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے عیون کو اٹھا کے تکیے کے سہارے بٹھا دیا' اور اسے کھانا کھلانے لگی۔

اس کا دل جیتنے کی کوشش میں عیون نے کہا" کھانا بہت اچھا پکا ہے عدلیہ!"

عدلیہ مسکرائی نہ اس کا شکریہ ادا کیا' جیسے اس نے عیون کی بات سنی ہی نہ ہو۔

کمزور اور بے بس آدمی کی تعریف بھی بے اثر ہوتی ہے۔

"کیا ہوا ہے عدلیہ؟"

"میں اپنی بیٹی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

"خدا اسے خوش رکھے۔ کیا ہوا ہے؟"

"وہ اپنے مرد کے ہاتھوں بڑی مصیبت میں ہے۔"

"کیوں؟ آخر وہ سات بچوں کی ماں سے ایسا سلوک کیسے کرسکتا ہے؟"

"آپ اسے نہیں جانتیں خانم!"

"تم اپنی بیٹی کو سمجھاؤ۔ اسے کہو کہ صبر سے کام لے۔"

"اگر اسے طلاق ہوگئی تو پھر کیا ہوگا؟"

ہاں واقعی' پھر کیا ہوگا؟ اگر عدلیہ اپنی بیٹی اور اس کی اولاد کو اس گھر میں لے آئی تو؟ عیون اس پر اعتراض بھی کیسے کرتی۔ وہ تو پوری طرح عدلیہ کے رحم و کرم پر تھی۔ اس کا مکان اتنا کشادہ نہیں ہے۔ اس کے پورے خاندان کے آ جانے سے تو بالکل بازار بن کے رہ جائے گا۔ اتنے شور غل اور ہنگامے میں اس کا کیا حشر ہوگا؟ اور پھر ان سب کے کھانے اور کپڑے لتے کا خرچ وہ کیسے برداشت کرے گی؟

یہ عیون کے لیے ایک نئی تشویش تھی۔ شیخ طاہا نے شادی پر اسے دعا دیتے ہوئے کہا تھا" خدا تمہیں عزت دے' اور نصیب اچھے کرے۔" عیون کی ماں کو اس پر کتنا ناز تھا' اور اس کی شادی شدہ زندگی کا آغاز کتنا خوشگوار تھا۔ شوہر ایک معزز خاندان سے تعلق رکھنے والا جج تھا۔ ایک روز اس نے عیون کو "سموگراف سینما" کے باکس میں دیکھ لیا اور اس پر مر مٹا۔ وہ ایک محبوب بیوی اور مسرور ماں تھی۔ اس کے حسن پر نازاں شوہر اس کا ہاتھ تھام کے اسے اوپیرا لے جایا کرتا تھا۔ ایک بار جب کسی پاشا نے عیون سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تو فساد ہوتے ہوتے بچا تھا۔ عیون نے سوچا

'لیکن عیون خانم! تمہاری زندگی کا انجام یہ بسرِ مرگ ہے' جہاں تم اس بے حس اور حقیر عورت کے رحم و کرم پر پڑی ہو جو تمہیں ایک مسکراہٹ تک سے محروم رکھتی ہے۔'

دروازے کی گھنٹی بجی۔ عیون کی آنکھیں امید سے چمک اٹھیں۔ شاید کوئی ملنے آیا ہے۔

''کون ہے عدلیہ؟''

''پلمبر آیا ہے خانم۔''

پھر وہی پلمبر! بدمعاش کسی نہ کسی پائپ کی مرمت کے بہانے روز آ جاتا۔ اس کی مجال نہ تھی کہ وہ عدلیہ سے اس کے بارے میں کوئی سوال کرے۔ اعتراض کی تو گنجائش ہی نہیں تھی۔ جب اس حرافہ کی مرضی ہوتی یا پلمبر کا اپنا دل چاہتا' وہ آ دھمکتا۔

عدلیہ نے عیون کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تا کہ وہ پلمبر کو نہ دیکھ سکے۔ عیون کو بہت دنوں سے اس پر شک تھا' مگر وہ کیا کر سکتی تھی! اس کے گھر میں یہ سب کچھ ہوتا' اس کے کمرے کے دروازے کے پیچھے۔ دروازہ اس کی مرضی کے خلاف بند کر دیا جاتا۔ وہ بے بس اور مجبور تھی۔ اگر اس شخص کو اس سے زیادہ کا لالچ ہوتا' یا وہ اسے اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھنے لگتا' یا کوئی شیطانی خیال اس کے ذہن میں آ جاتا تو عیون کی حفاظت کون کر سکتا تھا؟ وہ کان لگا کے غور سے سننے لگی۔ وہ بے حد مضطرب تھی' اس کا خون کھول رہا تھا۔ شاید اس کے مرحوم بیٹے کو بھی اس بے رحم صورتحال کا سامنا کرتے ہوئے ایسی ہی بے بسی محسوس ہوئی ہو گی' جس نے اسے بھری جوانی میں ہلاک کر ڈالا تھا۔ مگر وہ تو نیم مردہ اور بستر کی قیدی تھی۔

عدلیہ نے دروازہ کھول دیا' اور اسے مطلع کیا۔ ''خانم پلمبر چلا گیا۔''

اس کے ضرورت سے زیادہ وقت لگانے کا ذکر کیے بغیر عیون نے پوچھا' ''کیا کیا اس نے؟''

''باورچی خانے کا پائپ ٹھیک کرتا تھا۔''

عیون نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا' ''لیکن باورچی خانے کا پائپ تو.......!''

عدلیہ تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''بہت بوسیدہ ہو گیا ہے' بار بار مرمت کرانا پڑتا ہے۔''

ہاں اس کی بار بار مرمت کرانی پڑتی ہے۔ چاہے اس کی جگہ نیا پائپ ہی کیوں نہ لگا دیا جائے۔ پلمبر کی آمد و رفت کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ ٹھیک ہے' آیا کرے جب اس کی مرضی ہو' یا جب عدلیہ چاہے۔ اس نے سوچا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس صورتحال کو برداشت کرنا ہو گا کیونکہ عدلیہ نے اس کے ہاتھ پیروں اور آنکھ ناک کی جگہ سنبھال رکھی ہے۔ پھر اس کا کام بھی تو سخت تھکا دینے والا ہے۔

ایک روز دروازے پر ایک اجنبی دستک سنائی دی۔ عدلیہ نے اندر آ کر بتایا' ''خانم! ایک اندھا آدمی آیا ہے' کہتا ہے کہ وہ آپ کا پرانا شناسا ہے......''

اتنے میں باہر سے اجنبی نے پکار کر کہا' ''شیخ طاہا الشریف' خانم عیون!''

یہ آواز! یہ نام! عیون نے اپنی کمزور یادداشت سے مدد چاہی' اس کا دل بے قرار ہوا تھا' یادیں ہوا کے معطر تازہ جھونکوں کی طرح اس سے

سرگوشی کرنے لگیں۔ "اندر آیئے۔" وہ مسرور لہجے میں بولی۔ "شیخ طاہا! عدلیہ! انہیں کمرے میں لے آؤ!"

وہ عدلیہ کے سہارے' چھڑی سے راستہ ٹٹولتا ہوا اس کے بستر کے پاس آیا۔ اس کا عمامہ ڈھیلا ہو کر کھل گیا تھا' اور اس کی بلند پیشانی نمایاں ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں' اور پشت بڑھاپے کے سبب جھک گئی تھی۔ ایک بدرنگ اور بوسیدہ عبا نے اس کا کم زور جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ جب اسے عیون کے سرہانے بٹھا دیا گیا تو عیون اس سے مخاطب ہوئی "یہ رہا میرا ہاتھ شیخ طاہا!" لیکن اسے زور سے مت دبانا' یہ بہت کمزور ہے" اس نے نہایت شفقت اور نرمی سے مصافحہ کیا اور بولا "خدا تمہیں جلد صحت بخشے عیون!"

"خدا کا شکر ہے جس نے پھر تمہاری صورت دکھائی۔ بھلا پچھلی بار ہماری ملاقات کب ہوئی تھی؟"

اس نے اپنا سر تاسف سے ہلایا' اور بولا بہت عرصہ ہو گیا!"

"وہ کتنے اچھے دن تھے شیخ طاہا!"

"خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

"مگر کیسے! میں تو یہاں بستر مرگ پر پڑی ہوں۔ اکیلی اور بے بس!"

بوڑھا انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "خدا رحم کرنے والا ہے۔"

"تمہیں میرا پتا کیسے معلوم ہوا؟"

"میں پرانی حویلی کے چوکی دار سے ملا تھا' اچھا آدم ہے۔"

عیون بجھتی ہوئی آنکھوں سے اس کا جھریوں بھرا اور عمر رسیدہ چہرہ تکتی رہی۔ وہ عسرت اور بدحالی کا نشان بنا بیٹھا رہا۔ ان دنوں وہ کتنا مضبوط اور طاقت ور ہوا کرتا تھا جب وہ پرانی حویلی میں قاری کے طور پر ملازمت کرتا تھا۔ ہر روز فجر کے بعد ان کے گھر آ کر قہوہ پیتا' تلاوت کرتا اور مذہبی مسائل پر عیون کی والدہ کی رہنمائی کرتا۔ اسی نے عیون کی شادی کے روز اسے دعا دیتے ہوئے کہا تھا "خدا تمہیں عزت دے' اور نصیب اچھے کرے۔" ماضی کے دھندلے گوشوں سے ایک مہرباں تعلق یادوں اور آنسوؤں کی لہروں پر گویا امڈا چلا آتا تھا۔

اس نے اپنے پھٹے پرانے جوتے اتار دیے' اور کرسی پر دوزانو بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کرنے لگا۔

جب وہ قہوہ پی چکا' اور کمرے میں وہ دونوں ہی رہ گئے تو عیون نے کہا "میں تنہا رہ گئی ہوں شیخ طاہا!"

اس نے گویا احتجاج کیا "لیکن خدا تمہارے ساتھ ہے خانم عیون!"

"میں ہر وقت فکر مند اور خوفزدہ رہتی ہوں۔"

"خدا پر بھروسہ رکھو خانم عیون!"

"کاش تم مجھے روز ملنے آ سکتے!"

"میں بہت خوشی سے روز آؤں گا۔"

''تمہارے دن کیسے کٹ رہے ہیں شیخ طاہا؟''

''خدا کو یہی منظور تھا کہ تلاوت کے ریکارڈوں کی وجہ سے ہم بے روزگار ہو جائیں' لیکن وہ اپنے غلام کو کبھی فراموش نہیں کرے گا۔ خیر خانم تم مایوسی کے سامنے ہتھیار نہ ڈالو۔''

''مجھے یہ فکر لاحق ہے شیخ طاہا! عدلیہ کے سوا میرے پاس کوئی بھی نہیں۔ اگر وہ مجھے چھوڑ دے......''

''لیکن خدا تمہارے ساتھ ہے خانم عیون!''

''مگر میں تنہا ہوں۔''

بوڑھا خفگی سے ہاتھ ہلا کر بولا'' کتنے افسوس کی بات ہے!''

''کیا میں نے غلط کہا شیخ طاہا!''

''نہیں' لیکن تمہارا خدا پر ایمان نہیں رہا۔''

''میرا ایمان ہے۔ میرا بیٹا اور شوہر باری باری مجھ سے بچھڑ گئے' پھر بھی میرا ایمان ہے۔''

''نہیں' تمہارا ایمان سلامت نہیں رہا خانم عیون!''

قدرے ناراضی سے اس نے چپ سادھ لی۔ شیخ طاہا نے کہا'' ناراض نہ ہونا! جس کا ایمان سلامت ہو' اس کے دل میں تشویش' ڈر اور مایوسی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔''

''میرا ایمان ہے' لیکن میں بستر مرگ پر ہوں' اور عدلیہ کے رحم وکرم پر ہوں۔''

''ایمان والے صرف اللہ کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں' کسی اور کے نہیں۔''

''یہ کہنا آسان ہے اور اس پر عمل کرنا بہت مشکل!''

شیخ طاہا نے تاسف سے سر ہلایا اور کہا'' ہاں' کہنا آسان ہے اور کرنا بہت مشکل!''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔''

''میں ہر روز تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور شیخ طاہا! خدا کے لئے' ضرور آؤ۔''

''مگر تمہیں ایمان مضبوط بنانے کی ضرورت ہے' ورنہ ایک نابینا بوڑھا تمہاری کیا مدد کر سکتا ہے۔''

قدرے توقف کے بعد عیون جھجکتے ہوئے بولی'' لیکن شاید اسے ناگوار گزرے...... عدلیہ کو!''

''میں اس کے باوجود آؤں گا۔''

''لیکن اگر...... فرض کرو......''

''یقین رکھو میں روزانہ تمہارے پاس آؤں گا۔ اگر اسے برا لگتا ہے تو بے شک وہ دیوار سے اپنا سر پھوڑ لے!''

عیون گھبرا کر دبی ہوئی آواز میں بولی۔ ''آہستہ بولو شیخ طاہا! ہمیں اس کو اشتعال نہیں دلانا چاہیے۔''

''خانم عیون! بھول جاؤ کہ تم اس کے رحم و کرم پر ہو۔ تم صرف خدا کے رحم و کرم پر ہو!''

''ہاں ہاں ہم سب خدا کے رحم و کرم پر ہیں لیکن لمحہ بھر کے لئے غور تو کرو کہ اگر اسے غصہ آ گیا تو میرا کیا بنے گا!''

''کچھ نہیں ہوگا' خدا کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''یہ سچ ہے شیخ طاہا' لیکن میری تنہائی کا خیال کرو۔ اگر وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی تو......؟''

''وہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جائے گی خانم عیون! کیونکہ وہ تمہاری اس سے زیادہ محتاج ہے جتنی تم اس کی محتاج ہو۔''

''میں تو کمزور بوڑھی ہوں۔ وہ جوان ہے' اسے کہیں بھی کام مل سکتا ہے۔''

''ہاں اسے کہیں بھی کام مل سکتا ہے' مگر ملازمہ کی حیثیت سے' یہاں تو وہ مالکن بنی بیٹھی ہے۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو مگر سچ پوچھو تو میں بالکل بے یار و مددگار ہوں۔''

شیخ نے اپنا عصا زمین پر پٹکا۔ ''تمہاری آدھی بیماری کا سبب اس پر غیر ضروری انحصار ہے۔''

''لیکن میری بیماری ایک حقیقت ہے' ڈاکٹر بھی یہی کہتے ہیں۔''

''میں ڈاکٹروں کی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ ویسے فرض کرو اگر وہ تمہیں چھوڑ کر چلی گئی تو میں اپنی بڑی بیٹی کو تمہارے پاس رہنے کے لئے لے آؤں گا' اسے طلاق ہو چکی ہے۔''

خانم کی دھندلی آنکھوں میں امید کی کرن پیدا ہوئی۔ اس نے بے تاب ہو کر پوچھا ''واقعی؟ شیخ طاہا!''

''ہاں' کیوں نہیں! تمہاری خاطر میں اس کے بغیر رہ لوں گا۔''

اس نے شرمندہ ہو کر پوچھا ''لیکن تم تنہا کیسے رہو گے؟''

وہ پہلی بار ہنسا' اور بولا ''ہاں ایک بوڑھا نابینا اکیلا کیسے رہے گا! آخر اس کی طلاق سے پہلے بھی میں اکیلا رہتا تھا۔''

''میں تم پر بوجھ بننا نہیں چاہتی۔''

''تم صرف خود پر بوجھ بنی ہوئی ہو۔ خدا تمہاری مدد کرے!''

ان کے درمیان خاموشی کا ایک طویل وقفہ گزر گیا جس میں بے کراں سکون تھا۔

شیخ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور قرآن کی تلاوت کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ جانے کے ارادے سے اٹھا' نرمی سے سر ہلا کر خدا حافظ کہا اور چلا گیا۔ عیون کو ایک طویل عرصے کے بعد طمانیت کا احساس ملا۔ اس نے عدلیہ کو بلا کر کہا ''عدلیہ! دیکھو شیخ طاہا جب بھی آئیں تو ان کا عزت و احترام سے استقبال کرنا۔''

عدلیہ کی تیوری پر بل پڑ گئے' ناگواری سے تنک کر بولی'' مگر خانم عیون! وہ بہت غلیظ ہے۔''

''وہ ہماری پرانی حویلی کے قاری ہیں۔ ان کی رفاقت مجھے اپنے ماں باپ سے ورثے میں ملی ہے۔''

''خانم! میں نے اس کے ماتھے پر جوئیں چلتی دیکھی ہیں۔''

عیون غصے میں آ گئی۔'' مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ وہ ہمارے بزرگ ہیں۔''

عدلیہ دھمکی آمیز لہجے میں بولی'' لیکن میرے ذمے تو پہلے ہی اتنا کام ہے!''

عیون آواز میں لجاجت بھر کر کہنے لگی:'' خدارا ایسا نہ کہو' یہ میری خواہش ہے' اور میں تم سے اس کے احترام کی امید رکھتی ہوں۔''

عدلیہ کا چہرہ تن گیا۔ کچھ کہنے کے لیے اس نے منہ کھولا' لیکن عیون کی تنبیہ نے اسے باز رکھا۔

''جو تم سے کہہ دیا' وہ کرو' اور بحث مت کرو!''

عدلیہ نے چونک کر عیون کی طرف دیکھا۔ دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں' لیکن عیون نے عدلیہ کی تیز نگاہوں سے ہار نہ مانی' اور پرعزم انداز میں اسے گھورتی رہی۔ اس نے اپنی بیماری اور خوف کی کوئی پروا نہیں کی۔ اسے اپنے وجود میں بہت اندر کہیں جیت کی حرارت محسوس ہونے لگی۔

بالآخر عدلیہ نے اپنی آنکھیں جھکا لیں' اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی' مگر عیون نے معاملہ یہیں ختم نہیں کیا' وہ پوری طرح مطمئن ہونا چاہتی تھی۔ اس نے عدلیہ کو دوبارہ آواز دی۔ عدلیہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ناگواری اور بے صبری سے پوچھا۔

''کیا بات ہے؟ چولہے پر ہانڈی چڑھی ہوئی ہے۔''

عیون نے مضبوط لہجے میں سوال کیا'' عدلیہ! میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم شیخ طاہا کا کیسے استقبال کرو گی؟''

''آپ خفا کیوں ہو رہی ہیں؟ میں نے بھی تو پوچھا ہے کہ شیخ طاہا کون ہے۔''

''کیا تم شیخ کو نہیں جانتیں؟''

''اس سے پہلے میں نے اس کا نام کبھی نہیں سنا۔''

عیون نے جدوجہد جاری رکھنے کے عزم سے جواب دیا'' وہی بوڑھے قاری' جو ابھی کچھ دیر پہلے یہاں بیٹھے تھے اور جنہیں تم نے قہوہ پیش کیا تھا۔''

عدلیہ نے بے یقینی سے خانم کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور بولی'' آج تو گھر میں کوئی بھی نہیں آیا' نہ کوئی قاری نہ کوئی دکاندار۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟''

غصے سے عیون کی آواز رندھ گئی۔'' کیسی باتیں کر رہی ہو! تم اتنی گستاخ ہو گئی ہو......!''

''مجھے آپ کی باتوں سے خوف آ رہا ہے۔ شیخ طاہا کون ہے؟''

"تم پاگل ہو گئی؟ یا مجھے پاگل کر دینا چاہتی ہو؟"

عدلیہ اب واقعی پریشان ہو رہی تھی" مجھے اپنی بیٹی کی جان کی قسم! میں نے کبھی شیخ طاہا کو دیکھا نہ اس کا نام سنا۔"

عیون کی آواز اتنی بلند ہو گئی جتنی کئی برس سے نہیں ہوئی تھی اس نے چلا کر کہا" اب تم قسم تک کھا رہی ہو! تم میرے خلاف سازش کر رہی ہو۔ تم مجھے باور کرانا چاہتی ہو کہ مجھے ایسی چیزیں نظر آ رہی ہیں جو سرے سے کوئی وجود نہیں رکھتیں! کیا میں پاگل ہوں؟ تم یہی چاہتی ہو نا کہ میں اپنے آخری دوست سے بھی محروم ہو جاؤں؟"

عدلیہ کی آنکھیں خوف سے باہر نکل آئیں اس کی تنک مزاجی ڈھیر ہو گئی وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی" خانم! آپ اپنے حواس میں نہیں ہیں۔"

"بدذات! خاموش رہو! میں تم سے نہیں ڈرتی' میں تمہاری محتاج نہیں ہوں۔ وہ ہر روز میرے پاس آیا کریں گے۔ یہ میرا حکم ہے اور تمہیں بحث کیے بغیر یہ ماننا ہو گا۔ خبردار' جوان کا راستہ روکنے کی کوشش کی! میں تمہیں گھر سے نکال باہر کروں گی۔"

عدلیہ کا رنگ زرد ہو گیا' اس نے عاجزی سے کہا" خانم! خود کو تھکایئے مت۔ اپنے ذہن کو پرسکون رکھیے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ بہت خوشی سے آپ کا ہر حکم مانوں گی۔"

مگر عیون کا اشتعال سب حدود پار کر چکا تھا۔ وہ چیخنے لگی۔" لعنتی' ذلیل' چور زانیہ! میں اتنے سالوں سے تجھے برداشت کرتی آ رہی ہوں۔ میں اب تیرا یہ منحوس چہرہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ مجھے تیری ضرورت قطعاً نہیں۔ میرے بغیر تیری اوقات ہی کیا ہے؟ یہاں سے دفعان ہو۔ جہنم میں جا! خدا کی نعمتوں نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ تجھے تو میرا شکر ادا کرنا چاہیے تھا' مگر تو دن رات میری تذلیل کرتی رہی' مجھے ڈراتی رہی' اذیت دیتی رہی۔ نکل جا! آج کے بعد اپنی یہ منحوس شکل مجھے مت دکھانا!"

عدلیہ چند قدم پیچھے ہٹی' خوف سے اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے چیخ ماری اور ہوا کے جھونکے کی طرح دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

چاہت

پرل ایس بک نے اپنی زندگی کا ایک حصہ چین میں گزارا تھا......اس چین میں جو ابھی عظیم اشتراکی انقلاب سے دوچار نہ ہوا تھا۔ پرل بک نے چین میں اپنے قیام کے مشاہدات سے پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ امریکی شہری تھی ۲۶ جون ۱۸۹۲ء میں امریکہ میں پیدا ہوئی۔ اس کا انتقال ۶ مارچ ۱۹۷۳ء کو ہوا۔ اس نے امریکہ کی بعض اہم درس گاہوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ دو شادیاں کیں اور ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۱ء تک وہ شانگ یونیورسٹی چین میں پڑھاتی رہی۔ اسے اپنی زندگی میں کئی انعام اور اعزاز ملے۔ پرل بک پر ایک زمانے میں بہت لکھا گیا اس کا شہرہ بھی رہا لیکن کچھ عرصے سے اس کے کام اور نام پر دُھند چھا رہی ہے۔ پرل کو اس کے جس ناول پر بہت شہرت ملی وہ "گڈ ارتھ" ہے۔ یہ چینی کسان کی زندگی کی سچی تصویر تھی جو چینی انقلاب سے پہلے مصائب و آلام کا نشانہ بنا رہتا تھا۔ اس ناول پر ایک شاہکار فلم بھی بنی جس کی وجہ سے پرل بک اور اس کے ناول کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ انہوں نے اپنی سوانح کے علاوہ لگ بھگ ۴۰ ناول اور ناولٹ لکھے۔ علاوہ ازیں ان کی کہانیوں کے ۱۶ مجموعے بھی شائع ہوئے۔ ان کی ادبی خدمات کی بنا پر انہیں ۱۹۳۲ء میں نوبل انعام دیا گیا۔

☆......☆......☆

"معلوم نہیں مجھے رونا کیوں آ جاتا ہے؟ اس دکھی دنیا میں کسی کو خوش دیکھ کر میرا دل بھر آتا ہے۔" مس بارکلے نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ ایک درزی کی دکان میں ملازمت کرتی تھی۔ گاہک کے ناپ کے مطابق جب کوئی لباس سلنے لگتا تو وہ پہلے کچی سلائی کے ساتھ اسے پہنا کر دکھاتی تاکہ کوئی نقص رہ گیا ہو تو اسے دور کیا جا سکے۔ مگر دکان خواہ شہر کی بہترین دکان ہی کیوں نہ ہو آخر دکان ہوتی ہے۔ اس لئے دل بھر آنے کے مواقع کبھی کبھار ہی آتے۔

اس کا منہ ان پنوں سے بھرا ہوا تھا جسے لباس کی تہیں کھولتے ہوئے اس نے عادتاً دانتوں تلے دبا لیا تھا۔ اس نے انہیں نکال کر ترتیب سے نیچے رکھا۔ اس کا میلا بھورا سر دیکھتے ہوئے ازابل مسکرا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ یہ بڑھیا کتنی نرم دل ہے۔ اچھا کیا عروسی جوڑا سلوانے اس کے پاس آ گئی۔ جانا تو اسے "برگ ڈاف" کی دکان پر تھا۔ مگر جہاں تک اس کی یادداشت کام کرتی تھی بچپن سے لے کر اب تک مس بارکلے ہی اسے فراک پہنا کر دکھاتی رہی تھی۔ جونہی اس کی منگنی کا اعلان ہوا مس بارکلے نے فون پر اس سے کہا تھا "ابھی ابھی تمہاری منگنی کی اطلاع ملی ہے۔ کتنی مبارک خبر ہے! دل باغ باغ ہو گیا۔ ہم سب یہی سمجھتے ہیں کہ اتنا موزوں اور عمدہ جوڑ شاید ہی کبھی بنا ہو۔"

فون ازابل نے سنا تھا۔ جب بھی فون کی گھنٹی بجتی' ازابل ہی سنتی۔ کیا خبر لیو ہی کا فون ہو!

''شکریہ!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا' گو جانتی تھی کہ مس بارکلے اسے دیکھ نہیں رہی۔

لوگوں کا بار بار یہی ایک بات کہنا اسے لطف دے رہا تھا: ''میری عزیز! تم اور لیو تو ایک دوسرے کے لئے بنے ہو' ایک مثالی جوڑا ہے!''

''مجھے یقین ہے کہ تم اپنا عروسی جوڑا ہماری ہی دکان سے سلواؤ گی۔'' مس بارکلے نے ماں سے کہا تھا: ''میں ہی ناپ لوں گی اور میں ہی پہنا کر دکھاؤں گی!''

''ہاں ہاں' ضرور!'' ازابل نے وعدہ کرلیا۔

''تو پھر انتظار نہ کرانا!'' خوشی سے بارکلے کا سانس پھول گیا تھا۔ ''کب ہوگی شادی؟''

''جون میں۔''

''جون کی دلہن! بہت خوب! خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔'' اس نے داد دی۔

ازابل نے ایک بار پھر شکریہ ادا کیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ہمیشہ خوش رہے گی۔ اب تو اس نے ہر خوشی کو اپنا حق سمجھ لیا تھا۔ اس کے پاس ہمیشہ سے ہی کچھ تھا۔

مثالی جوڑے والی بات سے لیو نے بھی لطف اٹھایا۔

ان کے خاندان ایک دوسرے کے پڑوسی تو نہ تھے۔ مگر تعلق بہت قریبی اور قلبی تھا۔ چھٹیوں میں ان کے بچے آپس میں ضرور ملتے جلتے تھے۔ لڑکپن میں لیو کرسمس کے تہوار پر کسی اور لڑکی کو بطور مہمان بلالیتا۔ اچانک پچھلی گرمیوں میں اس کے دل میں ازابل کی محبت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ یہ واقعہ 21 جون کا تھا۔ اس کے ٹھیک ایک سال بعد ازابل نے اس کی درخواست پر شادی کی تاریخ بھی 21 جون ہی مقرر کی۔ بچپن کے زمانے اور شادی کی درخواست کے درمیان ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ انہیں اس بات میں بڑا لطف آیا تھا کہ وہ دونوں' جو ایک دوسرے کو لڑنے جھگڑنے' چھیڑنے اور ستانے والے بچوں کی حیثیت سے جانتے تھے' اب بالکل مختلف صورت میں سامنے آئیں گے۔ وہ ایک لمبا تڑنگا' خوبصورت جوان' یہ ایک حسین و جمیل دوشیزہ۔ دونوں گورے چٹے' دونوں سنہرے بالوں والے اور بقول خود ایک ہی زبان بولنے والے۔

شادی کی درخواست کرتے ہوئے لیو نے مذاق کیا'' میں نے تم سے شادی کرنے کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔''

''تو اب کیوں کرلیا؟'' اس نے پوچھا۔

میرے والدین کئی برس سے اشاروں میں کہتے رہے ہیں کہ اگر یہ رشتہ ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا۔ جاؤ بھی! تم سب کچھ جانتی ہو' پھر بھی مجھ سے کہلوا رہی ہو۔''

''کتنی عجیب بات کی انہوں نے! میرا خیال ہے' تم نے بھی انہیں وہی جواب دیا ہوگا' جو میں نے امی کو دیا تھا!''

''کیا؟'' لیو نے پوچھا۔

"یہی کہ تم وہ آخری شخص ہو جس سے میں شادی کر سکتی ہوں!"

لیو کو تھوڑا سا جھٹکا لگا "پھر بھی ہم دونوں تو ہم خیال ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم والدین کی خواہش سے نہیں اپنی ہی مرضی سے شادی کر رہی ہو۔"

اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا' کی اضطراری باتوں نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

جون کا وہ دن کتنا خوبصورت تھا۔ شفاف' نیلے آسمان پر بگلے کے پروں کی سی نازک' سفید بدلیاں تیر رہی تھیں۔ وہ دونوں لیو کی کھلی کار میں بیٹھے پہاڑی کی بلندی سے نشیب کا نظارہ کر رہے تھے۔ ماحول تو بڑا پر سکون تھا' لیکن ازابل کے دل میں جذبات اور آرزوؤں سے ہلچل مچی تھی۔ اس نے محبت کے خواب کئی بار دیکھے تھے' لیکن اسے پانے کا موقع آج تک نہ ملا تھا۔ اس محبت کی ضرورت کا شدید احساس' دل کی دھڑکن' خواہشوں کا طوفان' شادی کے بعد ایک نئی زندگی شروع کرنے کی آرزو' ان سب نے اس کو بے کل کر رکھا تھا۔

لیو سے محبت کرنا اتنا آسان تھا! وہ کتنا حسین اور خوش مزاج مرد تھا' اور سمجھدار بھی تو کتنا تھا! ان کا جوڑ بالکل ٹھیک تھا۔ دونوں کے خاندان برابر کے امیر تھے' ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہ تھی۔ لیو اور ازابل ایک دوسرے کی محبت پر اعتماد کر سکتے تھے۔ وہ ایک سطح پر شانہ بہ شانہ کھڑے تھے۔ جتنی خوبیاں ایک میں تھیں' اتنی ہی دوسرے میں بھی تھیں' نہ وہ کم تھا' نہ یہ زیادہ۔ دولت کی کچھ زیادہ اہمیت نہ تھی' اگر تھی تو بس اتنی کہ اعلا خاندانوں میں دولت بھی دیکھی جاتی ہے۔

اس نے اپنے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ وہ کسی ایسے مرد سے شادی نہیں کرے گی جس پر اعتماد نہ کر سکے۔ اعتماد..... یہ لفظ بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ لیو پر ہر طرح اعتماد کر سکتی تھی۔

"سوچ رہی ہو سوچ رہی ہو!" لیو نے اسے بڑی نرمی سے سرزنش کی تھی۔ "یہ تو بتاؤ کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے بھی یا نہیں؟"

اس نے لیو کی فطری خوش طبعی کی تہہ میں ایک تشویش بھی موج زن پائی تھی' جس سے اسے اچانک پتا چل گیا تھا کہ اس کے اپنے دل میں کیا اندیشہ ہے۔

اس نے کہا تھا "میرا خیال ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے' البتہ معاملے کا خطرناک پہلو یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو بہت قریب سے جانتے ہیں' اس لئے ہمارے پاس ایک دوسرے کو بتانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"نہیں نہیں!" وہ بول اٹھا تھا "بہت کچھ ہوگا! چھوٹی چھوٹی باتیں تو ہم نے آپس میں کی ہیں' لیکن کوئی بڑی بات تو کبھی کی ہی نہیں۔ محبت کے بارے میں ہم نے کوئی بھی بات کبھی نہیں کی۔"

لیو اس روز دن بھر دیہات کی سڑکوں پر اپنی کار تیزی سے دوڑاتا پھرا۔ اسے خوشی میں اس کا احساس ہی کہاں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے! شام کو جب وہ ازابل کے گھر کے قریب پہنچے تو لیو نے کہا "اس معاملے میں مزے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ ہمارے والدین اس پر بہت خوش ہوں گے۔ میں انہیں خوش کرنے کے لئے تم سے شادی نہ کرتا' لیکن اب کر رہا ہوں تو یہ احساس میرے لئے باعث مسرت ہے کہ اس خبر سے انہیں کرسمس کی سی خوشی ہوگی!"

اور اب ازابل لباس پہن کر دیکھ رہی تھی' اور مس بار کلے وہ پنیں منہ میں بھری ہونے کے باوجود' جنہیں اس نے رونے کے بعد دوبارہ

منہ میں رکھ لیا تھا' منہ کھولے بغیر کچھ کہہ رہی تھی۔

ازابل نے سوچا کہ کیا اسے لیو سے کہنا چاہیے؟ نہیں۔ اس نے خود کو جواب دیا' نہیں کہنا چاہیے' مگر اپنے گھر کے لوگوں سے یا لیو کے گھر کے لوگوں سے کہنے سے تو یہی بہتر ہے کہ لیو کو بتا دیا جائے۔

اب یہ بات اس پر واضح ہو گئی تھی کہ انہیں اپنے خاندانوں میں منگنی کا اعلان فوراً نہیں کر دینا چاہیے تھا' انہیں اوروں کو بتائے بغیر' پہلے اپنے طور پر ایک دوسرے کا عادی بننا چاہیے تھا' انہیں اپنے طور پر اس کا تجربہ کرنا چاہیے تھا۔ مہینے دو مہینے تک اس صورتحال کو پوشیدہ طور پر آزمانا چاہیے تھا' یہاں تک کہ اس کا اپنا دل مطمئن ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ لیو سے بلا تامل کہہ سکتی تھی' میرا خیال ہے لیو! میں جذبات کی رو میں بہہ گئی تھی۔ میں دراصل شادی کرنا نہیں چاہتی' کم از کم تم سے نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے اس کا بے حد افسوس ہے' لیکن سچی بات یہی ہے! میں چاہتی ہوں کہ تم کوئی اور لڑکی ڈھونڈ لو! ہم دونوں ہمیشہ ویسے ہی رہیں گے' جیسے پہلے تھے۔"

سارا قصہ اسی کا تھا۔ اس کی امی نے بہت پہلے اسے بتا دیا تھا کہ قصور ہمیشہ لڑکی کا ہوا کرتا ہے۔ اس نے کہا تھا "فیصلہ لڑکی ہی کیا کرتی ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھو گی تو پھر تمہیں صرف خود سے شکایت ہو گی۔ اس سے معاملہ آسان ہو جاتا ہے۔"

لیکن اگر اس نے اب منگنی توڑی تو دونوں گھرانوں کے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ اور لیو اپنے اپنے والدین کے اکلوتے تھے' اور اس کے والدین کو لیو کے والدین سے گہری انسیت بھی تھی۔ دونوں گھرانوں میں میل جول تو ہمیشہ سے تھا' لیکن منگنی کے بعد تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں خاندان ایک ہو گئے ہیں۔ ان کی مائیں تو اپنے پوتوں اور نواسوں کے بارے میں بھی صلاح مشورے کرنے لگی تھیں۔ ایک دن اس نے اپنے کانوں سے سنا کہ ہونے والے بچوں کے نام رکھے جا رہے تھے۔ "پہلے لڑکے کا نام تو خیر' لیو کے باپ کے نام پر رکھا جائے گا' لیکن شاید پہلی لڑکی کا نام......"

"تمہارے نام پر ازبتھ ہو گا۔" اس کی امی نے بڑے میٹھے لہجے میں لیو کی ماں سے کہا "میرے نام پر کسی بچے کا نام بعد میں رکھا جا سکتا ہے۔ مجھے امید ہے' ان کے چار بچے ہوں گے۔"

"میں تو ہمیشہ سے چاہتی ہوں کہ چار بچے ہوں۔" لیو کی ماں نے کہا۔

اس نے اس خواب میں خلل ڈالتے ہوئے کہا تھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا روحوں کو بلایا جا رہا ہے؟"

ان دونوں نے اس کی طرف چوروں جیسی نظروں سے کچھ اس طرح دیکھا کہ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

واقعہ یہ تھا کہ اس نے اور لیو نے کبھی بچوں کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔ اسے اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہونے سے ہمیشہ نفرت رہی تھی بلکہ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر رکھا تھا کہ اس کے ہاں چار ہی نہیں' بہت سے بچے ہوں گے' لیکن نہ جانے کیوں' اسے لیو سے اس بارے میں بات کرنے کی خواہش نہ ہوئی۔

بعض اوقات تو وہ حیران ہو کر سوچنے لگتی کہ کہیں وہ لیو کے بجائے اس کی خاندانیت پر نہ ریجھ گئی ہو اور کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ اب ان روایات کے بجائے اسے لیو نظر آنے لگا ہو۔ اور شاید اسی طرح لیو بھی اس کے بجائے اس کے خاندان کو دیکھ رہا ہو' گو اس نے اس بات کا کبھی ذکر

نہیں کیا۔ وہ اس جتنا روایت پسند نہیں ہے یا شاید یہ بات ہو کہ وہ لیو سے زیادہ نرم دل ہے۔ اگر وہ منگنی توڑنا چاہتا تو اسے صاف بتا دیتا۔ نہیں' وہ اس سے محبت کرتا ہے۔' وہ اس بات پر شبہ کرنے کو تیار نہ تھی۔

"یہ لو!" مس بارکلے اپنے گھٹنے پکڑ کر بڑی دقت سے اٹھی' جن میں گٹھیا کی وجہ سے درد ہوتا تھا۔ "میں نے دامن کو ٹھیک کر ہی دیا۔ اب یہ لٹکنے میں بڑا خوبصورت معلوم ہوگا۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ تم نے زرد کے بجائے گلابی مائل سفید کاٹن پسند کی۔ گلابی رنگ تم پر بہت کھلتا ہے۔ لاؤ' میں اسے اتارنے میں تمہاری مدد کروں۔"

ازابل نے گھڑی دیکھی۔ "لیو نے کہا تھا' میں بھی آ ؤں گا۔"

مس بارکلے چونکی۔ "مگر اسے شادی سے پہلے تمہیں عروسی جوڑا پہنے ہوئے نہیں دیکھنا چاہیے۔ یہ شگون اچھا نہیں ہوتا۔"

ازابل ہنس دی۔ اس کے بھرے بھرے گالوں میں دو پیارے پیارے گڑھے پڑ گئے۔ "وہ کہتا ہے کہ شادی کے وقت مجھے اچانک اس لباس میں دیکھ کے وہ گھبرا جائے گا' اس لیے پہلے سے دیکھ لینا چاہیے تاکہ اس سے مانوس ہو جائے۔"

مس بارکلے بھی ہنسی...... "بے وقوف کہیں کا! خیر' میں پن نکال لیتی ہوں۔ تم ابھی کھڑی ہی رہنا' بیٹھ نہ جانا۔"

انہیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ پانچ منٹ نہ گزرے تھے کہ ازابل نے لیو کے قدموں کی آہٹ سنی۔ اس نے اسے اپنی چہچہاتی آواز میں مس استار کا پتا پوچھتے سنا۔ پھر اس نے کارکن عورتوں میں پسندیدگی کی سرگوشیاں سنیں۔ "یہ لیو آر علڈ ہے' جو ازابل استار سے شادی کر رہا ہے۔"

ازابل نے دروازہ کھول کے اپنا سر باہر نکالا۔ "لیو! میں یہاں ہوں۔ تم دیر سے آئے ہو۔ میں تو اپنا لباس اتارنے لگی تھی۔"

"مجھے بالکل بھی دیر نہیں ہوئی۔" اس نے عروسی جوڑا دیکھتے ہوئے کہا "واہ' کیا بات ہے!"

"یہ مس بارکلے ہیں۔"

"کہیے مس بارکلے! آپ کا مزاج اچھا ہے؟ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے میری ازابل کو خوابوں کی شہزادی بنا دیا ہے۔"

مس بارکلے شرما گئی۔ اس نے لجاتے ہوئے کہا "اس پر ہر لباس بجتا ہے۔ خیر سے چودہ برس کا سن ہے۔ جو بھی جوڑا میں نے انہیں پہنایا' وہی جچ گیا۔ خدا نظر بد سے بچائے۔"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پھر ڈبڈبا گئیں' اس حالت میں وہ بڑی حسین نظر آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ جوان خود بھی تو بڑا بانکا ہے۔ ذرا اس کے کندھے تو دیکھو' پیڈ لگانے کی ضرورت ہی نہیں! پھر بھی اس نے کوئی اچھا درزی پکڑ رکھا ہے۔ بڑا وجیہہ اور خوبرو ہے یہ نوجوان! مقدر سے لڑکی بھی خوبصورت ہے' ورنہ اسے اپنے مرد کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔ آج کل عورتیں بن سنور کر پرائے مردوں کو رجھاتی پھرتی ہیں۔ وہ یہ باتیں اس لئے سوچ رہی تھی کہ پچیس سال پہلے اس کے شوہر کو ایک حسین لڑکی نے چھین لیا تھا' جو اس کی بہترین سہیلی تھی۔ وہ ایک دن بڑی مسمی صورت بنا کر اس کے پاس آیا' اور کہنے لگا "جی! بات تو بہت بری ہے لیکن کیا کروں' میں لوزی کو دل دے بیٹھا ہوں۔" کیا کیا جا سکتا تھا' گو وہ ہفتوں روتی رہی تھی اور اس کے بعد سے اب تک ذرا ذرا سی بات پر رو دیتی ہے۔

لیو کہہ رہا تھا "مڑو!"

ازابل آہستہ سے مڑ گئی۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

مس بار کلے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی' حور کی طرح مسکرا رہی ہے اور اس کا دولھا! اسے کچھ اس طرح سے تکے جا رہا ہے جیسے بس چلے تو دل میں بٹھا لے۔

محبت دل پر اثر کرتی ہے' خواہ اس کا مرکز کوئی اور ہی ہو!

اس نے اپنی آنکھیں بازو پر بندھی ہوئی پنوں کی گدی کے کونے سے پونچھ ڈالیں۔

ازابل نے اپنی لمبی' سنہری پلکیں اٹھا کے لیو سے پوچھا "مطمئن ہو؟"

اس نے بڑے قطعی اور فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا "اگر نہ ہوں تو بڑا کم ظرف ہوں گا۔"

ازابل مسکراتی رہی' پھر بولی "تو پھر میں بھی مطمئن ہوں۔ مس بار کلے! مہربانی کر کے اب اسے اتروایئے! ابو اور امی لٹافی کے ہاں ملیں گے۔ امی اپنے ہیرے میرے لئے پھر سے جڑوا رہی ہیں۔"

مس بار کلے نے ساٹن میں سے پن نکالتے ہوئے سوچا' "کتنی خوش نصیب ہے یہ لڑکی! ایک نہیں کہ یہ جوان اس سے دل و جان سے چاہتا ہے۔ بلکہ محبت کے ساتھ ساتھ جواہرات بھی مل رہے ہیں!"

اس نے لیو سے کہا "آپ ایک منٹ کے لیے باہر چلے جایئے۔"

وہ لپک کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بلند آواز سے بولا "میں معذرت چاہتا ہوں۔"

ازابل ہنسی۔ "کتنا پیارا نوجوان ہے! ہاں' لیو واقعی پیارا نوجوان ہے۔ اور وہ کتنی بے وقوف ہے! اب کہیں ہو بھی چکے یہ شادی۔ پھر چین ہی چین ہو گا' لیکن کیا آج کل شادی کر کے چین نصیب ہو جاتا ہے؟"

"شکریہ مس بار کلے! جوڑا بہت عمدہ سلا ہے!"

مس بار کلے نے رندھے ہوئے گلے سے کہا'

"شکریہ! میں نے اسے بڑی توجہ سے سلوایا ہے۔"

لیو نے اپنا ہاتھ ازابل کے بازو پر سے پھسلا کر اس کی دستانہ پوش انگلیاں پکڑ لیں۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے یہاں بلایا اور عروسی جوڑا دکھایا۔" اس کی آواز میں ایک عجیب سا خلوص تھا۔

اس میں کچھ بناوٹ معلوم ہوتی ہے۔ یہ سوچ کر ازابل نے لیو کی طرف دیکھا۔

وہ سامنے پُر ہجوم گزرگاہ کو دیکھ رہا تھا۔ دوپہر ہو چکی تھی اور لوگ کھانے کے وقفے میں دھوپ سینک رہے تھے۔

"کیوں؟" وہ پوچھنے لگی "خوشی کیوں ہے؟"

اس نے اسی طرح پرخلوص لہجے میں جواب دیا "یوں کہ اب مجھے یقین آ گیا کہ ہماری شادی ضرور ہوگی۔"

"تمہیں پہلے اس کا یقین نہیں آیا تھا؟"

"قطعی طور پر نہیں آیا تھا۔" اس نے اقرار کیا "یعنی کسی وقت شک بھی ہونے لگتا تھا' لیکن اب قطعی طور پر یقین آ گیا کہ شادی ضرور ہو گی۔ دعوت نامے جا چکے ہیں۔ شادی کی انگوٹھی کندہ ہو چکی ہے' عروسی جوڑا اسل کر تیار ہو گیا ہے۔"

ازابل نے مصرع اٹھایا "پھولوں کے لئے کہہ دیا گیا ہے۔ کیک اگرچہ تیار نہیں ہوا ہے' مگر اس کا نقشہ تیار ہے' اور پادری کو تاریخ دے دی گئی ہے۔"

"گویا شادی ضرور ہوگی!"

وہ لفافی کے دروازے پر رکے۔

"تم کھانا میرے ساتھ نہیں کھاؤ گی؟"

"نہیں...... آج نہیں۔"

"میں آج رات آؤں؟"

وہ بولی "پوچھتے کیوں ہو؟ کیا ہر رات نہیں آتے؟"

"لیکن تم چاہتی ہو کہ آؤں؟"

"ہاں میں چاہتی ہوں!"

"واقعی!"

"ہاں...... واقعی!"

اور وہ دروازے کے اندر داخل ہوگئی۔

وہ سوچ رہی تھی "میرے لیے جو یہ ہے وہ اور کوئی نہیں' اور ہم دونوں کے والدین بھی سچ کہتے ہیں' اور مس بار کلے بھی' کہ ہمارا جوڑا مثالی ہے' اور ہم ایک دوسرے سے محبت کرنے کے لیے ہی بنے ہیں'۔

اس کے کالج کا پروفیسر کہا کرتا تھا کہ شادی اونچے خاندان میں کرنی چاہیے۔ اس بات کا خیال آتے ہی ازابل نے سوچا' لیو خاندانی اعتبار سے بھی بلند ہے۔

وہ اپنے دل میں اس بات پر خوش ہو کر ہنسنے لگی کہ اس کے دولھے میں وہ ساری خوبیاں ہیں' جو کسی بر میں دیکھی جاتی ہیں۔

پھر اس نے اپنے والدین کو دکان میں بہت بے صبری کے عالم میں اپنا منتظر پایا۔ چمکتے ہوئے جواہرات کی ایک ڈھیری ان کے سامنے تھی۔

لیو سڑک پر حسب معمول سر اُٹھائے چلا جا رہا تھا۔ لڑکیاں کنکھیوں سے اسے دیکھتی ہوئی گزر رہی تھیں' مگر وہ ان کی طرف متوجہ نہ تھا۔ وہ خود سے بیزار تھا۔ نہیں' یہ لفظ اس کی حالت کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔ وہ خود پر بے حد خفا ہو رہا تھا۔ ازابل سے شادی کی درخواست اس نے کی تھی۔ قصور اسی کا تھا۔ اب اسے خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اگر وہ کسی اور قسم کی لڑکی ہوتی' اگر ان کے خاندان ایک دوسرے سے اتنے قریب نہ ہوتے' اگر ہر ممکن دلیل سے یہ بات مناسب اور صحیح نہ ہوتی کہ انہیں ایک دوسرے سے محبت کرنی چاہیے تو وہ اس سے صاف صاف کہہ دیتا کہ دیکھو بی بی! مجھے بے حد افسوس ہے' مجھ سے لغزش ہوگئی ہے۔ میرے دل نے مجھے دھوکہ دیا' میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ مصیبت مول نہیں لینی چاہیے...... نہیں' اس کی وجہ کوئی اور لڑکی نہیں بلکہ خود میں ہوں۔ قصور مجھ سے سرزد ہوا ہے۔

مگر ازابل سے یہ باتیں کہنا ممکن نہ تھا۔

اس نے دیکھا کہ ازابل کے والدین کے ہم راہ' اس کے اپنے والدین بھی موجود ہیں' اس کی ماں ازابل کو اپنی بہو بنانے کے خیال سے کتنی مسرور تھی!

''میرے پیارے بیٹے! میں تو ہمیشہ سے اسے چاہتی آئی ہوں۔ مجھے ہمیشہ سے یہی توقع تھی کہ......''

اور اس کے باپ نے اس کا ہاتھ پدری شفقت سے دباتے ہوئے کہا'' بیٹے! میں ایسی کسی اور لڑکی کا تصور بھی نہیں کرسکتا جسے ہم ازابل کی طرح اپنا بنا سکتے ہوں!''

اپنا بنانا......! وہ اور ازابل ہر اعتبار سے ایک دوسرے کو اپنا بنا چکے تھے۔ کچھ یہ نہ تھا کہ وہ کسی اور لڑکی کی محبت میں مبتلا ہوگیا تھا۔ وہ کسی شناسا لڑکی کو ازابل کے برابر تو کیا' اس سے آدھی خوبصورت بھی نہ سمجھتا تھا۔

وہ جوان ہو کر کتنی حسین ہوگئی تھی! لمبی لمبی ٹانگوں والی بدوضع لڑکی بڑی ہو کر کتنی دل کش بن گئی تھی۔ اس کی جلد شفاف تھی۔ اس کے چہرے کے نقش و نگار بے عیب تھے۔ وہ تعلیم سے فارغ ہو کے گھر آیا تو اسے دیکھ کے حیران رہ گیا' اور پہلی نظر میں اس پر فریفتہ ہو کر اس سے دل و جان سے محبت کرنے لگا۔ اس کے خیال میں یہ محبت دائمی تھی۔ ایک ایسی لڑکی سے محبت کرنا' جس سے سب خوش ہوں' بجائے خود مسرت انگیز ہوتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی منگنی کا اعلان اسی دن کردے جس دن اس نے ازابل سے شادی کی درخواست کی تھی۔ وہ اپنے والدین کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھنا چاہتا تھا۔ منگنی کو خفیہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

اس سلسلے میں زیادہ پوچھ گچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ گرمیاں ایک ہی مقام پر گزارا کرتے تھے اور مشترکہ محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ گو وہ اس سے اتفاق کرتا تھا کہ ازابل کو مخلوط محفلوں میں شرکت نہیں کرنی چاہیے' اور جس طرح ازابل کے والدین اس کا آزاد خیال لوگوں سے ملنا پسند نہ کرتے تھے' اسی طرح وہ بھی پسند نہ کرتا تھا۔ البتہ ازابل اپنے گھر میں موسیقی کے کمرے میں اس کے ساتھ شامیں گزارنے پر رضامند ہو جاتی تھی۔ گانے میں دونوں اچھے تھے' اس لئے ابتدا اسی سے ہوتی تھی۔

ان کے لیے الگ مکان کا بندوبست بھی ہوگیا تھا۔ لیو اپنے باپ کے دفتر میں کام کرتا تھا' اس لیے شہر میں رہنے پر مجبور تھا۔ اس کے

والدین نے ان دونوں کے لیے مشرق دریا کے کنارے پر ایک عمدہ مکان لے لیا تھا۔ اسے شادی کے تحفے کے طور پر سجایا جا رہا تھا۔ لیو اور ازابل قالینوں اور پردوں کے بارے میں اتفاق رائے یا اگر چاہتے تو اختلاف رائے کر لیتے۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ گھر قدامت پسندانہ ہوتے ہوئے جدید ہو۔ وہ خود بھی ایسا تھا۔ اس کے سب جگری دوست بھی جدیدیت پسند مگر قدیم روایات کے اسیر تھے۔

چونکہ لیو عقیدے کے لحاظ سے بھی قدامت پسند تھا اس لیے وہ خود سے اس بنا پر بھی ناراض تھا کہ وہ ازابل سے شادی کا ارادہ کر لینے کے بعد اب کیوں پلٹ رہا ہے۔ اس قسم کی قلابازی تو گئے گزرے لوگ ہی لگا سکتے تھے کہ پہلے ایک لڑکی سے شادی کی درخواست کریں اور پھر اپنی رائے بدل دیں۔

شادی کے معاملے میں اس کی نیت کب بدلی' یا اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ وہ کسی خاص گھڑی' یا بیزاری شروع ہونے کے کسی خاص لمحے کی نشان دہی نہ کر سکتا تھا۔ اصل میں تو بیزاری کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ازابل ابھی تک اس کی حیات کے لیے مسرت انگیز طور پر دل نواز تھی۔ اس کے ہونٹ گلاب کی پنکھڑی کی طرح تازہ تھے۔ وہ ان پر بڑی خوبی سے لپ اسٹک لگاتی تھی۔ وہ بڑی اچھی بیوی بڑی اچھی ساتھی اور بڑی سگھڑ عورت ثابت ہوگی۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کی شادی کامیاب نہ ہو سوائے اس کے کہ وہ خود ہی کوئی حماقت کر بیٹھے۔

وہ کوئی پانچ منٹ تک خود سے بے حد بیزار رہا' پھر اسے یاد آیا کہ اس نے ناشتے کے بعد سے اب تک کچھ بھی نہیں کھایا۔ اسے بھوک محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنی پسند کے ایک ریستوران میں داخل ہوا اور ایک میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ دفعتاً اس نے کسی کو اپنا نام لے کر پکارتے سنا "لیو!...... لیو!"

اس نے سر اٹھا کے دیکھا تو ساتھ کی چھوٹی میز پر اس کے تایا بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بوڑھے ہونے کو آ گئے تھے' مگر اب تک شادی نہیں کی تھی۔ ان کے پاس کافی بے مصرف دولت تھی' اس لیے کوئی کام کاج بھی نہ کرتے تھے۔ شہر کے تماش بینوں میں شمار ہوتے تھے اور دل بہلاوے کے طور پر گاہے بگاہے کوئی تمثیل پیش کرنے کے کام میں رقم لگا دیا کرتے تھے۔

اس نے کہا "ہیلو فلپ!" "تایا" کہنے کی ممانعت تھی۔

"آؤ" تایا نے کہا "تھوڑے سے مچھلی کے کباب کھا لو بڑے مزے کے ہیں!"

"شکریہ۔" لیو بولا "میرا تو گائے کے تکے کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔"

اس نے بیرے کو گائے کے تکے لانے کو کہا اور کرسی کی پشت سے لگ کے بیٹھ گیا' پھر اس نے اپنے تایا سے پوچھا "کہیے کیا حال ہے؟"

"اچھا ہوں۔" تایا نے جواب دیا۔ "پیرس جانے کی سوچ رہا ہوں۔ لیکن تمہاری والدہ چاہتی ہیں کہ میں تمہاری شادی تک ٹھہر جاؤں۔"

"ٹھہر کر کیا کریں گے۔" لیو نے کہا "آپ چلے جایئے۔"

"کیوں؟" تایا چونکے۔ "کیا شادی نہیں ہو رہی؟"

لیو نے جلدی سے کہا "نہیں نہیں! میرا مطلب یہ نہیں ہے' میں تو کہہ رہا تھا کہ میری شادی کو آپ کے مشاغل میں حائل ہونا نہیں چاہیے۔"

"میں نے کبھی کسی کو ان میں حائل نہیں ہونے دیا۔" تایا نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ وہ لمبے سے پتلے سے سوکھے سے آدمی تھے۔

کئی کئی سال تک ان کی صورت دکھائی نہ دیتی تھی۔ پھر کسی دن اچانک آ نمودار ہوتے تھے۔ اور ہفتوں اکثر آتے رہتے۔ گھر آ ؤ تو لائبریری میں بیٹھے پڑھ رہے ہوتے' یا بیٹھک میں بیٹھے ہوئے کچھ سوچتے ہوتے۔

وہ کہہ رہے تھے "میں ایک کھیل دیکھنے کے لئے پیرس جانا چاہتا ہوں۔ پندرہ دن میں کیا فرق پڑ جائے گا! وہ کھیل بڑا مقبول ہو رہا ہے' اور میں سوچ رہا ہوں کہ آئندہ موسم خزاں میں اسے یہاں دکھایا جائے' خاصی طربیہ ہے۔"

لیو کہنے لگا "ازابل اور میں دونوں شادی میں آپ کی عدم موجودگی کو آپ کی معذوری سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے۔"

تایا مچھلی کے لال کیے ہوئے قتلوں پر نظر جمائے ہوئے بولے "اگرچہ خاندان سے میرا تعلق برائے نام ہی ہے' لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے اکلوتے بھتیجے کی شادی پر مسرت ہو۔" انہوں نے ایک قتلہ کانٹے سے اٹھایا "موزوں شادیاں شاذ و نادر ہی ہوتی ہیں۔ مجھے ایسی کوئی شادی دیکھنے کی تمنا ہے۔"

لیو کے دل میں اچانک ان سے مشورہ لینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ وضاحت کیے بغیر بھی مطلب کی بات تو پوچھی جا سکتی تھی۔ تایا سے اسے محبت نہ سہی' مگر وہ ان پر اعتماد تو کر سکتا تھا۔ اس چھیل چھبیلے انسان سے محبت کیسے ہو سکتی تھی۔ ان کا ذہن پوری طرح بیدار اور روشن تھا۔ گو دل مرجھا گیا تھا بلکہ شاید مر چکا تھا' مگر اس وقت لیو کو ان کے دل سے کیا کام تھا۔

"عجیب بات ہے!" اس نے کہنا شروع کیا' پھر رک گیا۔

تایا نے پوچھا "کیا بات عجیب ہے؟"

"شادی بہت قریب ہے اور میں نے ازابل کو عروسی جوڑے میں بھی دیکھ لیا ہے' جس میں وہ بلا کی حسین نظر آ رہی تھی' مگر میرے دل میں یہ عجیب سا احساس پیدا ہو گیا ہے کہ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

وہ اس طرح رک گیا جیسے اسے کسی بات کی توقع ہو۔ مگر کس بات کی' وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ اس کی نگاہیں تایا پر مرکوز نہیں تھیں۔

تایا نے زیر لب کہا "یہ تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔"

لیو نے جلدی سے کہا "میرے نزدیک تو ہے' کیوں کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں یہ رشتہ ضرور ہو اور اگر میں توڑنا بھی چاہوں تو ہمارے خاندان والے کب توڑنے دیں گے؟ آدمی کو ایک اپنا ہی خیال تو نہیں کرنا چاہیے!"

تایا نے اسی طرح پوچھا "کیا تمہارے نزدیک یہ سمجھنے کا کوئی جواز ہے کہ ازابل بھی ہچکچا رہی ہے؟"

انہوں نے اشارے سے بیرے کو بلا کر اس سے کہا "مچھلی میں مزہ نہیں آیا!"

بیرے کو تشویش لاحق ہوئی۔ "حضور کچھ اور منگوانا پسند کریں گے؟"

"کوئی مزے دار مشروب لے آؤ۔"

لیو کے لیے گائے کے تکے لائے گئے۔ انہیں بھون بھون کر سرخ کر دیا گیا تھا اور وہ مکھن اور پیاز کے عرق سے تر بتر تھے۔ لیو بھوک سے

بے تاب ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بڑا سا نکالا اٹھا کر کھانا شروع کر دیا۔ "میرا خیال ہے۔۔۔" اس نے بھرے ہوئے منہ سے کہا "کہ آپ مچھلی کی تعریف کر رہے تھے۔"

"ہاں!" تایا کہنے لگے "وہ تھی تو خوب' مگر تمہاری باتوں سے بے مزہ ہو گئی! اگر صرف تمہاری اور ازابل کی بات ہوتی تو...... تم سمجھتے ہو کہ ازابل شادی کرنے کو تیار ہے؟"

لیو نے کہا "میرے نزدیک تو اس میں شبے کی کوئی وجہ نہیں۔"

عروسی لباس میں ازابل کی فروزاں آنکھوں کی کیفیت وہ تایا سے بیان نہ کر سکتا تھا۔ اسے یہ آنکھیں یاد آئیں تو یوں محسوس ہوا جیسے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ اس نے سوچا "اگر میں نے ازابل پر ظلم کرتے ہوئے شادی سے انکار کر دیا تو بھی ان آنکھوں کو یاد رکھوں گا۔"

فرانس کے انگوروں کا سفید رنگ کا مشروب آیا۔ بیرے نے اسے آہستہ آہستہ گلاس میں انڈیلا تاکہ اس میں جھاگ پیدا ہو جائے۔ تایا نے اس کا ایک گھونٹ پیا' پھر بولے "میرا خیال ہے میں تمہیں وہ بات بتا ہی دوں۔ تمہارے والدین نے تو کیا بتائی ہو گی۔ اس زمانے میں یہ واقعہ بڑی رسوائی کا موجب ہوا تھا۔ میں نے اپنی منسوبہ سے گرجا میں عین نکاح کے وقت قطع تعلق کیا تھا۔ اس کا نام ایگنس وان ہیلڑ ہے۔"

"ارے!" لیو نے حیرت سے کہا۔

مس وان ہیلڑ کو کون نہیں جانتا تھا! وال اسٹریٹ کے کروڑ پتی سرمایہ دار کی بہن' جو برسوں پہلے فوت ہوا تو اپنی تمام دولت بہن کے نام کر گیا۔ مس ہیلڑ نے شادی نہیں کی تھی۔ اس نے شہر میں دو عظیم خیراتی ادارے قائم کیے تھے اور وہی انہیں چلا رہی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران اس نے یورپ میں یتیم خانے اور اسپتال کھولے تھے۔ دراز قد اور خوبصورت' اس کی سیاہ آنکھیں اس کے برف جیسے سفید بالوں تلے دمکتی رہتی تھیں اور چہرے پر نور معلوم ہوتا تھا۔

تایا پرسکون سوچ کے انداز میں بات کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ شراب کی چسکیاں بھی لیتے جا رہے تھے۔ "میں نے اپنے ارادے کی تبدیلی کا اعلان وقت سے پہلے کرنا چاہا تھا' مگر نہ کر سکا تھا۔"

"گویا......" لیو نے کہا "آپ اسے ناپسند کرتے تھے! مگر میرا معاملہ تو یہ ہے کہ میں ازابل کو ناپسند نہیں کرتا۔ میں تو اس بیزاری کے احساس کے باوجود پسندیدگی کی اس فضا میں ہوں' جسے میں ہمیشہ سراہتا رہا ہوں۔"

تایا بولے "ایگنس' ازابل سے بہت مختلف تھی۔ اس میں مرد کو دبا کر رکھنے کا جذبہ تھا۔ میں نے تاڑ لیا کہ وہ مجھے کچا کھا جائے گی' چنانچہ میں نے شادی سے انکار کر کے اپنی جان بچائی۔" انہوں نے سر ہلایا۔ "میں تو بچ گیا' لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ شادی نہ ہونے کے صدمے سے بھی بچ گیا۔ میں نے آج تک کسی اور عورت سے شادی کی آرزو نہیں کی۔"

"اور نہ اس نے کی؟" لیو بولا۔

"ہاں......" تایا نے کہا "اس نے بھی نہیں کی۔ ارے بھئی' ہم باتوں میں پڑ کے اتنا لذیذ کھانا ٹھنڈا کر رہے ہیں! یہ ٹھیک نہیں۔"

دونوں نے پھر کھانا شروع کر دیا۔

لیو سوچ میں گم تھا۔

تایا فرانسیسی پیسٹری میں سے اپنی پسند کا ٹکڑا تلاش کرنے لگے۔

''اگر میں کوئی مشورہ دے سکتا ہوں۔۔۔'' انہوں نے اس کام سے فارغ ہو کر کہا'' تو وہ یہی ہے کہ میری طرح نہ کرنا۔ اگر ممکن ہو تو شادی کر گزرو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں' کئی جوانوں نے اس دوران مجھے رازدارانہ طور پر یہ بتایا ہے کہ ہر مرد پر شبہات کا دور آتا ہے اور جب یہ دور گزر جاتا ہے تو وہ پھر سے ٹھیک ہو جاتا ہے۔ مجھے خود اس کا علم نہیں۔ میں تو یہی جانتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کیا اس پر مجھے کوئی ندامت نہیں ہے' حالانکہ معاشرے نے کافی عرصے تک مجھ پر لعن طعن کیا۔ آج کل یہ باتیں اتنی اہم نہیں سمجھی جاتیں جتنی میرے زمانے میں تھیں' اور یہ اچھا ہی ہے۔''

''ذرا صاف صاف کہیے!'' لیو ان کا مطلب اچھی طرح نہ سمجھا تھا۔

''گرجا میں نکاح کے وقت تک انتظار نہ کرنا۔'' تایا نے اچانک بڑے زور سے کہا'' انکار کرنا ہو تو ابھی کر دو ورنہ چپ رہو!''

لیو کو یہ مشورہ کچھ زیادہ ٹھوس نہ معلوم ہوا۔ تیسرا پہر ہوتے ہوتے اس نے یہ رائے قائم کر لی کہ اس میں کچھ وزن نہیں ہے۔ اس نے اپنے باپ کے ساتھ مل کر ایک مقدمے کی مسل پر کام کیا' جس سے اسے ابھی تک دلچسپی تھی۔ ایک شخص نے دوسرے پر اس لیے نالش کر دی تھی کہ دوسرے نے پہلے کو اس کی بیوی کی محبت سے محروم کر دیا تھا۔ لیو کے والد یہ مقدمہ نہیں لینا چاہتے تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ اتنی نجی ذلت کو منظر عام پر لانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ان کے نزدیک اصل میں اس شخص نے اپنی بیوی کو دوسرے شخص کے نمودار ہونے سے پہلے ہی ہاتھ سے کھو دیا تھا۔ جو عورت اپنے شوہر کی ہو وہ کسی اور کے عشق میں مبتلا نہیں ہوا کرتی۔ غرض اس کے باپ کے نزدیک یہ مقدمہ فضول سا تھا۔

اس کے برعکس لیو کی رائے یہ تھی کہ آج کل کوئی بھی معاملہ نجی نہیں ہوتا۔ مقدمہ جاندار ہے اور فیس بھی معقول ہی ملے گی۔

لیکن اب جن حالات سے وہ گزر رہا تھا' ان میں یہ قضیہ خود اسے بھی مکروہ معلوم ہوا۔

ادھر اس کا باپ مقدمے میں ذہن لڑا رہا تھا...... کیا کسی شخص کو کسی ایسی عورت تک پہنچنے کا حق ہے جو قانوناً کسی اور کی ملکیت ہو؟ اور اگر نہیں ہے تو کیا قانون اسے سزا نہیں دے گا؟

لیو نے مسل دیکھ چکنے کے بعد کہا'' عورت کا بیان ہے کہ اس نے اپنے شوہر کو کبھی نہیں چاہا۔ اس کے والدین نے اس کی دولت اور حیثیت وغیرہ کی وجہ سے اسے اس سے شادی کرنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ اسے خاندانی مصلحت کا نام دیتی ہے۔''

''بکواس کرتی ہے!'' باپ نے ایک قانون دان کی طرح پرزور لہجے میں کہا'' اس زمانے میں کسی مرد یا عورت کو شادی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مرضی تھی تبھی شادی ہوئی تھی۔''

دن ڈھلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ سورج کی ترچھی کرنیں ان دونوں کے درمیان رکھے میز اور اس کے باپ کے جھریوں سے بھرے شفیق چہرے پر پڑ رہی تھیں۔

لیو نے سوچا' اگر میں بیزاری محسوس کرنے کی بات ان سے کہہ دوں تو کیسی رہے؟ زمانہ بدل چکا ہے' پرانی روایتی مجبوریاں اب کوئی معنی نہیں رکھتیں' میرے دوست یہ سانحہ بھول بھال جائیں گے' اور ازابل اتنی دلکش لڑکی ہے کہ کوئی اور اس سے فوراً شادی کر لے گا۔

لیکن جوں ہی اس کی نظر اپنے باپ پر پڑی' اسے خیال آیا کہ یہ معاملہ محض روایات کا نہیں ہے۔ ان قدیم انسانی روایات کی گہرائیوں میں اور باتیں بھی ہیں' جو انسانی تجربات کا ثمرہ ہیں۔ ایک فرد بہتوں کے لیے خود کو قربان کرتا ہے۔ یہ ایثار ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ایک فرد اس لیے غم اٹھاتا ہے کہ اس کے سب متعلقین خوش ہوں۔ انسانیت کی بنیادیں اسی پر قائم ہیں۔

نہیں' وہ اپنے باپ سے یہ بات نہیں کہہ سکتا' اس سے ماں کو بھی پتا چل جائے گا' اور پھر ازابل کی ماں اور اس کے باپ کو بھی معلوم ہو جائے گا اور اگر وہ والدین کی پروا نہ بھی کرے تو کیا ازابل کو بھی قربان کر سکتا ہے؟ وہ اسے اتنا چاہتی ہے۔

عروسی جوڑا تیار ہو گیا' اور ایک بڑے صندوق میں رکھ کر پہنچا دیا گیا۔ جب ازابل نے اسے کھولا تو اس کی لیس کی تہوں کے نرم باریک کاغذ میں سے خوشبو کی لپٹیں آئیں۔ مس بارکلے نے لیس میں نیلی ساٹن کی ایک کترن گلاب کے عطر میں بسا کر رکھ دی تھی۔ ایسا تحفہ دینے کی اسی کو سوجھ سکتی تھی۔ بات معمولی تھی' لیکن ازابل جانتی تھی کہ اس میں کتنے جذبات اور کتنی لطافتیں مضمر ہیں۔ انسانوں میں یہی تو ہے کہ اپنے جذبات ظاہر کیے بغیر نہیں رہتے۔

دروازہ کھلا اور اس کی والدہ اندر آ گئیں۔ ان کا نرم گلابی چہرہ پر مسرت اضطراب کی تصویر بنا ہوا تھا۔

"بیٹا!" انہوں نے کہا "لیو کی دادی جان نے ایک نہایت پیارا تحفہ تمہیں ابھی ابھی بھیجا ہے۔ وہی چاندی کا چائے کا سیٹ معلوم ہوتا ہے جو ان کے بزرگ انگلستان سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ ارے' تمہارا عروسی جوڑا آ گیا! تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ اسے کھولنے کے وقت میں بھی موجود ہوتی!"

"مجھے خیال ہی نہیں آیا۔" ازابل کے منہ سے سچی بات نکل گئی۔

اس کی ماں نے خوشبو کا وہ پلندا صندوق میں سے نکالا۔

"یہ پیاری خوشبو کس شے کی ہے؟ مس بارکلے سے ایسی ہی دل لبھانے والی بات کی توقع تھی۔ اسے کہاں لٹکاؤں؟..... ارے ہاں! پلاسٹک کے تھیلے میں ڈال کر مہمان خانے کی الماری میں لٹکا دیں' یا پھر اسی صندوق میں رہنے دیں؟"

ازابل نے کہا "لٹکا دیجیے۔"

لیکن اس کی ماں اپنی شادی کے دن کی یاد میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے بیٹی کی بات سنی ہی نہیں۔

وہ کہہ رہی تھی "پتا نہیں تم وہ بات جانتی ہو یا نہیں؟"

"کون سی بات؟" ازابل نے پوچھا۔

"میں یہ جاننے کے لیے بے تاب ہوں کہ تم شادی کے بعد خوش بھی رہو گی یا نہیں۔ میرے لیے یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مجھے اس

بات کی اسی وقت سے فکر ہے جب تم پیدا ہوئی تھیں۔ عورت کے لیے غلط شوہر عذاب بن جاتا ہے اور صحیح مرد ایک رحمت ہوتا ہے۔"

"یہی موقع ہے........" ازابل نے سوچا "اب مجھے کہہ دینا چاہیے۔ اسی وقت کہہ دینا چاہیے کہ لیو اور سب طرح موزوں ہونے کے باوجود غلط قسم کا مرد ہے۔"

"میری پیاری پیاری بیٹی۔" ماں نے سرگوشی کی "میں کتنی خوش ہوں!"

ازابل کچھ نہ کہہ سکی وہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکی۔ اس کی ماں کی آنکھیں سچ مچ بھیگی ہوئی تھیں۔

حقیقت میں وہ لیو کو اس لیے بھی ناپسند کرنے لگی تھی کہ وہ کسی سے یہ نہ کہہ سکی تھی کہ وہ لیو سے محبت نہیں کرتی۔ یہ بات ناواجب تھی اور نامنصفانہ بھی۔ کیا وہ اس سے مختلف ہو گیا تھا جیسا ہمیشہ سے تھا؟ نہیں وہ تو ویسا ہی تھا۔ اس نے سوچا "وہ بالکل وہی انسان ہے جس سے میں نے محبت کی تھی مگر مجھے اس سے بےزاری سی ہونے لگی ہے۔"

ایک شام وہ اس سے ملنے کے لیے زینے سے نیچے آئی۔ یہ شام شادی سے پہلے کی وہ آخری شام تھی جسے وہ مل کر گزار سکتے تھے۔ آئندہ دنوں میں تو ضیافتوں اور دعوتوں کا وہ تانتا بندھے گا کہ وہ ایک دوسرے سے مل بھی نہ سکیں گے۔ اس نے ہر دعوت میں شرکت پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ کسی ضیافت میں لیو کی منسوبہ بن جانا اس کے لیے زیادہ آسان تھا۔ لڑکیاں داد بھی دیتیں اور حسد بھی ظاہر کرتیں۔ اسے اس بات کا پورا پورا شعور تھا کہ جب وہ دونوں ساتھ ہوتے ہیں تو کتنے بھلے دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں کے قد لمبے رنگ کھلتے ہوئے جسمانی طور پر دونوں ایک دوسرے کے لیے موزوں لیکن جسم ہی تو بغاوت پر آمادہ تھا۔ یہ ایک عجیب ناقابل فہم الجھن تھی ان کے ذہن ہم آہنگ تھے۔ ازابل اور لیو ذہنی طور پر ایک دوسرے کو ہمیشہ سے سمجھتے آئے تھے دونوں ذہنی طور پر ایک دوسرے کے بالکل قریب تھے۔ دونوں ہر اہم مسئلے میں اور حد یہ ہے کہ مذہب اور سیاست کے بارے میں بھی متفق تھے۔ وہ ایک سا لباس پسند کرتے تھے۔ ایک ہی رنگ دونوں کو پسند آتا تھا۔ ان میں کبھی تو تو میں میں نہ ہوئی تھی۔ وہ سچے دل سے لیو سے محبت کرنا چاہتی تھی۔

پھر اس کا ذہن لیو سے برگشتہ کیوں تھا؟

اگر وقت ہوتا تو وہ کسی ماہر نفسیات کے پاس جاتی اور اس کا سبب معلوم کرتی مگر شاید اس کا سبب کوئی بھی نہ بتا سکتا۔

دروازہ کھلا اور لیو اندر آیا۔ ہمیشہ کی طرح تر و تازہ عمدہ لباس پہنے ہوئے شیو کیے ہوئے۔ "مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں میرا خیال ہے میں ہی جلدی آ گئی ہوں۔"

وہ روز کی طرح اسی صوفے پر بیٹھ گیا جس پر وہ اس کی منتظر بیٹھی تھی لیکن اس سے لیو کے ساتھ بیٹھنا برداشت نہ ہوا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "لیو اگر تم برا نہ مانو تو آؤ سیر کو چلیں۔ آج میرا دل بے چین سا ہو رہا ہے۔"

"ڈر تو نہیں رہی ہو؟"

"کس سے؟...... تم سے؟...... بے وقوف نہ بنو!"

"تو پھر ہوا کیا ہے؟"

وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ازابل نے سوچا' شاید اس نے تاڑ لیا کہ میرے دل میں کیا ہے۔

"پتا نہیں۔" اس نے جواب میں کہا" ویسے تو کچھ بھی نہیں ہوا' مگر دل بے چین سا ہے۔ شاید تھک گئی ہوں گیا تو کچھ بھی نہیں' بس! عروسی جوڑا پہن کر دیکھنے کے لیے کچھ دیر کھڑی رہی ہوں۔"

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔" آؤ چلیں!"

ازابل کو یقین ہو گیا کہ لیو نے اس کی حالت کا اندازہ کر لیا ہے۔

رات خاصی گرم تھی' مگر وہ شال لانے کا بہانہ کر کے اوپر کی منزل میں چڑھ گئی۔ سرخ اونی کوٹ ہاتھ میں اٹھا کے وہ آئینے کے سامنے اپنی ایک جھلک دیکھنے کے لئے رکی تو اسے اپنا چہرہ بھوت کی طرح سفید دکھائی دیا۔ واقعی اس کا چہرہ دھلے کپڑے کی طرح سفید پڑا ہوا تھا۔

لیو دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔

اب تو ازابل کو یقین ہی ہو گیا' وہ تاڑ گیا ہے۔ اسے بیک وقت افسوس بھی ہوا اور خوشی بھی' خوشی اس بات کی کہ اب مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے گا' اور افسوس اس بات کا کہ بے چارے کو اس صدمے کا اندازہ نہ تھا' جو اسے پہنچنے کو تھا' لیکن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس وقت تک وہ بات نہیں کہے گی جب تک وہ کہیں دور نہیں نکل جاتے۔ تاریک رات میں' کسی سنسان سڑک پر' وہ اسے بتائے گی کہ نہ جانے' کس طرح محبت کا جذبہ اچانک اس کے دل سے رخصت ہو گیا ہے۔ اس جذبے کے بغیر وہ خود کو سرد مہر اور خالی خالی محسوس کر رہی تھی۔ وہ تہہ دل سے چاہتی تھی کہ یہ جذبہ پھر سے پیدا ہو جائے۔ کاش' وہ اسے پھر سے پیدا کر سکے! اگر وہ جانتی ہوتی کہ محبت کیسے پیدا کی جاتی ہے تو ضرور پیدا کر لیتی' کیونکہ اس کے سوا باقی ہر بنا پر وہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے پھر سے پسند کر سکتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے پسند کرے۔ پسندیدگی کا وہی پرانا تسلی بخش جذبہ پھر سے پیدا ہو جائے' جو دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے ہمیشہ سے تھا' اور شاید ان کے لیے وہی کافی تھا۔

جب وہ کار چلانے لگا تو اس نے پوچھا" تم کس طرف جانا پسند کرو گی؟"

"بس' شہر سے باہر نکل چلو!"

گاڑی چلتی رہی' وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ وہ تاروں بھری' سیاہ رات میں شمال کی طرف روانہ ہوئے۔ رات کی ہلکی ہلکی گرم ہوا ان کے چہروں پر لگ رہی تھی' وہ ازابل کی گھنی زلفوں کو اڑا رہی تھی' اس کا سفید ریشمی فراک پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس افراتفری کی وجہ سے ان دونوں کو بات نہ کرنے کا موقع مل گیا۔

ازابل سوچ رہی تھی' اسے معلوم تو ہو ہی گیا ہے' اب تو بس منہ سے میرے کہنے کی کسر رہ گئی ہے۔

اس کا گلا خشک ہو گیا اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اس بات کو اس لمحے پر ٹالتی رہی جب اسے لیو سے کہنا ہی پڑ جائے کہ گاڑی کو

یہاں تھوڑی دیر کے لیے روک لو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔

اس اثناء میں جب وہ اس لمحے کا انتظار کر رہی تھی' اسے وہی...... تقریباً ویسے ہی الفاظ لیو کے منہ سے سن کر حیرت ہوگئی۔

''ازابل! میں یہاں گاڑی روکتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ وقت نکل جائے...... میں وہ بات تم سے کہہ دینا چاہتا ہوں۔''

اس نے سڑک کے کنارے ایک بوڑھے سے درخت کے نیچے گاڑی روک لی۔ اوپر ستارے تھے اور چاروں طرف ان قصبوں اور بستیوں کی روشنیاں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں' جو شہر کے آس پاس آباد تھیں۔

''ہاں لیو!'' ازابل نے کہا' لیکن وہ حیران تھی کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ بات کیسے کہوں!''

وہ سگریٹ کے لیے جیب ٹٹول رہا تھا۔ آخر وہ مل گیا۔

''پیوگی؟'' اس نے ازابل سے پوچھا۔

''نہیں' شکریہ۔''

''پی لو' اس سے میرے لیے وہ بات کہنا آسان ہو جائے گا۔''

ازابل نے سگریٹ لے لیا' لیو نے سلگا دیا۔

شعلے کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ لیو کا چوڑا چکلا ہاتھ کانپ رہا ہے۔

''مجھے یہ بات ہفتوں پہلے کہہ دینی چاہیے تھی......'' لیو نے کہنا شروع کیا اور اس کی آواز اچانک بھرا گئی۔ ''مگر' چونکہ اس وقت نہیں کہہ سکا' اس لیے اب کہہ دینی چاہیے۔ اسی میں میرا اور تمہارا' دونوں کا بھلا ہے۔ ازابل! میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔''

ضرب لیو نے لگائی۔ اس ضرب سے چوٹ ازابل کو لگی' مگر ازابل کو حیرت اس بات پر تھی کہ اسے چوٹ سے صدمہ کیوں ہوا۔ وہ سناٹے میں آئی ہوئی بیٹھی تھی۔ اسے تو یہ چاہیے تھا کہ فوراً چیخ اٹھتی ''لیو! کیا تم بھی یہی محسوس کر رہے ہو؟ میں تو تم سے یہی کہنے کی ہمت ہی کرتی رہ گئی۔''

لیکن اس کی زبان سے ایک حرف بھی نہ نکلا۔ وہ دم بہ خود تھی۔ وہ دل ہی دل میں کھول رہی تھی...... اسے اذیت پہنچ رہی ہے تو پہنچے دو' میں بھی تو اذیت میں ہوں!

وہ اسی طرح بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا ''میری عقل کام نہیں کر رہی ہے۔ مجھے خود سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ میں جانتا ہوں اور محسوس بھی کر رہا ہوں کہ تم وہی پیاری پیاری اور حسین وجمیل لڑکی ہو جسے میں اپنی دلہن بنانا چاہتا ہوں۔ تم میں وہ سب کچھ ہے' جو مجھے پسند ہے۔ مجھے تم پر ناز ہے۔ تم جیسی خوبصورت' ذہین اور دل نواز بیوی سے میری زندگی کو چار چاند لگ جائیں گے' لیکن میں اس قابل نہیں ہوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

وہ بولی ''تم نے بڑا ظلم کیا کہ پہلے یہ بات نہ کی! تمہیں جس وقت یہ محسوس ہوا تھا کہ مجھ سے شادی نہیں کرنی چاہیے' اسی وقت کہہ دینا چاہیے تھا۔''

اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "ہاں یہ میری زیادتی تھی' لیکن اس وقت میرا خیال یہ تھا کہ یہ احساس عارضی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ اکثر لوگوں پر شادی سے پہلے ایسی حالت طاری ہوا کرتی ہے' مگر گزر جاتی ہے۔ میں سمجھا' میری یہ حالت بھی بدل جائے گی۔ میرا خیال ہے' گزشتہ عشرے ہی میں......"

"کیا اس دن' جب تم نے مجھے عروسی جوڑا پہنے دیکھا تھا؟" ازابل نے پوچھا۔

لیو نے پہلے تو تامل کیا' پھر بولا "اف! ہاں' اسی دن' میرا خیال ہے' وہی لمحہ تھا' جب مجھے پتا چلا کہ میرے دل میں کیا ہے۔"

"جب تم نے مجھے دلہن بنی ہوئی دیکھا؟" ازابل بولی۔

اس نے عجز و انکسار سے کہا "مجھے خود سے نفرت ہو رہی ہے۔ سارا الزام مجھی پر آتا ہے۔ میں سب کے سامنے اعتراف قصور کروں گا۔"

"نہیں......" ازابل جلدی سے بولی "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

سچ سچ' وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً محسوس کیا کہ اسے چاہیے' ازابل کو پہل کرنے دے۔ منگنی توڑنے کا حق اسی کو حاصل ہونا چاہیے' لیکن کیا وہ ایسا کرے گی؟

"میں وہی کروں گا' جو تم چاہو گی۔" لیو نے کہا۔

وہ بولی "مہربانی کر کے مجھے گھر پہنچا دو۔"

لیو نے کار موڑی اور اسے بڑی تیز رفتاری سے سنسان سڑک پر دوڑانے لگا۔ دونوں پہلو بہ پہلو خاموش بیٹھے تھے' لیو افسردہ' ازابل غصہ ضبط کیے ہوئے۔ کیوں؟...... آخر کیوں وہ فوراً نہ بول سکی؟ اور کیوں نہ اس نے اپنی مدافعت کی؟ اس لیے کہ یہ صدمہ تو ہمیشہ رہے گا۔ وہ یہ بات کس طرح بھول سکے گی کہ اس نے لیو کی محبت اپنے دل سے نکال دی تھی' اور پھر جب بھی یہ محبت اس کے دل میں پیدا ہوگی تو اسے قبول کرنے میں اس بنا پر دشواری ہوگی کہ خود میں کسی کوتاہی کا غم اسے کھاتا رہے گا' جس کی وجہ سے لیو کی محبت سرد ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ اب وہ لیو سے محبت نہیں کرتی تھی' لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی تھی۔ اس میں اور کسی مرد کے کسی عورت کو ٹھکرا دینے میں بڑا فرق ہے۔ عورت اس قسم کا حادثہ زندگی بھر نہیں بھولتی۔ اب اس میں اور لیو میں کبھی دوستی نہیں ہو سکتی۔ اسے لیو کا وہ پہلو نظر آ گیا تھا' جو ناقابل فراموش تھا۔ محبت کے لیے نہ سہی' اس کے نسائی غرور کے لیے تو یہ زخم سدا ہرا رہے گا' اور ہمیشہ رستا رہے گا۔

"مجھے ہمیشہ خود سے نفرت رہے گی۔" وہ تاریکی میں بڑبڑایا۔

ازابل نے جواب میں کچھ بھی نہ کہا...... یہ خود سے نفرت کرتا رہے گا تو کرتا رہے۔ اسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس نے ایک نفرت انگیز حرکت کی تھی' لیکن اسے یہ بات یاد رکھنے کا حق بھی پہنچتا ہے کہ مرد ماضی کا نہیں' حال کا خیال کیا کرتے ہیں' لیکن حیرت ہے کہ پرانی روایات کتنی پائیدار ہیں۔ یہ تصور قرین انصاف بھی ہے اور اس میں رحم دلی بھی ہے کہ کسی مرد کو منگنی توڑنے کا حق نہیں ہونا چاہیے۔ اسے شرافت سے کام لے کر یہ حق اپنی منگیتر کو استعمال کرنے دینا چاہیے' کیونکہ اس کے پاس محبت اور نسائی غرور کے سوا اور ہوتا بھی کیا ہے۔ مرد کا فرض ہے کہ ان دونوں کو عورت

ہی کے پاس رہنے دے۔ باقی دنیا تو اس کی ہوتی ہی ہے۔ وہ یہ سوچ کر جھلا اٹھی کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی مگر مرد کا یہ غلبہ اب بھی برقرار ہے۔

میل پر میل گزرتے چلے گئے۔ ایک گھنٹے بعد وہ ازابل کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اوپر کی منزل کی کھڑکیاں تاریک تھیں۔ ازابل کے والدین سو چکے تھے۔ وہ بھی اس دل خراش خبر کا اعلان ملتوی کر کے اپنے کمرے میں جا کر سو سکتی تھی۔

''ازابل! میں اندر چلوں؟'' لیو نے افسردہ انکسار سے پوچھا۔

''نہیں......'' ازابل نے کہا'' شکریہ۔''

''کوئی بات ہے کہ تمہیں جانے دینے کو دل نہیں چاہتا۔''

''لیکن تم نے مجھے چھوڑ دیا ہے...... ہے نا؟ اب اندر چلنے یا نہ چلنے سے کیا فرق پڑے گا! شب بخیر!''

''ازابل!''

''لیو! میں سمجھنے کی کوشش کروں گی' مجھے کار سے باہر نکلنے دو۔''

لیکن لیو نے گاڑی کا دروازہ نہ کھولا۔ وہ اسے اس طرح روکے رہا جیسے وہ اسے تنہا نہیں جانے دینا چاہتا ہو۔

''میرا جی چاہتا ہے کہ...... ازابل! میں تم سے بہت مانوس ہوں۔ میں تمہیں سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے نفرت کرو...... اور اگر تم نے مجھ سے نفرت کی تو میں یہ برداشت نہیں کر سکوں گا۔ ہمیں باتیں کرنی چاہئیں یا پھر کچھ اور کرنا چاہیے۔ میری تمہاری ساری عمر دوستی رہی ہے۔ میں تمہیں کھو نہیں سکتا' مجھے اس سے شدید صدمہ پہنچے گا...... اور اگر ہم دونوں دوست نہ رہے ازابل! تو ہمارے خاندان کیونکر دوست رہ سکیں گے۔ ہم ان کی دل شکنی نہیں کر سکتے! کیوں؟...... کر سکتے ہیں؟''

وہ اتنے خلوص سے اتنے جذبے سے اور معقولیت کی تڑپ لیے ہوئے بات کر رہا تھا کہ ازابل کو اس پر پیار سا آنے لگا' مگر محبت کی حد تک نہیں۔

وہ ساکت بیٹھی سامنے کی روشن سڑک کو دیکھ رہی تھی' اور اپنے جذبات سے پُرغضب ناک دل پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی...... لیو ٹھیک کہہ رہا تھا کہ سب کی دل شکنی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر اس نے لیو کو اس وقت اس خیال میں رہنے دیا کہ قصور سراسر اس کا ہے تو پھر عمر بھر یہ بات نبھانی پڑے گی' اور اگر اس نے صاف دلی سے اسے معاف کر دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ ان کے تعلقات پہلے جیسے رہیں گے' اور منگنی ٹوٹنے سے ان میں کوئی فرق نہیں پڑے گا تو بھی اوروں کے لیے تو صورتحال بدلے گی ہی۔ اس کے والدین آئندہ نہ تو لیو کی صورت تک دیکھنے کے روادار ہوں گے اور نہ اس کے خاندان سے میل جول رکھنا پسند کریں گے' وہ یہ نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو یہ چاہتی تھی کہ صورتحال ویسی ہی رہے جیسی منگنی سے پہلے تھی' اس کا تو ایک ہی راستہ تھا کہ وہ لیو کو ساری بات من وعن بتا دے۔ محض نسائی غرور کے لیے اسے سزا دینا مناسب نہ تھا۔ اور یہ غرور بھی تو فرسودہ تھا' ان عورتوں کا غرور جو مر کھپ چکی تھیں۔ یہ وراثت ایسی تھی' جسے قبول کرنے کے لیے وہ تیار نہیں تھی' خس کم جہاں پاک!

''لیو!'' اس نے اچانک کہا'' ایک حد تک میں بھی قابل نفرت ہوں۔ میں بھی تمہیں وہی بات بتانے کو تھی جو تم نے مجھے بتائی...... کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔''

لیو کو یہ بات سمجھنے میں کافی دیر لگی۔

''حد ہوگئی! اس نے ایک دم نعرہ مارا۔ تم نے پہلے ہی یہ بات کیوں نہ کہہ دی؟ میرا خون خشک ہوتا رہا۔''

''مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔'' ازابل نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ ''لیکن تم نے اچانک یہ بات کہہ کر مجھے حیران کر دیا۔ مجھے گمان تک نہ تھا کہ تم......''

''بس کرو!'' اس نے جیسے حکم دیا۔ ''محبت ہونے نہ ہونے کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ میں ایک ایسی ہستی کو کھونے کی ہمت نہیں رکھتا جسے میں اتنا چاہتا ہوں۔''

''میں بھی تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔'' وہ بولی ''ہمیں ان سے یہی کہنا پڑے گا کہ ہم نے یہ فیصلہ باہمی رضامندی سے کیا ہے...... اور لیو!......''

''ہاں۔''

''ہمیں اسی طرح ایک دوسرے سے ملتے رہنا چاہیے جس طرح منگنی سے پہلے ہم ملتے جلتے رہے ہیں اور ہمیں اپنے خاندانوں کو بھی پہلے کی طرح ایک دوسرے کے قریب رکھنا ہوگا' کم از کم کچھ ہی عرصے کے لیے...... اور جب ہماری شادیاں ہو جائیں گی' تمہاری کسی اور لڑکی سے...... اور......''

''میرا خیال ہے' اس میں بہت دیر لگے گی۔'' لیو نے کہا اور رومال جیب سے نکال کر پیشانی کا پسینا پونچھنے لگا۔

''پگلا......!'' ازابل کے منہ سے نکلا' اور وہ ہنسی۔ آج وہ کئی دن بعد ہنسی تھی' پھر بات پوری کرتے ہوئے کہنے لگی ''میں کسی اور سے بیاہ دی جاؤں گی۔ پھر ہم اگلی نسل تک دوست بنے رہیں گے۔ لیو! کیا بتاؤں میں تمہیں کتنا پسند کرتی ہوں!''

لیو اٹھا' اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکلا۔ پھر دونوں ساتھ ساتھ سیڑھیاں چڑھے۔

لیو نے گھنٹی بجائی تو دروازہ جیسے پذیرائی کے لیے فوراً کھل گیا۔ یہی اس کا معمول تھا۔ جہاں تک اسے یاد تھا۔ دروازہ ہمیشہ اسی طرح کھلتا تھا۔ ازابل کی سالگرہ کی تقریب میں شریک ہونے کے لیے وہ جب بھی آتا' اس دروازے کی دہلیز پر اسی طرح کھڑا ہوتا۔ اس وقت دراوزہ کسی قلعے کے پھاٹک کی طرح بند ہوتا' لیکن اس کے لیے کھل جاتا' اور وہ اندر داخل ہو جاتا' کیونکہ اس گھر کے سب لوگ اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔

''اندر آ جاؤ!'' ازابل نے کہا ''محض اس لیے کہ ہم شادی نہیں کر رہے' اتنی جلد رخصت ہو جانے کی ضرورت نہیں۔''

''ہش......!'' لیو نے آہستہ سے کہا ''کہیں وہ سن نہ لیں!''

''کون؟'' ازابل نے پوچھا۔

''تمہارے گھر کے لوگ۔''

''انہیں تو معلوم ہو ہی جائے گا؟'' ازابل نے یوں کہا جیسے اسے ایسا ہونے کا یقین ہی نہیں ہے۔

اس وقت وہ بلوریں شمع دان کے نیچے کھڑا تھا۔ ازابل اسے تعجب سے گھور رہی تھی۔

"لیو!......" اس نے پوچھا "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"پتا نہیں۔" لیو نے جواب دیا "البتہ کچھ عجیب سا ضرور محسوس ہو رہا ہے۔"

"کیسے؟" ازابل نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

واقعی لیو اس وقت عجیب سا نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اچانک سفید پڑ گیا تھا۔

"ہم گھنٹے بھر تک کس کے بارے میں باتیں کرتے رہے ہیں ازابل؟" اس نے پوچھا۔

"شادی نہ کرنے کے بارے میں۔" ازابل نے جھٹ سے جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہے۔" لیو بولا "لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ......ہم شادی کیوں کرنا چاہتے تھے؟"

"تمہیں ہی معلوم ہو گا۔" ازابل نے جواب میں کہا۔ "تمہیں نے مجھ سے شادی کی درخواست کی تھی۔"

"اس کی بہت سی وجوہات تھیں۔" یہ کہہ کر لیو ذرا رکا' پھر اچانک جوش سے کہنے لگا "اور وہ مناسب تھیں اور اب بھی ہیں' ایک تو یہ کہ ہمارے خاندان ایک دوسرے سے اتنے گھلے ملے ہوئے ہیں' پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے ہیں۔ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتیں کہ میں کسی اجنبی عورت سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ میں کسی ایسی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں' جسے میں جانتا ہوں۔۔۔ اور میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ تمہیں جانتا ہوں۔"

ازابل نے منہ پھیر لیا۔

"اجنبی......" لیو بڑبڑایا...... "اجنبی گھر میں شادی کرنا مجھے پسند نہیں۔"

"میں بھی کسی اجنبی سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

"کئی باتیں قابل غور ہیں۔" لیو نے بات جاری رکھتے ہوئے اس طرح کہا جیسے کسی مسئلے پر بحث کر رہا ہو۔ "مجھے ایک فائدہ یہ ہے کہ اگر کسی ایسی عورت سے شادی کروں گا جسے پہلے سے نہ جانتا ہوں گا تو اسے بعد میں جاننا پہچاننا پڑے گا اس کے بعد ہی شادی کو حقیقی معنوں میں شادی کہا جا سکے گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"تمہیں ہی معلوم ہو گا۔" ازابل نے کہہ دیا۔

"ہاں' مجھے معلوم ہے۔" لیو نے بڑے جوش سے کہا "تمہارے دروازے پر پہنچنا' اور میں سیکڑوں ہی دفعہ آیا ہوں' تو اپنے لیے دروازہ کھلا پانا' اس کا کچھ مطلب ہوتا ہے' یہ ہال' یہ قدیمی شمع دان' اور تمہارا یہاں کھڑے ہونا' ہم دوسرے جوڑوں سے برسوں آگے ہو گئے۔۔۔ ہو گئے یا نہیں؟"

ازابل نے سوچا اس کی یہ کیفیت ایسی ہے کہ دیکھنے والے کا دل پگھل جائے۔ اگر وہ بڑا نہ ہوتا تو رو دیتا۔ پہلے اس نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا پھر نگاہ بھر کر اور پھر دھیمی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلنے لگی۔ یک بخت اس نے قہقہہ لگایا۔

"لیو! میں بے وقوف ہوں یا تم چغد ہو؟"



"دونوں!" اس نے دانت نکالے۔ اس لمحے اسے محسوس ہوا کہ پیار کرنے والوں کی دنیا ایک ہی ہوتی ہے۔ آخر پیار کیا ہوتا ہے؟ دو دلوں کا ایک ہو جانا۔

سیڑھیوں پر انہوں نے قدموں کی آہٹ سنی تو چونکے۔ ازابل کی ماں شب خوابی کے لباس میں کھڑی مسرت سے لبریز لہجے میں کہہ رہی تھی:

"شمع دان کے نیچے تم دونوں کھڑے کس قدر خوبصورت لگ رہے ہو۔ میں مسرت کے ان لمحات میں مخل نہیں ہونا چاہتی تھی مگر کیا تمہارے خیال میں......"

"یقیناً" میں رخصت ہونے ہی کو تھا' لیو نے جلدی سے کہا۔

"تم دونوں کی جوڑی سلامت رہے۔ ایسی بہت سی راتیں آئیں گی۔ خدا تمہیں لمبی عمر عطا کرے۔" انہوں نے دعا دی۔

ازابل نے لیو سے کہا "اچھا۔ شب بخیر!"

"شب بخیر! میں حسب معمول کل پھر آؤں گا"

"ضرور!" ازابل نے جواب دیا۔

☆......☆......☆

پناہ گزین

نادائن گورڈیمر 20 نمبر 1923ء کو جوہانسبرگ کے مضافاتی قصبے ایسٹ رینڈ مائننگ میں تولد ہوئیں۔ ان کے والدین یہودی تارکین وطن میں سے تھے جو جنوبی افریقہ میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ان کے والد ایسوڈور ایک گھڑی ساز تھے جن کا آبائی وطن لتھوینیا تھا جبکہ والدہ نان گورڈیمر لندن سے تھیں۔ نادائن گورڈیمر نے کیتھولک کانونٹ سکول میں تعلیم حاصل کی، تاہم ان کی والدہ انہیں زیادہ تر گھر میں مقید رکھتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس بچی کا دل کمزور ہے۔ گھر میں تنہائی کاٹنے کے لئے نادائن گورڈیمر نے کتابوں میں پناہ ڈھونڈی اور چھوٹی عمر ہی میں بچوں کی کہانیاں لکھنے کی طرف مائل ہو گئیں۔ 1938ء میں سولہ سال کی عمر میں بڑوں کے لیے کہانیاں تخلیق کرنا شروع کیں۔ ان کی کہانیاں جنوبی افریقہ کے مقامی ادبی جرائد میں شائع ہوئیں جنھیں انہوں نے فیس ٹو فیس (Face to Face) کے عنوان سے 1949ء میں کتابی شکل میں چھپوایا۔ 1951ء میں ان کی ایک کہانی "نیویارکر" نے اشاعت کے لیے قبول کی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا اور دیگر بین الاقوامی شہرت کے حامل جرائد بھی ان کی تخلیقات شائع کرنے لگے۔ ان کا اولین ناول دی لائنگ ڈیز (The lying days) 1953ء میں منظر عام پر آیا جسے عالمی ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا۔ انہوں نے 1954ء میں رین ہولڈ کیسرر سے شادی کی جو ایک معزز و ممتاز آرٹ ڈیلر تھے۔ ان کی اپنی ذاتی آرٹ گیلری تھی۔ علاوہ ازیں جنوبی افریقہ میں آرٹ کے فروغ کے لیے قومی سطح پر بھی ان کی خدمات مستعار لی گئیں۔ ان کی قابل رشک ازدواجی زندگی کا اختتام 2001ء میں ہوا جب مسٹر رین ہولڈ نے نمونیا میں مبتلا ہو کر داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہ ان کی تیسری جبکہ نادائن گورڈیمر کی دوسری شادی تھی۔ ان کا بیٹا ہوگو 1955ء میں پیدا ہوا تھا۔ آج کل وہ نیویارک میں فلم سازی میں مصروف ہے۔ نادائن گورڈیمر نے اپنے بیٹے کی دو 'ڈاکومنٹری' فلموں میں اعانت بھی کی ہے۔

نادائن گورڈی کی تحریروں سے جنوبی افریقہ کی سرزمین سے بدرجہ اتم محبت اور نسل پرستی کے خلاف بھرپور احتجاج جھلکتا ہے۔ وہ اس معاملے پر سیاست میں بھی سرگرم رہیں۔ اور 1962ء میں نیلسن منڈیلا کے دفاعی وکلاء کے ساتھ مل کر کام کیا۔ جب 1990ء میں منڈیلا رہا ہوئے تو جن شخصیات سے انہوں نے سب سے پہلے ملاقات کی ان میں نادائن گورڈیمر بھی شامل تھیں۔ ان کی ادبی خدمات کے صلے میں انہیں 1991ء میں ادب کا نوبل انعام عطا کیا گیا۔ وہ ابھی حیات ہیں اور جوہانسبرگ میں رہتی ہیں۔

☆......☆......☆

ہماری ماں اسی شب بازار گئی تو پھر واپس نہ لوٹی۔ اس کے ساتھ کیا ہوا' ہمیں علم نہیں۔ میرے باپ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ پیش آیا تھا مگر وہ تو جنگ لڑنے والوں میں تھا۔ ہم بھی حالت جنگ ہی میں تھے مگر ہم ابھی بچے تھے اور اپنے دادا دادی کی طرح نہتے۔ حکومت ڈاکوؤں کے خلاف برسرپیکار تھی۔ انہوں نے ہر جگہ لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ان سے بچنے کے لیے ہم یوں خائف ہو کر بھاگتے جیسے مرغیاں کتوں سے جان بچانے کو بھاگتی ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائیں۔ ہماری ماں اس لیے بازار گئی تھی کہ اسے کسی نے بتایا تھا' بازار میں کھانے کا تیل مل رہا ہے۔ ہم اس بات سے بہت خوش تھے کیوں کہ ہم نے بہت دن سے تیل چکھا تک نہیں تھا۔ ماں کو شاید تیل مل گیا تھا اسی لیے کسی نے اندھیرے میں اسے قتل کر دیا اور اس سے تیل چھین لیا یا شاید اس کی ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہو گئی ہوگی۔ اگر آپ کا بھی کبھی ڈاکوؤں سے سامنا ہو تو وہ آپ کو بھی مار ڈالیں گے۔

وہ دوبار ہمارے گاؤں میں آئے' ہم بھاگ کر جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ جب وہ چلے گئے تب ہم جھاڑیوں سے نکل کر گھروں میں آئے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ ہر چیز کا صفایا کر چکے ہیں۔

لیکن تیسری دفعہ انہیں گھر میں کوئی چیز نہیں ملی نہ تیل نہ کوئی اور کھانے کی چیز۔ انہوں نے گھر کی چھپر اور پرال کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے ہمارے گھر کی چھت زمین پر آ رہی۔ میری ماں ٹین کی چادروں کے کچھ ٹکڑے لے آئی تھی جن سے گھر کا کچھ حصہ ڈھک دیا گیا تھا۔ اس رات ہم اسی چھت کے نیچے بیٹھے اپنی ماں کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔

ہم کام کاج کے سلسلے میں بھی باہر نکلنے سے ڈرتے تھے کیونکہ ڈاکو واقعی پھر آ گئے تھے۔ ہمارے گھر میں تو خیر نہیں آئے' بے چھت کا گھر انہیں سامان اور انسانوں سے خالی نظر آیا مگر پورے گاؤں میں وہ دھماچوکڑی سے دندناتے پھرے۔ ہمیں لوگوں کی چیخ پکار اور بھگدڑ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ ہم تو اپنی ماں کی ہدایت کے بغیر بھاگنے سے بھی ڈرتے تھے۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں منجھلی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی میرے پیٹ سے ایسا چمٹا ہوا تھا جیسے بندریا کا بچہ اس کے پیٹ سے چمٹا ہوتا ہے۔ اس کے دونوں بازو میری گردن کے گرد تھے اور ٹانگیں میری کمر کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں۔ پوری رات میرا بڑا بھائی گھر کے جلے ہوئے شہتیروں میں سے لکڑی کا ایک ٹکڑا اپنے ہاتھوں میں تھامے رہا تاکہ اگر ڈاکو اسے دیکھ لیں تو وہ خود کو ان سے بچا سکے۔

ہم پورے دن اپنی ماں کا انتظار کرتے رہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے۔ گاؤں میں نہ تو کوئی اسکول باقی بچا تھا نہ کوئی گرجا گھر' اس لیے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کب اتوار ہے' کب سوموار۔

سورج غروب ہوتے وقت دادی اور دادا آ گئے۔ کسی نے انہیں اطلاع دے دی تھی کہ ہم بچے گھر میں اکیلے ہیں۔ ماں واپس نہیں آئی۔ میں ہمیشہ دادا سے پہلے دادی کا ذکر کرتی ہوں' کیونکہ یہ ترتیب اسی طرح ہے۔ دادی لحیم شحیم اور قد کاٹھ والی عورت ہے' وہ ابھی زیادہ بوڑھی بھی نہیں ہوئی ہے۔ دادا بے حد چھوٹا ہے۔ سوچ ہی نہیں سکتے کہ وہ اپنی ڈھیلی ڈھالی پتلون کے کس کونے میں ہے۔ وہ خواہ مخواہ مسکرانے لگتا ہے' یہ سمجھے بغیر کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کے بال ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے انہیں صابن کے جھاگ سے بھرا ہوا چھوڑ دیا گیا ہو۔ دادی ہمیں اپنے مکان میں لے گئیں' یعنی مجھے' چھوٹے بھائی' بڑے بھائی اور دادا کو۔ ہم بہت ڈرے ہوئے رہے' میرے چھوٹے بھائی کے سوا جو دادی کی پیٹھ پر سو رہا تھا۔ ہمیں

ڈر تھا کہ کہیں راستے میں ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔

بہت دن تک ہم دادی کے مکان میں ماں کا انتظار کرتے رہے' شاید ایک مہینے تک۔ ہم بھوکے رہتے تھے' ہماری ماں بھی نہیں آئی تھی' ہمیں انتظار تھا کہ وہ آ کر ہمیں یہاں سے لے جائے' اس دوران دادی کے پاس ہمارے لیے کھانے کی کوئی چیز نہ تھی' نہ دادا کے لیے نہ خود اپنے لیے۔ ایک عورت نے جس کی چھاتیوں میں دودھ تھا' اپنا تھوڑا سا دودھ میرے چھوٹے بھائی کو دیا۔ اپنے گھر میں تو وہ ہماری طرح دلیا ہی کھاتا تھا۔ دادی کئی بار ہمیں اپنے ساتھ لے کر جنگلی ساگ کی تلاش میں نکلی لیکن گاؤں کا ہر فرد اسی کی تلاش میں تھا اس لیے ساگ کا ایک پتا بھی کہیں باقی نہ بچا تھا۔

دادا چند نوجوانوں کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ہماری ماں کی تلاش میں گیا مگر وہ اسے نہ مل سکی۔ دادی مایوسی سے دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر بین کرنے لگی۔ میں بھی بین میں شامل ہو گئی۔ ایک دفعہ کچھ لوگ تھوڑی سی مچھلیاں وغیرہ کھانے کے لیے لے آئے تھے مگر دو دن بعد پھر وہی فاقہ۔ دادا کے پاس پہلے تین بھیڑیں' ایک گائے اور ترکاریوں کا ایک باغیچہ تھا۔ بھیڑیں اور گائے بہت دن ہوئے ڈاکو لے گئے تھے' وہ بھی تو آخر بھوکے تھے۔ بوائی کا وقت آیا تو کسی کے پاس بیج ہی نہیں تھے۔

آخر ان دونوں نے طے کر لیا' بلکہ دادی نے طے کیا کہ ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ دادا لاکھ چیخا چلایا اور ادھر ادھر پھرا لیکن دادی نے ذرا پروا نہ کی۔ ہم بچے بہت خوش تھے۔ ہم ایسی جگہ سے واقعی چلے جانا چاہتے تھے جہاں نہ ماں تھی' نہ کھانا تھا۔ وہاں جانا چاہتے تھے جہاں ڈاکو نہ ہوں' کھانا ہو۔ ہم یہ سوچ کر خوش تھے کہ کہیں بہت دور کوئی ایسی جگہ بھی ہے۔

دادی نے گرجا گھر میں حاضری کے لیے اپنی مخصوص پوشاک کے بدلے مکئی کے خشک دانے لے لیے اور انہیں ابال کر ایک پرانے کپڑے میں باندھ لیا۔ ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو دانے ہمارے پاس تھے۔ دادی کا خیال تھا کہ راستے میں دریا کا پانی مل جائے گا لیکن کوئی دریا نہیں ملا۔ ہمیں اتنی سخت پیاس لگی کہ واپس مڑنا پڑا لیکن مڑ کر ہم دادی کے گھر نہیں آئے بلکہ ایک ایسے گاؤں میں رک گئے جہاں پانی کا بمبا تھا۔

دادی نے اپنی ٹوکری کھولی جس میں اس نے کپڑے اور مکئی کے دانے ٹھونس رکھے تھے پھر اس نے اپنے جوتے بیچ کر پانی کے لیے پلاسٹک کا ایک بڑا ڈرم خرید لیا۔ میں نے پوچھا "دادی! تم جوتوں کے بغیر گرجا کیسے جاؤ گی؟"

اس نے جواب میں صرف یہ کہا۔ "سفر لمبا ہے۔ ہم زیادہ سامان نہیں اٹھا سکتے۔"

اس گاؤں میں ہمیں اور لوگ بھی ملے جو نقل مکانی کر رہے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ وہ ہمارے مقابلے میں منزل سے زیادہ واقف دکھائی دیتے تھے۔

منزل تک پہنچنے کے لیے ہمیں کروگر پارک سے گزرنا تھا۔ ہم کروگر پارک کے بارے میں پہلے سے جانتے تھے۔ وہ ایک طرح پوری کی پوری حیوانوں کی مملکت تھی۔ ہاتھی' شیر' گیدڑ' لگڑ بھگے' تیندوے' مگرمچھ' غرض ہر قسم کے جانور تھے وہاں۔ ان میں سے کچھ تو ہمارے علاقے میں بھی تھے خاص طور پر لڑائی سے پہلے۔ دادا کو یاد ہے' ہم بچے تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اب ڈاکوؤں نے سارے ہاتھی مار ڈالے تھے اور ان کے دانت بیچ دیے تھے۔ ڈاکوؤں اور ہمارے سپاہیوں نے سارے ہرن بھی کھا لیے تھے۔ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی دونوں ٹانگوں سے معذور تھا'

اس کی ٹانگیں دریا میں رہنے والے ایک مگرمچھ نے کھائی تھیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمارا ملک انسانوں کا ملک ہے' جانوروں کا نہیں۔ ہمیں کروگر پارک کے متعلق بہت کچھ معلوم تھا کیونکہ ہمارے بعض لوگ اپنے گھروں سے نکل کر ایسی جگہوں پر کام کرنے جاتے تھے جہاں گورے لوگ جانور دیکھنے کے لیے آ کر ٹھہرتے تھے۔

ہم نے پھر سفر شروع کیا۔ قافلے میں کچھ عورتیں تھیں اور کچھ میری طرح کے بچے۔ عورتیں تھک کے بیٹھتیں تو چھوٹے بچے ان کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے۔ ایک آدمی ہم سب کو کروگر پارک کی طرف لے کر چلا۔ "کیا پارک آ گیا؟ کیا پارک آ گیا؟" میں دادی سے بار بار پوچھ رہی تھی۔ دادی نے جواب نہیں دیا' اس آدمی نے بتایا کہ ابھی نہیں آیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ باڑھ کے گرد سے گھوم کر جانے میں بہت لمبا راستہ طے کرنا پڑے گا۔ باڑھ کے بارے میں اس نے یہ بھی کہا کہ اسے ہاتھ لگاتے ہی تم مر جاؤ گے' اسے چھوتے ہی تمہاری کھال جل بھن کر کباب ہو جائے گی' بالکل اس طرح جیسے شہروں میں بجلی کے کھمبوں کے اوپر تنے ہوئے تار چھونے سے ہوتا ہے۔ میں نے مشن اسپتال میں لوہے کے ایک ڈبے پر سر کا وہ نشان بنا ہوا دیکھا تھا' جس پر نہ آنکھیں تھیں نہ کھال نہ بال۔ بعد میں مشن اسپتال بھی دھماکے سے اڑ گیا۔

چلتے چلتے نہ معلوم کتنا وقت گزر گیا۔ جب میں نے راستے میں پھر پوچھا کہ کیا پارک آ گیا؟ پتہ چلا کہ ہاں' پارک آ گیا اور ہم ایک گھنٹے سے کروگر پارک کے اندر ہی چل رہے ہیں۔ مگر یہ تو دیکھنے میں انہی جھاڑیوں کی طرح لگتا تھا جس میں ہم دن بھر چلتے رہے تھے۔ یہاں ہمیں کوئی جانور بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس بندر تھے اور چڑیاں تھیں جیسی ہمارے گھر کے آس پاس بھی ہوتی تھیں۔ ہمیں ایک کچھوا ملا جو بھاگ کر ہم سے دور نہیں جا سکا۔ میرا بڑا بھائی اور دوسرے لڑکے کچھوا اس آدمی کے پاس لے گئے تاکہ اسے مار کر پکایا اور کھایا جا سکے۔ آدمی نے کچھوا چھوڑ دیا کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ یہاں آگ نہیں جلائی جا سکتی۔ جب تک ہم پارک میں تھے' آگ نہیں جلا سکتے تھے ورنہ دھویں سے ہمارا کھوج لگ جاتا۔ پولیس اور پہرے دار آ کر ہمیں وہیں بھیج دیتے جہاں سے ہم چلے تھے۔ اس آدمی نے کہا کہ ہمیں جانوروں کے درمیان جانوروں کی طرح چلنا ہوگا۔ یعنی سڑک سے اور گورے لوگوں کے خیموں سے دور دور۔

مجھے ایک آواز سنائی دی' مجھے یقین ہے کہ یہ آواز سب سے پہلے میں نے سنی۔ ایسا لگا جیسے ٹہنیاں چٹخ رہی ہوں اور کوئی گھاس روندتا ہوا چلا آ رہا ہو۔ قریب قریب میری چیخ نکل گئی کیونکہ میں نے سوچا' شاید پولیس اور پہرے دار ہیں اور انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے' جن سے وہ آدمی ہمیں چوکنا رہنے کو کہہ رہا تھا۔ مگر وہ تو ہاتھی نکلا۔ اس کے پیچھے دوسرا ہاتھی اور اس کے پیچھے بہت سارے ہاتھی' جیسے پیڑوں کے درمیان بڑے بڑے کالے دھبے ہر طرف چل پھر رہے ہوں۔ وہ اپنی سونڈوں میں موپین درخت کی لال پتیاں لپیٹ کر منہ میں ٹھونس رہے تھے۔ ہاتھیوں کے بچے اپنی ماؤں سے چپٹے ہوئے چل رہے تھے۔ کچھ بڑے بچے آپس میں اس طرح دھینگا مشتی کر رہے تھے جیسے میرا بڑا بھائی اور اس کا دوست کرتے تھے' فرق یہ تھا کہ وہ ہاتھوں کے بجائے سونڈوں سے لڑ رہے تھے۔ مجھے اتنا مزہ آ رہا تھا کہ ڈرنا یاد نہیں رہا۔ اس آدمی نے کہا کہ جب تک ہاتھی گزر نہیں جاتے' ہم خاموش دم سادھے کھڑے رہیں۔ ہاتھی آہستہ آہستہ مزے مزے سے گزر رہے تھے۔ وہ اتنے بڑے تھے ہیں کہ انہیں کسی سے ڈر کر بھاگنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

ہرن ہم سے ڈر کر ادھر ادھر بھاگتے تھے۔ وہ ہوا میں اتنی اونچی قلانچیں بھرتے جیسے اُڑ رہے ہوں۔ جنگلی سور ہماری آہٹ سنتے ہی بالکل ساکت ہو گئے۔ پھر یوں لہرے بناتے ہوئے بھاگے جیسے ہمارے گاؤں میں ایک لڑکا اپنی سائیکل چلاتا تھا جو اس کے باپ نے اسے لا کر دی تھی۔ ہم جانوروں کے پیچھے پیچھے ان کی پانی پینے کی جگہ تک جاتے اور جانور جانے کے بعد قریب جا کر پانی پیتے۔ ہمیں کبھی پیاسا نہیں رہنا پڑا لیکن جانور ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے رہتے تھے۔ جب دیکھو کبھی گھاس پھوس، کبھی پیڑ پودے، کبھی پیڑوں کی جڑیں اور چھال۔ ادھر ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ مکی کے دانے بھی ختم ہو چکے تھے۔ اگر ہمارے لئے کھانے کو کچھ تھا تو بس لنگوروں کی غذا یعنی چھوٹے چھوٹے اور چیونٹیوں سے بھرے انجیر جو دریا کے کنارے پیڑوں کی شاخوں پر لٹکے ہوئے تھے۔ سچ مچ جانوروں کی طرح ہونا بہت مشکل ہے۔

دن میں جب بہت زیادہ گرمی ہوتی، شیر سوتے ہوئے ملتے۔ ان کا رنگ گھاس کے رنگ سے ملتا جلتا تھا، پہلے پہل ہمیں وہ دکھائی ہی نہیں دیے لیکن اس آدمی کو نظر آ گئے اور وہ ہمیں اس جگہ سے جہاں شیر سو رہے تھے، بہت دور دوسری طرف واپس لے گیا۔ میرا بھی شیروں کی طرح سونے کو بہت جی چاہتا تھا۔

میرا بھائی برابر دبلا ہو رہا تھا لیکن بھاری ویسا ہی تھا۔ جب دادی اسے میری پیٹھ پر لادنے کے لیے میری طرف دیکھتی تو میں کوشش کرتی کہ اس کی طرف نہ دیکھوں۔ میرے بڑے بھائی نے بھی بولنا بند کر دیا تھا۔ جب ہم پڑاؤ کرتے اور آرام کے لیے لیٹتے تو اسے ہلا ہلا کر جگانا پڑتا جیسے دادا کی طرح اسے بھی کچھ سنائی نہ دیتا ہو۔ ایک بار میں نے دادی کے منہ پر مکھیاں رینگتی دیکھیں جنہیں وہ اُڑا نہیں رہی تھی۔ مجھے بہت ڈر لگا، میں نے پام کی ایک شاخ سے انہیں اڑایا۔

ہم دن کو بھی چلتے، رات کو بھی۔ اب ہمیں گوروں کے خیمے دکھائی دینے لگے تھے، وہاں آگ جل رہی تھی اور کھانا بھی پک رہا تھا۔ ہمیں دھوئیں اور گوشت دونوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ ہم نے لکڑ بگھے جھاڑیوں سے خوشبو کے پیچھے بھاگتے دیکھے۔ ان کی کمریں اس طرح جھکی ہوئی تھیں جیسے وہ کسی بات پر شرمندہ ہوں۔ کوئی لکڑ بگھا اپنی گردن موڑتا تو اس کی آنکھیں ایسی لگتیں جیسی ہماری آنکھیں رات کے اندھیرے میں ایک دوسرے کو دیکھتی ہوئی لگتی ہیں۔ ہوا کے ساتھ ساتھ باڑھ سے گھرے ہوئے احاطوں سے ہماری زبان میں بولنے چالنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہاں کیمپوں میں کام کرنے والے رہتے تھے۔ رات کے وقت ہم میں سے ایک عورت مدد مانگنے ان کے پاس جانا چاہتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ ہمیں کچرے کے ڈرم سے بھی کھانے کی کوئی چیز دے سکتے ہیں۔ اس نے رونا شروع کر دیا، دادی کو اسے سنبھالنا بھی پڑا اور اس کا منہ اپنے ہاتھ سے بند بھی کرنا پڑا۔ اس آدمی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمیں کروگر پارک میں کام کرنے والے اپنے لوگوں سے دور رہنا ہوگا۔ اگر وہ ہماری کوئی مدد کرتے تو اپنی نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ ان کی نظر ہم پر پڑ جاتی تو وہ اتنا کر سکتے تھے کہ یہ ظاہر کریں ہم وہاں ہیں ہی نہیں، انہوں نے خالی جانور دیکھے تھے۔

کبھی کبھی رات کو ہم سونے کے لیے تھوڑی دیر رک جاتے۔ ہم ایک دوسرے سے چپک کر سوتے۔ معلوم نہیں کون سی رات تھی، ہم ہر وقت چلتے چلتے جا رہے تھے۔ اس رات ہم نے کہیں بہت قریب سے شیروں کی آوازیں سنی۔ ایسی آواز نہیں جیسی شیر دور سے دہاڑ رہے ہوں بلکہ کچھ اس طرح جیسے سانس پھولنے کی آواز ہوتی ہے۔ بالکل ایسی جیسے دوڑنے کے بعد ہمارے منہ سے نکلتی ہے۔ لیکن یہ ہانپنے کی آواز کچھ مختلف تھی کیونکہ وہ دوڑ نہیں

رہے تھے' کہیں نزدیک ہی کسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ہم کھسک کر ایک دوسرے کے اور قریب ہو گئے۔ جو کناروں پر تھے' ان کی کوشش تھی کہ اندر گھس کر درمیان میں پہنچ جائیں۔ میں بالکل ایک عورت سے لگ کر کھڑی تھی جس کے بدن سے بدبو آ رہی تھی۔ وہ ڈر رہی تھی لیکن میں خوشی سے اس کے ساتھ چپٹ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے خدا سے دعا مانگی کہ شیر کنارے پر کھڑے ہوئے کسی ایک کو لے لیں اور یہاں سے چلے جائیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ وہ درخت نہ دیکھوں جہاں سے کوئی شیر کود کر ہمارے درمیان آ سکتا تھا' بالکل بیچ میں جہاں میں کھڑی تھی۔

وہ آدمی اچھل کر کھڑا ہو گیا اور ایک سوکھی ٹہنی پیڑ پر زور زور سے مارنے لگا۔ ہم سے تو اس نے کوئی آواز نہ نکالنے کو کہا تھا اور خود چیخ رہا تھا۔

وہ شیروں پر ایسے چیخ رہا تھا جیسے ہمارے گاؤں میں ایک دیوانہ ہوا میں منہ اٹھا کر چیختا تھا۔ شیر چلے گئے۔ ہم نے دور سے ان کی دھاڑیں سنیں۔

ہم تھک گئے تھے بہت زیادہ تھک گئے تھے۔ راستے میں ہم کوئی دریا پار کرتے تو میرا بڑا بھائی اور ایک اور آدمی دادا کو اٹھا کر ایک پتھر سے دوسرے پتھر تک لے جاتے۔ میری دادی بہت طاقت ور ہے لیکن اس کے پیروں سے خون بہہ رہا تھا۔ ہم اتنے تھک گئے تھے کہ سر پر ٹوکری بھی اٹھا کر نہیں چل سکتے تھے۔ کچھ بھی اٹھانا مشکل تھا' چھوٹے بھائی کے سوا' چنانچہ ہم نے اپنی ساری چیزیں ایک جھاڑی کے نیچے چھوڑ دیں۔ "ہم خود ہی وہاں پہنچ جائیں تو بہت ہے۔" دادی نے کہا۔

ہم نے بھوک کے مارے کچھ جنگلی پھل کھا لیے جو ہمارے گھر کے آس پاس نہیں ہوتے تھے' نتیجے میں ہم سب کے پیٹ خراب ہو گئے اور دست آنے لگے۔ اس وقت ہم ایسی گھاٹی میں سے گزر رہے تھے جو ہاتھی گھاس کہلاتی تھی اور تھی بھی ہاتھی جتنی اونچی۔

ہمارے پیٹوں میں مروڑ شروع ہو گئے' دادا تو میرے چھوٹے بھائی کی طرح سب کے سامنے بیٹھ کر فارغ بھی نہیں ہو سکتا تھا اس لیے وہ فارغ ہونے گھاس کے اندر چلا گیا۔ چلتے رہو چلتے رہو وہ آدمی ہم سے برابر کہتا رہتا تھا' لیکن ہم نے اس سے دادا کا انتظار کرنے کو کہا۔ ہر شخص دادا کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ اب آیا نہ تب۔ دوپہر کا وقت تھا' ہمارے کانوں میں کیڑے مکوڑے بھن بھنانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ہم گھاس کی سرسراہٹ نہیں سن سکتے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ واپس آ رہا تھا۔ ہم اسے دیکھ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ گھاس بہت اونچی تھی اور دادا بہت چھوٹا۔ ہم اس کی تلاش میں نکلے' لیکن چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں مبادا گھاس میں کہیں ہم بھی ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔

گھاس ہماری ناک اور آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ ہم دبی دبی آواز میں دادا کو پکار رہے تھے لیکن اس کے کانوں میں جو جگہ سماعت کے لیے بچی تھی وہ شاید کیڑوں کی بھن بھناہٹ نے پر کر دی تھی۔ ہم اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے لیکن وہ نہ ملا۔

میری آنکھ کھلی تب بھی اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہم نے پھر اس کی تلاش شروع کی۔ ہم نے گھاس پر چل چل کر راستے بنا دیے تھے تاکہ اگر ہم اسے نہ ڈھونڈ سکیں تو وہ آسانی سے ہمیں تلاش کر لے۔ پورے دن ہم اس کا انتظار کرتے رہے سورج سر پر ہو تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی ہے شعاعیں سر میں گھسی جاتی ہیں چاہے آدمی جانوروں کی طرح پیڑ کے نیچے لیٹا ہو۔ میں چت لیٹی ہوئی مڑی ہوئی چونچوں اور عنابی ننگی گردنوں والے وہ بدصورت پرندے دیکھ رہی تھی جو ہمارے اوپر چاروں طرف اڑ رہے تھے۔ ہم انہیں اس وقت بھی دیکھتے ہوئے گزرے تھے جب وہ مردہ جانوروں کی ہڈیاں کرید رہے تھے' ان ہڈیوں میں ہمارے کھانے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ اوپر گول گول چکر لگا رہے تھے' کبھی نیچے آ کر اڑنے لگتے' کبھی

اوپر چلے جاتے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی پروں سے محروم گردنیں کبھی ایک طرف' کبھی دوسری طرف مڑ جاتیں۔ وہ اڑتے ہوئے مسلسل چکر لگا رہے تھے۔ میں نے دادی کو دیکھا' وہ میرے چھوٹے بھائی کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور پرندے دیکھ رہی تھی۔

شام کے وقت وہ آدمی دادی کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ باقی لوگوں کو اب روانہ ہو جانا چاہیے۔ اس نے کہا کہ اگر ان کے بچوں کو کھانے کو کچھ نہ ملا تو وہ بہت جلد مر جائیں گے۔ دادی کچھ نہ بولی۔

آدمی نے کہا: "میں جانے سے پہلے تمہیں کچھ پانی لا دوں گا۔"

دادی نے میری طرف' میرے بڑے بھائی کی طرف اور اپنی گود میں لیٹے ہوئے میرے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا۔ ہم دوسرے لوگوں کو جانے کے لیے کھڑے ہوتے دیکھ رہے تھے۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ ہمارے اردگرد کی وہ گھاس خالی ہو جائے گی جہاں سب لوگ تھے اور ہم اس جگہ یعنی کروگر پارک میں اکیلے رہ جائیں گے پھر پولیس یا درندے ہمیں کھوج نکالیں گے۔ آنسو میری آنکھوں سے بہہ بہہ کر ناک سے گزر کے ہاتھوں پر ٹپکنے لگے لیکن دادی نے کوئی توجہ نہ دی۔ پھر ایک دم وہ اٹھی اور اس نے اپنی ٹانگیں یوں پھیلائیں جیسے جلانے والی لکڑیاں اٹھاتے وقت پھیلاتی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے میرے بھائی کو پیٹھ پر لادا اور ایک کپڑے سے اسے اپنے اوپر کس کر باندھ لیا۔ اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے اور اس کی بڑی بڑی چھاتیاں نظر آ رہی تھیں جن میں میرے بھائی کے لیے کچھ بھی نہ تھا' دادی نے کہا۔ "چلو۔"

ہم اونچی گھاس والی جگہ چھوڑ کر روانہ ہوئے' وہ جگہ پیچھے رہ گئی۔ ہم اس آدمی اور باقی سب لوگوں کے ساتھ دوبارہ چلنے لگے۔

ایک بڑا سا خیمہ زمین میں گڑا ہے' کسی گرجا اسکول سے بھی بڑا۔ ہم بہت زیادہ چلنے کے بعد یہاں پہنچے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ وہ جگہ ہو گی۔ اس قسم کی جگہ ہم نے اس وقت بھی دیکھی تھی جب ہماری ماں ہمیں شہر لے گئی تھی کیونکہ اس نے سنا تھا کہ ہمارے فوجی وہاں آئے ہوئے ہیں۔ وہ ان سے ہمارے باپ کا اتا پتہ پوچھنا چاہتی تھی۔ اس خیمے میں لوگ دعا مانگ رہے تھے اور گا رہے تھے۔ یہ خیمہ بھی اس خیمے کی طرح نیلا اور سفید ہے۔ لیکن یہ دعا مانگنے یا گانے کے لیے نہیں ہے۔

ہم یہاں ان دوسرے لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں جو ہمارے ملک سے آئے ہیں۔ مطب کی نرس کہتی ہے کہ چھوٹے بچے چھوڑ کر ہم کل دو سو افراد ہیں۔ کچھ نئے پیدا ہونے والے بچے بھی ہیں جو اس وقت پیدا ہوئے جب ہم کروگر پارک سے گزر رہے تھے۔ دن کے وقت بھی جب سورج چمک رہا ہوتا ہے' خیمے کے اندر اندھیرا رہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پورا گاؤں یہیں آ بسا ہو۔ اندر مکانوں کے بجائے ہر خاندان نے اپنے رہنے کی جگہ بوریاں یا گتے کے بکسوں سے' جو کچھ بھی ہاتھ لگا' گھیر لی تاکہ دوسرے خاندان کو جتا سکیں کہ یہ ان کی جگہ ہے' یہاں کوئی اور داخل نہ ہو۔ حالانکہ یہاں نہ دروازہ ہے نہ کھڑکی' نہ چھپر۔ کوئی بڑا کھڑا ہو کر دیکھے تو ہر ایک کے گھر کے اندر جھانک سکتا ہے۔ کچھ لوگوں نے پتھر پیس کر رنگ بھی گھول لیا اور بوریوں پر تصویریں بنا لیں۔

ویسے چھت یہاں ضرور ہے اوپر بہت دور' خیمے کا سائبان' بالکل آسمان کی طرح۔ کسی بڑے سے پہاڑ کی طرح جس میں ہم رہ رہے ہوں۔ خیمے کی درازوں سے گرد کے راستے نیچے کی طرف آتے دکھائی دیتے ہیں' جو اتنے چوڑے ہیں کہ لگتا ہے' ہم ان پر چڑھ سکتے ہیں۔ خیمے کی

چھت اوپر سے بارش کا پانی روک لیتی ہے لیکن پانی نیچے سے بہہ بہہ کر اندر آ جاتا ہے اور ہمارے اپنے بنائے ہوئے مکانوں کی گلیوں میں پھیل جاتا ہے۔ یہ گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ ایک وقت میں ایک ہی آدمی چل کر جا سکتا ہے۔

میرا چھوٹا بھائی نہیں کھیلتا۔ دادی اسے ہر سوموار کو جب ڈاکٹر آتا ہے' مطب لے جاتی ہے۔ نرس بتاتی ہے کہ اس کے سر میں کچھ خرابی ہے' اس کا خیال ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جہاں سے آئے ہیں' وہاں ہمیں کم خوراک ملتی تھی' جنگ کی وجہ سے یا شاید اس وجہ سے کہ ہمارا باپ وہاں نہیں تھا یا پھر شاید اس وجہ سے کہ وہ کروگر پارک سے گزرنے کے دوران بھوکا رہا تھا۔ اسے تو بس دن بھر دادی کے پیٹ پر یا گود میں پڑے رہنا' یا اس سے ٹیک لگائے بیٹھے رہنا اچھا لگتا ہے۔ وہ ہمیں تکتا رہتا ہے' کچھ پوچھنا چاہتا ہے مگر اس سے بولا نہیں جاتا۔ میں اسے گدگدی کرتی ہوں تو وہ صرف مسکرا دیتا ہے۔ مطب سے اسے کھانے کے لئے ایک سفوف ملا ہے جسے گھول کر اس کے لیے دلیا بنایا جاتا ہے۔ شاید ایک دن وہ ٹھیک ہو جائے۔

جب ہم یہاں پہنچے تب ہماری' میری اور میرے بڑے بھائی کی حالت بھی بالکل اسی کی طرح تھی۔ مجھے کچھ زیادہ یاد نہیں۔ خیمے کے پاس گاؤں میں رہنے والے لوگ ہمیں مطب لے گئے تھے۔ یہاں آنے والوں کو وہیں جا کر اپنا نام لکھوانا پڑتا ہے کہ ہم وہاں سے نکل آئے ہیں' کروگر پارک کے راستے۔ ہم گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہر چیز گڈمڈ لگ رہی تھی۔ ایک نرس اپنے سیدھے بنے ہوئے بالوں اور اونچی ایڑی کے خوش نما سینڈلوں کی وجہ سے بہت پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ہمارے لیے یہی خاص سفوف لے کر آئی اور کہا کہ ہم اسے پانی میں گھول کر آہستہ آہستہ پئیں۔ ہم نے پیکٹ دانتوں سے پھاڑا اور سفوف منہ میں ڈال لیا' وہ منہ کے اندر چپک گیا۔ میں نے ہونٹوں اور انگلیوں پر لگا ہوا سفوف چوس لیا۔ کچھ دوسرے بچے جو ہمارے ساتھ آئے تھے الٹیاں کرنے لگے۔ مجھے بھی اپنے پیٹ میں حرکت سی محسوس ہوئی۔ سفوف سانپ کی طرح رینگتا ہوا اندر جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ہچکیاں آنا شروع ہو گئیں اور میرا برا حال ہو گیا۔ دوسری نرس نے ہمیں مطب کے برآمدے میں قطار بنا کر کھڑے ہونے کے لیے کہا مگر ہم کھڑے نہ ہو سکے۔ ہم ادھر ادھر ایک دوسرے پر گرے ہوئے بیٹھے تھے۔ نرسوں نے ایک ایک کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور بازو میں سوئیاں لگائیں۔ دوسری سوئیوں سے ہمارا خون لے کر چھوٹی چھوٹی شیشیوں میں ڈالا۔ یہ سب بیماری کی روک تھام کے لیے کیا جا رہا تھا مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ جب بھی میری آنکھ کھلتی مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ میں لمبی گھاس میں چلی جا رہی ہوں۔ مجھے ہاتھی بھی دکھائی دیتے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہم منزل پر پہنچ گئے ہیں۔

دادی اب بھی طاقتور تھی۔ وہ کھڑی بھی ہو سکتی تھی اور اسے لکھنا بھی آتا تھا۔ اس نے ہمارے لیے بھی دستخط کیے۔ دادی نے خیمے کی ایک دیوار کے بالکل ساتھ یہ جگہ لی' یہ خیمے کی بہترین جگہ ہے۔ یہاں بارش کا پانی تو بے شک اندر آتا ہے مگر جب موسم اچھا ہو تو ہم پردہ اٹھا سکتے ہیں' سورج ہمارے سامنے ہوتا ہے اور سیلن کی بو جلد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ دادی ایک عورت کو جانتی تھی۔ اس نے اسے بتایا کہ سونے کی چٹائی بنانے کے لیے عمدہ گھاس کہاں سے لی جائے۔ دادی نے ہمارے لیے چٹائیاں بنا دیں۔

مہینے میں ایک بار کھانے کی چیزوں سے بھرا ہوا ٹرک مطب میں آتا ہے۔ دادی اپنا دستخط کیا ہوا کارڈ لے کر وہاں جاتی ہے اور اس کے کارڈ میں چھید ہونے کے بعد ہمیں مکئی کے دانوں کی ایک بوری مل جاتی ہے۔ بوریاں خیمے تک لانے کے لیے ایک پہیے والی ریڑھیاں ہیں۔ میرا بڑا

بھائی بوری اس پر رکھ کر لے آتا ہے۔ واپسی میں وہ اور دوسرے لڑکے خالی ریڑھیاں دھکیلتے ہوئے مطب کی طرف دوڑ لگاتے ہیں۔ کبھی کبھی خوش قسمتی سے اسے کوئی ایسا شخص مل جاتا ہے جس نے گاؤں سے بیئر کی بوتلیں خریدی ہوں۔ بوتلیں پہنچانے کے کچھ پیسے مل جاتے ہیں۔ ویسے اس کی اجازت نہیں ہے۔ ریڑھیاں سیدھی نرسوں کے پاس واپس پہنچائی ہوتی ہیں۔ میرا بھائی ان پیسوں سے شربت خریدتا ہے اور میرے مانگنے پر تھوڑا سا شربت مجھے بھی دے دیتا ہے۔

مہینے میں ایک اور دن گرجا سے کپڑوں کا ایک گٹھر مطب کے صحن میں آتا ہے۔ دادی کے پاس ایک اور کارڈ ہے۔ جس میں چھید کروانے کے بعد ہم وہاں سے اپنی پسند کا کوئی لباس لے سکتے ہیں۔ میرے پاس دو جوڑے، دو پتلون اور ایک جرسی ہوگئی ہے اور اب میں اسکول جا سکتی ہوں۔

گاؤں والوں نے ہمیں اپنے اسکول میں داخلہ لینے کی اجازت دے دی ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ ہماری ہی زبان بولتے ہیں۔ دادی کہتی ہے شاید اسی وجہ سے انہوں نے ہمیں اپنے علاقے میں رہنے دیا ہے۔ بہت دن پہلے ہمارے آباؤاجداد کے وقتوں میں ایسی کوئی باڑھ نہیں تھی جسے چھونے سے لوگ مر جاتے ہیں۔ نہ ان کے اور ہمارے درمیان کوئی کروگر پارک تھا۔ ہم سب ایک تھے اپنے گاؤں سے لے کر یہاں تک اور ہمارا ایک ہی بادشاہ تھا۔

ہمیں خیمے میں رہتے رہتے بہت دن ہوگئے ہیں۔ اب میں گیارہ سال کی ہوں اور میرا چھوٹا بھائی لگ بھگ تین سال کا ہے حالانکہ وہ بہت چھوٹا سا ہے صرف اس کا سر بہت بڑا ہے۔ وہ ابھی تک پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ اب کچھ لوگوں نے خیمے کے اردگرد کی خالی زمین کھود کر وہاں مکئی اور سبزی بوئی ہے۔ بوڑھے لوگوں نے شاخیں جوڑ جوڑ کر اپنی کیاریوں کے گرد باڑھیں لگائی ہیں۔ کسی کو شہر میں جا کر کام کرنے کی اجازت نہیں لیکن کچھ عورتوں نے گاؤں ہی میں کام تلاش کر لیا ہے اور اب وہ کچھ خریداری بھی کر سکتی ہیں۔ دادی اب بھی طاقتور ہے اس لیے وہ بھی کسی ایسی جگہ کام ڈھونڈ لیتی ہے جہاں لوگ مکان بنا رہے ہوں۔ اس گاؤں میں لوگ اینٹوں اور سیمنٹ سے بہت اچھے مکان بناتے ہیں ہمارے گاؤں کی طرح مٹی اور گارے سے نہیں بناتے۔ دادی لوگوں کے لیے اینٹیں اور پتھروں کی ٹوکریاں سر پر ڈھو کر لے جاتی ہے۔ اب اس کے پاس شکر، چائے، دودھ اور صابن تک خریدنے کے لیے پیسے ہوتے ہیں۔ اسٹور والوں نے اسے ایک کیلنڈر بھی دیا ہے جو اس نے خیمے میں ہمارے قریبی پردے پر ٹانگ دیا ہے۔

میں اسکول میں بہت تیز ہوں۔ دادی نے لوگوں کے پھینکے ہوئے اشتہاروں کے صفحے جمع کر کے میری کتابوں پر چڑھا دیے ہیں۔ وہ ہر سہ پہر مجھے اور بڑے بھائی کو اسکول کا کام پورا کرنے کے لیے بٹھا دیتی ہے اس سے پہلے کہ اندھیرا ہو جائے۔ خیمے میں صرف سمٹ کر لیٹنے کی جگہ ہے جیسے ہم کروگر پارک سے گزرتے ہوئے لیٹا کرتے تھے اور موم بتیاں بہت مہنگی ہیں۔

دادی ابھی تک اپنے لیے جوتے نہیں خرید سکی جنہیں پہن کر گرجا جا سکے لیکن اس نے میرے اور بڑے بھائی کے لیے اسکول کے کالے جوتے اور انہیں چمکانے کے لیے پالش خرید لی ہے۔ ہر صبح جب خیمے میں لوگ بیدار ہو رہے ہوتے ہیں، بچے روتے چلاتے ہیں۔ لوگ باہر کے نکلنے پر ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہیں اور کچھ بچے پتیلیوں میں سے رات کا بچا ہوا دلیا کھرچ کھرچ کر کھا رہے ہوتے ہیں۔ میں اور میرا بڑا بھائی اپنے جوتے پالش کرتے ہیں۔ دادی ہمیں ٹانگیں سیدھی کر کے چٹائی پر بٹھا دیتی ہے اور ہمارے جوتوں کا غور سے معائنہ کرتی ہے کہ ہم نے ٹھیک پالش کیے

ہیں یا نہیں۔ خیمے میں اور کسی بچے کے پاس اسکول کے سچ مچ کے جوتے نہیں ہیں۔ جب ہم تینوں یہ جوتے دیکھتے ہیں تو لگتا ہے کہ ہم اپنے گھر میں ہیں، کہیں بھی جنگ نہیں ہو رہی ہے اور نہ ہم کہیں اور گئے ہیں۔

کچھ گورے لوگ خیمے میں رہنے والوں کی تصویریں اتارنے آئے۔ وہ کہتے تھے کہ وہ فلم بنا رہے ہیں۔ میں نے کبھی فلم نہیں دیکھی مگر اس کے بارے میں جانتی ہوں۔ ایک گوری عورت ہماری جگہ میں گھس آئی اور دادی سے سوالات کرنے لگی۔ ایک آدمی اس عورت کی زبان سمجھتا تھا، وہ سوالات ہماری زبان میں دہراتا۔ ”تم یہاں کب سے اس طرح رہ رہی ہو؟“

”کیا مطلب؟ یہاں؟“ دادی نے کہا۔ ”اس خیمے میں؟ دو سال اور ایک ماہ سے۔“

”اور مستقبل کے بارے میں تمہاری کیا امیدیں ہیں؟“

”کچھ بھی نہیں۔ میں بس یہیں ہوں۔“

”لیکن تمہارے بچے؟“

”میں چاہتی ہوں یہ پڑھ لکھ جائیں تاکہ انہیں اچھی نوکری اور اچھے پیسے مل سکیں۔“

”کیا تمہیں امید ہے کہ تم اپنے ملک واپس جا سکو گی؟“

”میں واپس نہیں جاؤں گی۔“

”لیکن آخر جب جنگ ختم ہو جائے گی تو تمہیں یہاں رہنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ کیا تم اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہتیں؟“

میرا خیال تھا کہ اب دادی مزید کچھ بھی نہیں کہنا چاہتی اور وہ انگریز عورت کے کسی سوال کا جواب شاید ہی دے۔ انگریز عورت نے پلٹ کر ہمیں دیکھا اور مسکرانے لگی۔ دادی نے رخ پھیر لیا اور دھیرے سے کہا: ”اب کچھ باقی نہیں۔ کوئی گھر ٹھکانہ نہیں۔“

نہ جانے دادی نے یہ کیوں کہا تھا؟ میں تو واپس جانا چاہتی ہوں۔ ضرور جاؤں گی۔ اسی کروگر پارک سے گزر کر۔ اگر سب ڈاکوؤں کا صفایا کر دیا گیا اور جنگ ختم ہو گئی تو ماں وہاں ہماری منتظر ہو گی۔ ممکن ہے دادا نے بھی جسے ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے راستہ تلاش کر لیا ہو اور ہولے ہولے چلتا ہوا گھر واپس پہنچ چکا ہو۔ وہ سب گھر میں انتظار کر رہے ہوں۔ مجھے انہیں یاد رکھنا ہے۔

☆......☆......☆

ختم شد